مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

مارچ 2013

کیا پاکستان میں شفاف اور پُرامن الیکشن ہوسکیں گے؟

کیا پاکستان میں لمبی مدت کے لیے ٹیکنو کریٹ حکومت بنے گی؟

دہشت گردی کی جنگ اور جمہوریت کے
پچھلے پانچ سالوں میں جنرل کیانی کا کردار

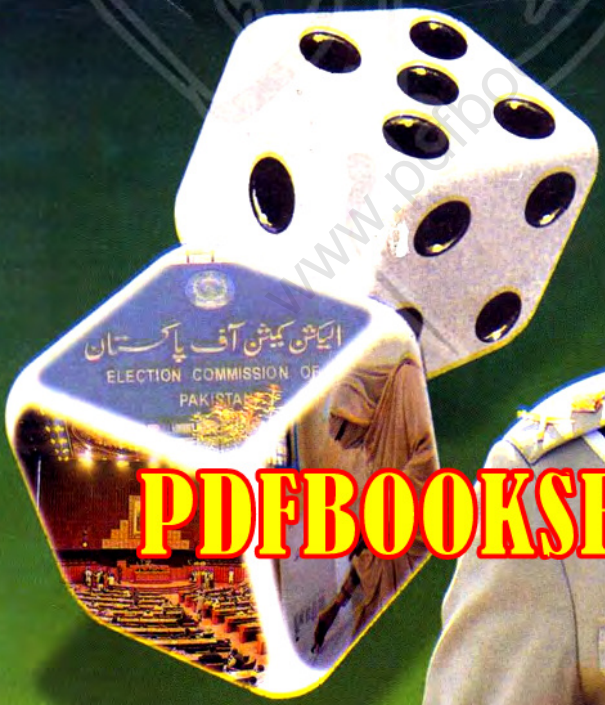

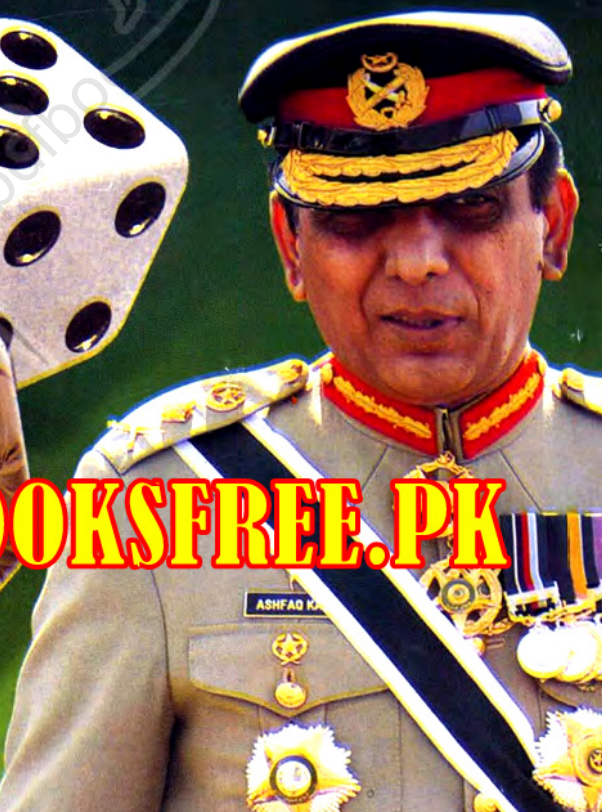

PDFBOOKSFREE.PK

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں، لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ نے اسی قسم کے سوالات کئے تھے، پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام [1] مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کئے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟

(آیات ۱۰۱ تا ۱۰۴) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

---

(۱) جس طرح ہمارے ملک میں گائے بیل اور بکرے خدا کے نام پر یا کسی پیر کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اور ان سے کوئی خدمت لینا یا ذبح کرنا حرام سمجھا جاتا ہے، اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پن کر کے چھوڑ دیتے تھے اور ان طریقوں کے انہوں نے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شخص کی فضیلت (کا بیان) جو (دین کا علم) پڑھے اور (دوسروں کو) پڑھائے

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ہدایت اور علم کی مثال، جس کیساتھ مجھے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے، مثل زور کے مینہ کے ہے جو زمین پر برسا۔ تو جو زمین صاف ہوتی ہے، وہ پانی کو جذب کر لیتی ہے پھر اس سے بہت سارا چارا اور گھاس اُگتی ہے۔ اور جو زمین سخت ہوتی ہے، وہ پانی کو روک لیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ (اس کو) پیتے ہیں اور (اپنے جانوروں کو) پلاتے ہیں اور زراعت (کو سیراب) کرتے ہیں اور کچھ مینہ (زمین کے) دوسرے حصہ کو پہنچا کہ جو بالکل چٹیل میدان ہے، نہ پانی کو روکتا ہے اور نہ سبزہ اُگاتا ہے۔ پس یہی مثال ہے اس شخص کی جو اللہ کے دین میں فقیہ ہو جائے اور جس چیز کیساتھ مجھے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے، اس کو فائدہ دے اور وہ (اس کو) پڑھے اور پڑھائے۔ اور مثال اس شخص کی جس نے اس کی طرف سر (تک) نہ اٹھایا اور اللہ کی اس ہدایت کو، جس کیساتھ میں بھیجا گیا ہوں، قبول نہ کیا (بے آب و گیاہ بنجر زمین اور چٹیل میدان کی طرح ہے)

(بحوالہ مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
2	القرآن	تفہیم القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	اس شخص کی فضیلت (کا بیان) جو (دین کا علم) پڑھے اور (دوسروں کو) پڑھائے!
14	دستک	کامران امجد خان	ہزارہ برادری پر ایک اور حملہ!
33	خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں	قلندر حسین سید	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
53	حیرت کدۂ شعروادب	اقراء فاروقی	اردو ادب کے نامور شعراء کے روز و شب اور معمولات زندگی بیان کرتی دلچسپ و معلوماتی تحریر!
61	میری بی بی جان	جاوید راہی	ایک باوقار خاتون کی کہانی جو دوسروں میں محبت بانٹنے کا عزم کئے ہوئے تھیں!
65	جادو	[illegible]	ایک پراسرار قتل کی داستان، مشتبہ قاتل عملیات کی دنیا کی ملکہ تھی!
87	فوجی کیمپ میں بدروح	[illegible]	ایک فوجی کا ماجرا جو محیر العقول واقعات پر یقین نہیں رکھتا تھا!
97	کھیت میں لاش	نواز خان	نجانے اس مجرم میں ایسی کون سی بات تھی کہ انسپکٹر نواز جیسا پولیس افسر بھی اسے شاباش دینے پر مجبور ہو گیا تھا!
125	حکمت عملی	محمد سلیم اختر	ایک تیز طرار حسینہ کا قصہ جسے لڑکوں کے لمبے بالوں سے نفرت تھی!
129	الرجی	حکیم راحت نسیم	بعض لوگ الرجی کو نازک مزاجی کہہ کر ٹال دیتے ہیں مگر یہ ایک مرض ہے جو انسان کے معمولات کو متاثر کرتا ہے!

49 اُداسی کی قیمت — عارف محمود اپل
اُداسی کی حالت میں ایسے فیصلوں سے پرہیز کرنا چاہیے جن کا تعلق مالی معاملات سے ہو

51 بڑھاپے کا آغاز کب ہوتا ہے؟ — نصرت شبنم
اکثر لوگوں کو بڑھاپے کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ پہلے ہی سے اس دور میں قدم رکھ چکے ہوتے ہیں!

17 سیارہ رپورٹ

دہشت گردی کی جنگ اور جمہوریت کے پچھلے پانچ سالوں میں جنرل کیانی کا کردار

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
132	زود پشیماں	[illegible]	ایک لڑکی کی کہانی جو خود کو بہت ماڈرن اور جدت پسند خیال کرتی تھی!
141	رازداں	اشفاق احمد	ایک دوشیزہ کی کتھا جو کسی کی محبت کی رازدان تھی!
150	موت کا انتظار	ایس امتیاز احمد	اس کہانی کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اسے ہنری سلاسر نے لکھا ہے!
161	وفاؤں کی قاتل	انیس طاہرہ	ایک عورت کی کہانی جو توجہ نہ ملنے سے انتقامی جذبے کا شکار ہو گئی!
167	سناٹا	نگہت سیما	قدرت کے سنگین مذاق کا دلگداز افسانہ، ایک جوڑے کی کہانی جن کی زندگی میں سناٹے نے قبضہ جما رکھا تھا!
177	شب ظلمت	فہمیدہ کوثر	ایک شخص کا فسانہ جس کے اندر اندھیرا رچ بس گیا تھا!
183	سیارہ کچن کارنر	جویریہ کامران	ایسی تراکیب جو نہ صرف توانائی فراہم کریں گی بلکہ انکے ہوتے آپ کو مزید کسی ڈش کی ضرورت پیش نہیں آئیگی!
187	بزم شاعری	ادارہ	باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
193	روزی کا دفاع	مظفر کاظمی	پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کبھی کبھی جلتے شعلوں میں بھی کودنا پڑتا ہے!
199	سیارہ مشورہ کلینک	ڈاکٹر ندیم چوہدری	ڈاکٹر صاحب آپ کے طبی اور نفسیاتی مسائل کا حل تجویز کرتے ہیں!
206	خود پرستی	نسرین اختر نینا	ایک خود پرست دوشیزہ کی کہانی جس سے تقدیر نے عجب انتقام لیا!

59 زبیدہ آپا — ایمان خان
ماہر کک، کامیاب ٹوٹکے اور چار ہزار ٹی وی شوز کی میزبان

80 قیدی موت کی وادی کے — ایان خان
وہ تین عورتیں تھیں، انہوں نے موت کی وادی میں داخل ہونے کی غلطی کی تھی، گاڑی میں گیس ختم ہو چکی تھی اور ان کے بچنے کی اُمید بھی!

181 بچوں کو کہانی سنانے کی روایت — فاطمہ چوہدری
تیز رفتار زندگی نے جہاں اور بہت سی چیزیں تبدیل کی ہیں وہاں رات میں بچوں کو کہانی سنانے کی روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے!

اظہارِ خیال

دعا کیجئے

محترم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم۔

سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ میری شاعری شائع کر کے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس بات سے مجھے دلی خوشی ہوئی کہ آپ اپنے قارئین کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی ہر محنت اور کوشش کو مدنظر رکھتے ہیں۔ میری ہمیشہ آپ کے ساتھ دعائیں ہیں کہ آپ اسی طرح اس سلسلے کو چلاتے رہیں اور ہم اس شمارے سے فائدہ اُٹھاتے رہیں اور آپ کو دعا دیتے رہیں اور میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

میری آپ سے اور سیارہ ڈائجسٹ کے تمام قارئین سے ایک التجا ہے کہ میرے اپریل میں امتحانات شروع ہو رہے ہیں آپ میری کامیابی کیلئے بہت دعا کیجئے گا۔

(مہ جبیں لیاقت علی، فیصل آباد)

سندھ کے وڈیرے اور پنجاب کے چوہدری

مکرمی ومحترمی جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔

ماہِ فروری کا سیارہ ڈائجسٹ بطور اعزازی شمارہ موصول ہوا اس کے لیے بے حد شکریہ۔ انسپکٹر نواز خان کی کہانی ''کم ذات'' پڑھ کر ہمارا دھیان سندھ کے وڈیروں اور پنجاب کے چوہدریوں کی طرف پلٹ گیا کہ آج بھی یہ لوگ اپنے کمی کاروں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کمی کا کوئی باصلاحیت بچہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اچھے مستقبل کا خواب دیکھتا ہے تو اسے بلکہ اس کے پورے خاندان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن..... خدا جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت.....

ڈاکٹر درخشاں انجم کی تحریر ''آرزو کی آرزو'' بے حد متاثر کن لگی۔ مخلص جیون ساتھی سے ناروائی کا پچھتاوا جیون کا روگ بن گیا۔

(زاہدہ یوسفی، لاہور)

رائے کا اظہار

گرامی القدر جناب کامران امجد خاں صاحب! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ ماہ فروری کا اعزازی پرچہ ملا۔ سرورق دیکھنے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی ورق پلٹتے ہی گئے اور اظہارِ خیال کے صفحات پڑھ کر چونک سا گیا۔ تنقید ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ اگر تنقید مثبت ہو تو پھر دل اس کی اصلاح کے لیے کچھ سوچتا ہے لیکن ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ہماری تنقید برائے تنقید ہوتی ہے جس سے اصلاح کا پہلو معدوم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہنے والے تو اس حقیقت کا بھی برملا اظہار کر دیتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم بھی ہمارے قائدین کا ایک جذباتی فیصلہ تھا۔ اس دوران لاکھوں انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ ہزاروں مائیں اپنے جگر گوشوں کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھیں۔ ہزاروں سہاگنیں بیوگی کا ''میڈل'' اپنے گلے میں لٹکائے ہمیشہ کے لیے دوسروں کی تنقید کا نشانہ بنتی رہیں۔ اسی طرح ہزاروں بچے اپنی شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور اور کیا لکھوں قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ مرا ساتھ دے۔ ہمارے اہل علم و دانش، صاحب بصیرت لوگ آئیں اور

بتائیں کہ یہ آخر کیا تماشہ تھا؟ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قائدانہ صلاحیتوں سے دنیا کے نقشہ پر ایک اسلامی مملکت کے نام سے اُبھرا لیکن افسوس! کہ جلد ہی ہمارے قائد کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں..... اور یوں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت آخر دو حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ ہمارے ملک میں ناخواندگی ہے، اقربا پروری ہے، کرپشن ہے، دہشت گردی ہے، سرعام گھروں اور بینکوں کو لوٹ لیا جاتا ہے، گینگ ریپ ہوتے ہیں، ملاوٹ ہوتی ہے، اصل ایک نمبر چیز کا خریدنا ہمارے ملک میں ایک خواب بن گیا ہے۔ خیر اس داستان کو دہرانا میرا مقصود ہرگز نہ ہے لیکن پھر بھی دل خون کے آنسو روتا ہے۔ دہائی دے تو کس کو دے۔ برصغیر کے عظیم شاعر غالب نے آج سے دو صدیاں پہلے کہا تھا۔

گور کس دل جلے کی ہے یہ غالبؔ
شعلہ سا روز اک یاں سے نکلتا ہے

فوزیہ صاحبہ کا میں مشکور ہوں انہوں نے مجھے بروقت جگا دیا کہ ''قلندر حسین کئی مختلف جگہوں سے اچھی تحریریں نقل کر کے شائع کروا رہے ہیں۔ یہ عجب دوہرا معیار ہے..... اگر کوئی دوسرا لکھاری ایک کہانی نقل کر کے بھیجے تو اسے بلیک لسٹ کر دیا جاتا ہے۔'' میں ان کو کیسے اپنی پوزیشن واضح کروں کہ میں ان تحریروں کے ساتھ کراس ریفرنس دیتا ہوں جن کو انہوں نے درخورِ اعتنا نہ جانا۔ کیوں؟ نسیم سحر صاحبہ کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں ''قلندر حسین کہاں کہاں سے عمدہ تحریریں لاتے ہیں.....'' آخر میں میرے لیے قابلِ احترام شوکت افضل صاحبہ جو کہ خود لکھاری ہیں اور کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں وہ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں'' سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ وہ اسے اپنے بیٹوں اور بہوؤں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتی ہیں۔ ان کا یہ کہنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ ان کا میں تہہ دل سے شکریہ اگر ادا نہ کروں تو بخیل کہلاؤں۔ دعا ہے کہ خداوند قدوس ان کے علم و فہم میں اضافہ کرے اور وہ پھولیں پھلیں اور ادب کے لیے یوں ہی کوشاں رہیں۔ اگر مناسب ہو تو ان کا رابطہ نمبر دیں میں ان سے اپنے اس مستقل سلسلہ کے لیے اصلاح لوں گا۔ یہ باتیں ناگفتی بس یوں ہی ضمناً آ گئی ہیں لیکن حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بھی اخلاقی دیوالیہ پن کی ایک شکل ہے۔

آج یورپ والے اپنی علمیت کی وجہ سے بام عروج پر ہیں اور ہمیں ملاں نے جنت اور دوزخ میں اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ مفکر اعظم شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے آج سے کئی برس پہلے پہلے فرمایا تھا

محو حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لکھنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن طوالت کو اختصار دوں تو موزوں ہوگا۔

ہاں! اپنی زندگی کی 71 خزاں آلودہ بہاریں دیکھ چکا ہوں لیکن یہ دنیا پھولوں کی سیج نہ ہے۔ یہاں ہر ایک کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے۔ ایک لمحہ ایک انسان کے لیے خوشیاں بھی دے سکتا ہے اور دوسرے کے لیے غم واندوہ بھی لا سکتا ہے۔

بڑے خاں صاحب کی خدمت میں سلام!

(قلندر حسین، احمد پور شرقیہ)

تحریریں خود بولتی ہیں

محترم مدیر اعلیٰ سیارہ ڈائجسٹ لاہور! السلام علیکم۔

میں جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں، ماہِ ربیع الاوّل کی مبارک ساعتیں جاری ہیں۔ ہر طرف میرے آقا ﷺ کا نام گونج رہا ہے۔ لاکھوں کروڑوں

انسان فخر و انبساط سے آقا ﷺ کا نام پکار رہے ہیں، درود و سلام بھیج رہے ہیں، نعتیں پڑھ رہے ہیں۔ دل جھوم جھوم جاتا ہے اور یہ مالک ارض وسماء کے فرمان کے مطابق ''میرے پیغمبر محمد ﷺ پر درود و سلام پڑھو'' اور یہ قیامت تک اسی طرح ایسے ہی جاری و ساری رہے گا۔ مبارک ہو آپ سب حضرات کو۔

ساڑھے تین ماہ کے وقفے کے بعد یہ میرا پہلا عریضہ ہے۔ 13 اکتوبر کو پاکستان سے واپس آیا تو بیمار تھا۔ 14 اکتوبر کو رائل ہسپتال والوں نے داخل کرلیا پھر دو ہفتے زندگی وموت کی کشمکش میں گزرے۔ ایک ہفتے سے کچھ افاقہ ہوا تو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

آپ نے مرحوم ظریف صاحب پر میرا لکھا ہوا تعزیت نامہ شائع کیا، میں مشکور ہوں۔ جناب قلندر حسین صاحب کے محبت بھرے الفاظ بھی پڑھے۔ آتے وقت جلدی میں وہ خط وہیں پاکستان میں ہی رہ گیا۔ تاہم محترم قلندر حسین صاحب کی تحریروں کے متعلق میں کیا لکھ سکتا ہوں ان کی تحریریں (جس دن سے انہوں نے سیارہ میں لکھنا شروع کیا ہے) خود بولتی ہیں۔ انہوں نے ایک منفرد طرز تحریر روشناس کرایا ہے۔ ان کی ہر تحریر اپنے پیچھے ایک مکمل کہانی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ میں چھٹی جماعت سے کتابوں کا (شوق سے) مطالعہ کر رہا ہوں اور اب 28 جنوری کو 91 برس کا ہوگیا ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کم وبیش ان کی تحریریں میری نظروں سے (80 فیصد) مطالعے میں آچکی ہیں، تاہم کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو میری نظر سے نہیں گزریں۔ اس وقت میں جناب قلندر حسین کے مطالعے کی داد دیتا ہوں اور دل عش عش کر اٹھتا ہے، اتنا وسیع مطالعہ ہے ان کا کہ رشک پیدا ہوتا ہے۔ جامع اور بھرپور معنی و مطلب میں مقصدیت کے ساتھ مکمل ادبی تحریریں ہیں۔ جزاک اللہ۔ ان کے اظہار خیال میں لکھے ہوئے خیالات بھی غور سے پڑھتا ہوں۔ وہ بھی ان کی تحریروں کی طرح منفرد اور جامع ہوتے ہیں۔ اور قاری کے لیے ایک پیغام دیتے ہیں۔ ہر تحریر کے ماخذ بھی دیئے جاتے ہیں جو قارئین کے لیے مطالعے کی ایک اچھی ترغیب ہے۔ اللہ کرے ان کے قلم میں زور اور زیادہ (آمین)

آپ نے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا (ایک ڈیڑھ دو صفحہ والی) سلسلہ شروع کیا ہے، بہت بہتر ہے اور یہ کہانیاں بھی ایک مقصد لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ میں نے تمام کو ہی پسند کیا ہے۔ مثال کے طور پر ''لالو ماشکی'' کی رُوداد بہت پسند آئی۔ ایک حقیقت ہے۔

جناب کامران صاحب کا دستک میں اظہار خیال اب ترقی پر ہے اور ہر مسئلہ بہتر طور پر بیان کر رہے ہیں۔ دعا کریں میں پھر لکھنا شروع کروں۔ تین چار ماہ تو ایسے ہی گزرے ہیں کہ جیسے میرا ادب سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

(قاضی محمد یوسف، مسقط)

غلط فہمی کا ازالہ

جناب کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ماہ فروری 2013 کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ طاہر القادری کے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔

ایک قاری کا تحریروں کے حوالے سے اپنے نام خط دیکھا۔ اس قابل احترام قاری سے درخواست ہے کہ کبھی آپ انٹرنیٹ پر جائیں۔ آپ کو دنیا بھر کا مواد مل جائے گا اور میرے جیسے نجانے

کتنے لوگ انٹرنیٹ سے مواد لیتے ہیں..... مجھے جو سیارہ کے لیے تحریر اچھی لگتی ہے وہ میں ترجمہ کر کے سیارہ کے لیے بھیج دیتا ہوں تاکہ لوگ ایک اچھی چیز پڑھ سکیں۔ میری تحریروں کی اشاعت کے بعد وہی تحریر انٹرنیٹ پر کسی اور کو اچھی لگتی ہے وہ اسے اٹھا کر کسی اور میگزین کو بھیج دیتا ہے تو میں اسے نقل تو نہیں کہوں گا۔ انٹرنیٹ کی ایک وسیع دنیا ہے آپ کو جو چاہیئے وہ مل سکتا ہے۔ میں اسے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ امید ہے غلط فہمی کا ازالہ ہوگیا ہوگا۔

(ایس امتیاز احمد، کراچی)

دل آزاری کا باعث

جناب امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔

میں گزشتہ چار سال سے سیارہ ڈائجسٹ کی باقاعدہ قاری ہوں، مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج کے دور میں بھی آپ ایسا معیاری اور قابل قدر جریدہ شائع کر رہے ہیں جو ہم جیسے قارئین کی نہ صرف راہنمائی کر رہا ہے بلکہ باقاعدہ تربیت بھی کر رہا ہے۔ فروری کے شمارے کی مثال ہی لے لیجئے، ڈاکٹر طاہر القادری کے حوالے سے آپ نے جس طرح مفصل اور تفصیلی رپورٹ شائع کر کے تمام حقائق بیان کئے وہ لائق تحسین ہے۔ بالخصوص اس مضمون کی ابتدا اور اختتامی صفحات پر تجزیاتی تبصرے میں آپ نے تمام تر حقائق کی ترجمانی کر دی۔

سیارہ ڈائجسٹ میں کہانیوں کا معیار بھی بہت بہتر ہوگیا ہے، نئے اور باصلاحیت لکھنے والوں کو مواقع دے کر آپ نہ صرف ادب دوستی کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ اس سے شمارے میں بھی ایک تازگی اور نیا پن نظر آتا ہے ورنہ زیادہ تر جرائد وہی پرانے ادیبوں اور مصنفوں کی لمبی کہانیاں شائع کر کے اپنے تئیں فرض پورا کرتے ہیں مگر سیارہ ڈائجسٹ میں ہر ماہ ہمیں نئی چیزیں اور نئے خیالات پڑھنے کو ملتے ہیں جو بہت خوش آئند بات ہے۔

آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ میں گزشتہ ماہ کے شمارے میں جناب قلندر حسین کے بارے میں ایک قاریہ کا خط پڑھ کر بہت دکھ میں ہوں۔ میں حیران ہوں کہ آپ نے اس قاریہ کا خط کیونکر شائع کر دیا، قلندر حسین صاحب ہم سب کے لیے اتنی محنت سے قابل قدر تحریریں لے کر آتے ہیں جن کی قدر کرنی چاہیے۔ میری درخواست ہے کہ ایسے خط شائع نہ کیا کریں جو دوسروں کی دل آزاری کا سبب بنیں۔

(حمیرا خالد، شیخوپورہ)

کچن کارنر کے صفحات

محترم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم۔

میں ایک گھریلو عورت ہوں اور مجھے مطالعہ کے لیے زیادہ وقت نہیں مل پاتا کیونکہ گھر اور بچوں کی ذمہ داری اور دیگر فرائض کی ادائیگی کے بعد اتنا وقت نہیں بچتا کہ اپنے ذوق کی تسکین کر سکوں مگر اس کے باوجود جب بھی وقت ملے میں سیارہ ڈائجسٹ کا مطالعہ ضرور کرتی ہوں۔ بزم شاعری، سیارہ کچن کارنر اور سیارہ مشورہ کلینک میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ سیارہ کچن کارنر میں شائع ہونے والی کھانوں کی تراکیب واقعی معیاری اور منفرد ہوتی ہیں مگر میری آپ سے درخواست ہے کہ ان صفحات کو ذرا رنگین اور باعث کشش بنایئے تاکہ ہم خواتین ان کا مطالعہ شوق سے کر سکیں۔ میں نے کھانوں کی تراکیب کے دیگر شمارے دیکھے ہیں وہ دیدہ زیب ڈیزائن اور رنگین صفحات سے مزین ہوتے ہیں، آپ بھی ان صفحات کو اسی طرز پر شائع کریں۔

(ثمینہ فہیم، کراچی)

ہزارہ برادری پر ایک اور حملہ

بلوچستان میں ایک عرصہ سے لاقانونیت اور دہشت گردی کا راج ہے، انتظامیہ اور سکیورٹی نافذ کرنے والے ادارے اس صوبے میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ میں خاص طور پر فرقہ وارانہ دہشت گردی کی وارداتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، ایک مخصوص فرقے کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ملک میں فرقہ واریت کو ہوا دی جا رہی ہے۔ کبھی زائرین کی بسوں کو روک کر تمام مسافروں کی تلاشی لی جاتی ہے اور پھر اس مخصوص فرقے کے افراد کی شناخت کر کے انہیں گولیاں مار دی جاتی ہیں اور کبھی براہ راست انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے..... بدقسمتی اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری انتظامیہ اور ایجنسیاں ان دہشت گردوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کرتیں، یہی وجہ ہے کہ یہ وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور لوگوں کے پاس بس احتجاج کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ایک ماہ کے وقفے کے بعد بلوچستان کی ہزارہ منگول برادری پر ایک بار پھر قیامت گزر گئی جب کوئٹہ کی ایک رہائشی آبادی ہزارہ ٹاؤن میں 16 فروری کی رات دہشت گردوں نے بارودی مواد سے بھرے پانی کے ٹینکر میں دھماکے کے ذریعے 90 سے زیادہ انسانی جانوں کو تلف اور دو سو سے زائد کو زخمی کر دیا۔ جاں بحق ہونے والوں میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ کوئٹہ میں گزشتہ ماہ اسی برادری کے ایک سو کے لگ بھگ افراد ایک خودکش دھماکے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تین روز تک برستی بارش اور شدید سردی میں جنازوں کو سڑک پر رکھ کر احتجاج کیا گیا جس کے نتیجے میں 13 جنوری کو صوبہ میں وزیراعلیٰ نواب اسلم رئیسانی کی حکومت ختم کر کے گورنر راج نافذ کر

دیا گیا تھا۔ حالیہ دھماکے میں بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے بعد اب سکیورٹی ایجنسیوں کے پاس منہ چھپانے کی کوئی جگہ نہیں رہی۔ اس دھماکے کی ذمہ داری کالعدم لشکر جھنگوی نے قبول کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کارروائی ان کے خودکش بمبار نے کی ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ اس دھماکے کے لیے 8 سو کلوگرام سے زائد دھماکہ خیز مواد استعمال کیا گیا اور پرہجوم مارکیٹ میں اسے ریموٹ کنٹرول سے اُڑا دیا گیا۔ دھماکے کے وقت مارکیٹ میں خریداروں کا ہجوم تھا جبکہ سکول کے بچے بھی چھٹی ہونے کے بعد وہاں سے گزر کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ دھماکے کے بعد ہر طرف بے گناہ لوگوں کے اعضاء بکھر گئے اور بچوں کے جلے ہوئے بستے اور کاپیاں بھی چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔

اس افسوسناک واقعہ کے خلاف تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے ہڑتال اور سوگ منانے کا اعلان کیا ہے، گورنر بلوچستان نواب ذوالفقار علی مگسی نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دھماکہ سکیورٹی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ناکامی ہے۔ صوبائی حکومت نے دہشت گردوں کی اطلاع دینے پر 2 کروڑ روپے انعام کا اعلان کیا ہے جبکہ جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کے لیے 10، 10 لاکھ اور زخمیوں کو 2، 2 لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے مگر اس مالی امداد سے ان کے پیارے کسی طور واپس نہیں آسکتے، وہ زخم اور خلا کبھی نہیں بھر سکے گا جو جانے والوں کے جانے سے پیدا ہو گیا ہے۔

یہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ملک کی ایک کمزور اقلیت کے ساتھ اس طرح کا انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے، انہیں بسوں سے اُتار کر، شناختی کارڈوں سے نام پڑھ کر چن چن کر قتل کر دیا جاتا رہا ہے اور اب ان کی بستیوں اور بازاروں کو نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ فلسطینیوں اور کشمیریوں کے خلاف ایسی کارروائیوں کا الزام تو ہم ہنود و یہود پر لگاتے رہے ہیں مگر ہمارے اپنے ملک میں جو ہو رہا ہے اس پر ہم آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔

حکومتی ارباب اختیار اور بہت سے تجزیہ کاروں کا ماننا ہے کہ بلوچستان میں ہونے والی ایسی کارروائیوں کے پس پردہ بیرونی عوامل بھی کارفرما ہیں، ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو مگر ہمیں محض الزامات کے بجائے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ اس بات کی تشہیر کرنی چاہیے اور اگر یہ معاملہ سچ ہے تو اسے عالمی سطح پر ضرور اٹھایا جانا چاہیے۔ محض باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دہشت گردی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بن چکی ہے، اس کے خلاف ایک مضبوط اور ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے، دہشت گردوں اور فرقہ پرستوں کے بارے میں گومگو کی پالیسی سے ہمارا ملک بند گلی کی طرف جا رہا ہے اور تباہی ہمارا مقدر بن رہی ہے۔ افسوس کہ حکمرانوں کے ساتھ ہماری دینی اور سیاسی جماعتیں بھی دہشت گردی اور اس سے جڑے خطرات کا ادراک کرنے میں ناکام چلی آ رہی ہیں۔ مفادات اور لسانیت کی مجبوریوں کی آڑ میں ہم اس اہم قومی معاملے سے چشم پوشی کر رہے ہیں جو ہماری آئندہ نسلوں کا مستقبل تاریک کر رہا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا، بلوچستان اور کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجوہات ہم سب کے سامنے عیاں ہیں۔ یہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں اور مفادات ہیں جو ہمیں ان ناسوروں کو ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتے۔ ہر کوئی اپنے اپنے تعصبات اور مفادات کا اسیر ہو کر کمزوروں کے قتل عام کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دہشت گردی کرنے والے دشمن چھپے ہوئے ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، دشمن سب کے سامنے ہے جو ہر واردات کے بعد ذمہ داری بھی قبول کر لیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری ریاستی مشینری اور سکیورٹی کے ذمہ دار ادارے انہیں کنٹرول کرنے میں ناکام ہیں۔

ہمارے ہمسایہ ممالک اپنے مضبوط ارادے، عزم اور سکیورٹی اداروں کی مدد سے ملک کے ناسوروں سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ سری لنکا ہی کی مثال لے لیجئے، تامل ٹائیگرز نے ایک عرصہ سے ان کے ناک میں دم کر رکھا تھا مگر ایک مضبوط ادارے اور قومی اتحاد کے ساتھ دہشت گردوں کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل سے وہ انہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان ایک ایٹمی قوت ہے، ہماری فوج اور سکیورٹی ایجنسیاں دنیا کے بہترین ادارے ہیں۔ اگر ہمارے حکمران اور سیاسی و مذہبی راہنما واضح سمت اور بلند حوصلے کے ساتھ دہشت گردوں اور فرقہ پرستوں کے صفایا کا عزم کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی ان سے جان چھڑوانے میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن اگر ہم نے یونہی چشم پوشی کا رویہ اختیار کئے رکھا تو یقین جانئے فرقہ واریت کا یہ دیو صرف ہزارہ برادری نہیں بلکہ ہمارے پورے ملک کو تباہی کا شکار کر دے گا!

سیارہ رپورٹ

کیا پاکستان میں شفاف اور پُر امن انتخابات ہوسکیں گے؟
کیا پاکستان میں لمبی مدت کیلئے ٹیکنو کریٹ حکومت بنے گی؟

دہشت گردی کی جنگ اور جمہوریت کے پچھلے پانچ سالوں میں جنرل کیانی کا کردار

پچھلے کئی سال سے پاکستان بحرانوں کا شکار ہے۔ ہر نیا بحران پاکستانی عوام کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر مایوسیوں کے سمندر میں دھکیل دیتا ہے۔ شک وشبہات میں ڈوبی قوم میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ اب فوج آئے گی اور اقتدار پر قابض ہو جائے گی۔ جب سے ملک میں جمہوریت قائم ہوئی ہے اور پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا ہے ملک کوئی کئی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بجلی اور گیس کا بحران، عدلیہ کی بحالی، دہشت گردی کی جنگ، این آر او کیس جس میں وزیراعظم کو سزا ہوئی، مالاکنڈ سوات آپریشن، حکومت کی کرپشن، اسامہ کے لیے امریکہ کا آپریشن، کراچی بدامنی، بلوچستان کا مسئلہ، امریکہ میں پاکستانی سفیر حقانی، عمران خان کا سونامی اور آخر میں قادری لانگ مارچ، ان تمام بحرانوں کو ٹی وی چینلز، اخبارات، میڈیا کے سیاسی تجزیہ نگاروں نے اس طرح پیش کیا کہ یوں لگتا تھا حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں اور عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب ملک میں مارشل لاء ضرور لگ جائے گا۔ کئی اینکر پرسنز نے تو کچھ بحرانوں کا الزام بھی براہ راست فوج پر عائد کیا اور اسے ان بحرانوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

ان کے خیال میں فوج حالات خراب کر کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی ہے مگر آفرین ہے جنرل کیانی

پر کہ انہوں نے ایسی کوئی پیش قدمی نہ کی اور سیاسی تجزیہ نگاروں کو نہ صرف شرمندہ ہونا پڑا بلکہ عوام کا اعتبار بھی انہوں نے کھو دیا۔ پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ اقتدار میں کئی بار ایسے حالات پیدا ہوئے جن میں فوج ملک کی باگ دوڑ سنبھال سکتی تھی مگر جنرل کیانی اپنے وعدے پر قائم رہے اور انہوں نے فوج کو سیاست سے الگ رکھا۔

ملک میں نئے الیکشن ہونے والے ہیں، ایک بار پھر نئی افواہیں جنم لے رہی ہیں کہ فوج ملک میں نئے الیکشن نہیں چاہتی بلکہ پاکستان میں لمبی مدت کے لیے ٹیکنو کریٹ حکومت چاہتی ہے جو ملک کو درپیش بڑے بڑے مسائل کو حل اور تمام سیاست دانوں کا احتساب کر سکے۔ ان افواہوں میں کس قدر سچائی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ کیا جنرل کیانی ایک بار پھر سرخرو ہو جائیں گے؟ ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے اسد اللہ غالب کا زیرِ نظر مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں انہوں نے جنرل کیانی کے پچھلے ریکارڈ پر نظر دوڑائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں.....

ایڈیٹر

جنرل کیانی سرخرو ٹھہریے(1)

تاریخ جنرل کیانی کو یاد رکھے گی۔ ان کے شاہنامے تحریر کیے جائیں گے، رزم ناموں میں ان کا نام سنہری حروف میں چمکے گا۔ ایسا جرنیل جسے اندر اور باہر کے دشمن سے بیک وقت پالا پڑا اور دونوں محاذوں پر اس نے اپنے دشمنوں کو بُری طرح پچھاڑ کر رکھ دیا، تیسرا محاذ سیاست کا تھا، اس قدر چکنا کہ ہر جرنیل اس پر پھسل پھسل جاتا ہے مگر جنرل کیانی نے فرمان روز اول جاری کیا کہ ان کے ماتحت فوج سیاست میں منہ نہیں مارے گی، اس عہد کو پانچ سال بیت گئے، ایک سے ایک بڑھ کر نادر موقع آیا، جمہوریت دشمنوں نے اسے بار بار آواز دی مگر جنرل کیانی نے اپنے کام سے کام رکھا، اقتدار کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، سیاستدان باہم دست و گریبان رہے، عدلیہ اور پارلیمنٹ کا بار بار تصادم ہوا، وزراء کو جیل کی ہوا کھانا پڑی، وزیراعظم کو گھر بھیج دیا گیا، نامزد وزیراعظم کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، وزیر دفاع کو ای سی ایل میں ڈال کر سرکاری دورے پر جانے سے روکا گیا۔۔ شہر شہر مقتل بنے رہے، خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی، مزارات، مساجد، مدارس، سکولوں، مارکیٹوں، بازاروں، گھروں، جنازوں تک میں لاشوں کے چیتھڑے اُڑے، غیر ملکیوں اور مقامی افراد کو اغوا کیا گیا، یرغمال بنا کر تاوان طلب کیا گیا، میزائل داغے گئے، ڈرون حملوں نے تباہی کا بازار گرم رکھا، غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے کنٹریکٹروں نے کھیل کھیلا۔ بھارت نے براہ راست الزام تراشی کی، حکومت وقت نے کہا کہ ریاست کے اندر ریاست کو برداشت نہیں کیا جائے گا، میڈیا شور مچاتا رہا کہ خارجہ پالیسی کو جی ایچ کیو نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ جنرل کیانی یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے، اوائل صبح کی شبنم کے قطروں کی طرح خنک، ٹھنڈے اور دھیمے مزاج والے اس شخص نے کبھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ کسی نے کہا کہ

دفاعی پالیسی کی اجارہ دار بھی فوج بنی ہوئی ہے اور کہنے والوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ پارلیمنٹ نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں متفقہ قرارداد منظور کر کے جنرل کیانی کو وار آن ٹیرر کی کمان سونپ دی تھی تو پھر اجارہ داریوں کے طعنے کیسے۔ جنرل کیانی کو کس کس نے چرکے نہیں لگائے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف، اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔

وہ جس نے کہا تھا کہ جنرل کیانی کو توسیع نہ دی جائے، وہ عدلیہ کی بحالی کے لیے لانگ مارچ پر نکلا تو اسی جنرل کیانی نے اسے فون کر کے کہا کہ لانگ مارچ کی ضرورت نہیں عدلیہ بحالی کا فیصلہ ہوگیا، لانگ مارچ والے گوجرانوالہ کی نہر کنارے ایک گھر میں محوِ خواب تھے کہ آخر شب عدلیہ بحالی کا اعلان وزیراعظم کی ہنگامی نشری تقریر کے ذریعے سامنے آگیا۔ جنرل کیانی ثالث بالخیر بنے، انہوں نے یہ سب کچھ آئین کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کیا۔ اسی لیے آج تک ان پر کوئی معترض نہیں ہوا، اس لیے کہ ہر کوئی اس اقدام پر جنرل کیانی کا مشکور تھا۔ جنرل کیانی نے ایک گناہ اور کیا، سوات میں بدامنی پر قابو پانے کے لیے انہوں نے ملکی تاریخ میں ایک اور فوجی آپریشن کا آغاز کیا۔ وہ لشکر کشی نہ کرتے تو سوات کے لشکر اسلام آباد پر چڑھائی کے لیے تیار تھے، کہوٹہ اور انتہاپسندوں کے درمیان صرف مارگلہ کی پہاڑیاں حائل ہیں۔ فوجی آپریشن پہلے بھی ہوتے رہے، بلوچستان میں ہوئے، بار بار ہوئے، ایک آپریشن میں بلوچ سردار پہاڑوں پر چڑھ گئے، کچھ کابل اور لندن میں جا بیٹھے، ایک آپریشن میں سردار بگٹی کو نشانہ بنایا گیا، سندھ میں ڈاکوؤں کے خلاف اور کراچی میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ہوئے مگر ادھورے رہے اور مزید بگاڑ کا باعث بنے، مشرقی پاکستان میں آپریشن ہوا اور پاکستان دولخت ہوگیا، خود فوج کے نوّے ہزار افسر اور جوان بھارتی جنگی کیمپوں میں پہنچ گئے مگر سوات اور مالاکنڈ کا آپریشن اس حشر سے محفوظ رہا کہ اس کی کمان ایک منجھے ہوئے اور برد بار جرنیل کے ہاتھ میں تھی۔ اس آپریشن کی منصوبہ بندی باریک بینی سے کی گئی تھی اور انتہائی احتیاط کے ساتھ پیش قدمی کی جارہی تھی،

پھر بھی میڈیا نے شور وغوغا مچایا کہ فوج نے اپنے ہی ہم وطنوں کو گھر بار سے باہر کر دیا ہے، کسی نے کہا کہ بہتر ہوگا کہ سوات پر ایٹم بم مار دیا جائے مگر جنرل کیانی کسی اشتعال میں نہ آئے، وہ منصوبے کے مطابق چلتے رہے اور تاریخ میں پہلی بار کوئی فوجی آپریشن چند ماہ کے اندر مطلوبہ منزل سے ہمکنار ہوگیا، بے گھر ہونے والے لاکھوں افراد واپس بھی چلے گئے۔ وہی سوات جس کے بھرے بازاروں میں لوگوں کی گردنیں اُڑائی جاتی تھیں، عورتوں کو کوڑے مارے جارہے تھے اور پھانسیاں دی جارہی تھیں اور سکولوں، دفاتر اور دکانوں کو بارودی دھماکے کر کے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جاتا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رونقیں واپس آگئیں، ملکی اور غیرملکی سیاح اب اسی سوات کی جنت نظیر وادیوں میں آزادانہ طور پر گھوم پھر سکتے ہیں۔ دریائے سوات کے پانیوں کی نغمگی اب دلوں کو پھر سے مسحور کر رہی ہے۔ اس کامیابی نے جنرل کیانی کو حوصلہ مند بنایا۔ اس نے قبائلی علاقوں کی کمیں گاہوں میں مورچہ زن انتہاپسندوں کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا۔ ڈرانے والوں نے ڈرایا کہ یہ وہ علاقہ ہے جہاں سکندراعظم کی فوج کے قدم نہیں ٹک سکے، جہاں برٹش آرمی کا بھرکس نکال دیا گیا اور بڑے بڑے فاتحین عالم ان سنگلاخ پہاڑوں کی نوکیلی چٹانوں سے اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش کروا بیٹھے اور جس کے بندوق برداروں نے دنیا کی دوسری سپر پاور سوویت روس کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیا۔ کتابی اصولوں کے مطابق پاک فوج کو اس علاقے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے تھی مگر جب ریاست پاکستان کی رٹ اور عملداری کا سوال ہو اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی بحالی کا مسئلہ ہو تو پھر ہر چہ باداباد، سروں کی فصل کٹوانا ہی عقل کا راستہ تھا، پاک فوج اس کربلا میں اُتری، اس کے سات ہزار افسروں اور جوانوں کو شہید کیا گیا، ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے اور معذوری کا شکار ہوگئے، پاکستانی معاشرے کی بے حسی اور بے اعتنائی کا حال یہ تھا کہ کسی شخص نے کسی شہید کے جنازے کو کندھا دینے، اس کے جنازے میں کھڑے ہو کر تصویر بنوانے یا اس کو لحد میں اُتارنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ وہ جو وطن پر قربان ہو رہے تھے، اہل وطن ان سے اغماض برت رہے تھے، جنرل کیانی کا دل دکھی تھا، دونوں طرف سے ایک طرف ان کے بچے کٹ مر رہے تھے، وطن کی حرمت پر قربان ہو رہے تھے اور دوسری طرف اہل وطن کو ان کی قربانیوں کی کوئی پروا نہ تھی، میڈیا کا ایک حصہ ان کو شہید لکھنے سے بھی کترا رہا تھا، صرف جاں بحق لکھتا، کیا ستم ظریفی ہے کہ دہشت گرد بھی جاں بحق اور ان کا نشانہ بننے والے بھی جاں بحق، صدقے جاؤں میں اس میڈیا کی انصاف پسندی اور آزادی کے دعووں پر۔

اب انتخابات سر پر ہیں۔ فوج پھر نشانے پر ہے، جنرل کیانی کا نام لے کر صلواتیں سنائی جارہی ہیں۔ حکومت اور پارلیمنٹ کے گنتی کے دن باقی ہیں، پانچ سال گزر گئے، جنرل کیانی نے اس حکومت اور پارلیمنٹ سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ پارلیمنٹ کی طرف سے بار بار طلبی پر فوج نے ہر موقع پر وضاحتیں پیش کیں، جنرل پاشا نے پارلیمنٹ کے سامنے مستعفی ہونے کی پیش کش کی۔ اس فوج کو کوئی

معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اب اسے الزام دیا جا رہا ہے کہ وہ انتخاب نہیں ہونے دے گی، ٹیکنو کریٹ کی تین سال کی حکومت لے آئے گی، قومی فوج کے سالار اعلیٰ کے خلاف یہ مہم کیوں، جنرل کیانی جو تاریخ میں سرخرو ہو چکے، انہیں رسوا کیوں کیا جا رہا ہے، اس نکتے کو سمجھنے کے لیے طویل پس منظر میں جانے کی ضرورت ہے۔

جنرل کیانی سرخرو ٹھہرے (2)

دھرنے اور لانگ مارچ ہوں گے، ڈاکٹر طاہر القادری کی طرف سے ہوں، میاں نواز شریف کی طرف سے ہوں، عمران خان کی طرف سے ہوں۔ قتل و غارت گری اچانک بڑھ جائے تو پھر مارشل لا کے نفاذ کا امکان بھی ہوگا لیکن فوج صبر بھی کر سکتی ہے اور مارشل لا کا خطرہ ٹل سکتا ہے مگر کب تک! جنرل کیانی جس حد تک تحمل کا ثبوت دے سکتے تھے، یہ کسی فوجی کی طرف سے نہیں، انسانی بس سے بھی باہر کی بات تھی، انہوں نے لازمی طور پر اپنے کمانڈروں اور ان کے ماتحت افسروں اور جوانوں کی طرف سے جلی کٹی سنی ہوں گی مگر وہ مہم جوئی سے باز رہے کہ وہ قوم کے ساتھ ایک وعدہ کر چکے تھے۔ وعدہ یہ تھا کہ وہ مارشل لا تو کیا، فوج کو سیاست میں منہ بھی نہیں مارنے دیں گے۔ انہوں نے اپنے زیر کمان پہلا سال

سپاہی کے وقار میں اضافے کے لیے مختص کیا، انہوں نے شہدا کی یاد میں تقاریب کیں اور سال کا ایک دن آج تک کے تمام فوجی شہدا کی یاد کے لیے مخصوص کر دیا مگر مارشل لا کے نفاذ کے قدرتی مواقع کب کب نہیں آئے، ایبٹ آباد پر امریکی جارحیت اور پھر میمو گیس کی جارحیت جیسے سانحہ کسی افریقی ملک میں رونما ہوتے تو کوئی نیم لفٹین بھی نیچے سے اٹھ کر خونیں انقلاب برپا کر دیتا مگر جنرل کیانی صبر و تحمل کا پیکر ثابت

نجم صاحب!

اللہ پاک آپ کو جنتوں کی ٹھنڈک میں رکھے۔ آمین!

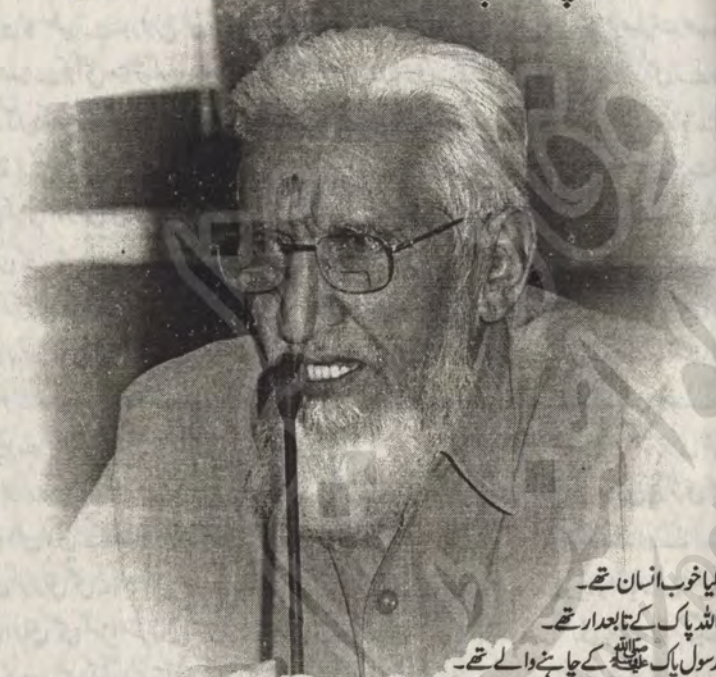

آپ کیا خوب انسان تھے۔
آپ اللہ پاک کے تابعدار تھے۔
آپ رسول پاک ﷺ کے چاہنے والے تھے۔
آپ پاکستان سے پیار کرتے تھے، قائداعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کے فدائی تھے۔
آپ اپنے بڑوں کے فرمانبردار تھے۔
آپ اپنے چھوٹوں پر شفقت کیا کرتے تھے، انہیں بہت کچھ سکھایا کرتے تھے اور انہیں آگے بڑھتے دیکھنا چاہتے تھے۔
آپ کو پتہ تھا کہ انجینئرنگ میں قدم جمائے بغیر کسی قوم کی معیشت مضبوط نہیں ہوتی۔
آپ کا شروع کردہ انجینئرنگ ریویو اسی نکتہ کو نمایاں کرتا آ رہا ہے۔
ان سب باتوں کی وجہ سے ہی تو ہم آپ کو چاہتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم سب بھی نجم الحسن بن جائیں۔
اور آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم بھی پاکستان کی معیشت اور دفاع کو مضبوط تر کرنے کے لیے آواز اٹھاتے رہیں۔

آپ کو یاد کرتے رہنے والے

امجد رؤف خان (چیف ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ) و عملہ سیارہ ڈائجسٹ

ہوئے، انہوں نے کسی انا کا مظاہرہ نہیں کیا اور ملک کی کسی نازک گھڑی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایبٹ آباد جارحیت بھی امریکہ سے نازل ہوئی تھی اور میموگیس کا عذاب بھی امریکہ کا عطا کردہ تھا۔ ایبٹ آباد جارحیت پر پارلیمنٹ پھنکار رہی تھی، ظاہر ہے قوم کے جذبات کو سخت دھچکا لگا تھا، پارلیمنٹ کا اضطراب ایک فطری بات تھی مگر فوجی قیادت نے پارلیمنٹ کے سامنے سر جھکا دیا کہ یہ ادارہ عوام کی حاکمیت کا مظہر ہے اور فوج عوام میں سے ہی ہے۔ میموگیس نے تو چٹان کی مانند حوصلہ مند صدر مملکت کے اعصاب کو بھی متاثر کر دیا اور وہ سکون کی تلاش میں دبئی کے ہسپتال جا پہنچے اور اگر کسی نے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تو وہ جنرل کیانی تھے، وہ جانتے تھے کہ انہیں ایک دلدل کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور وہ جانتے بوجھتے ہوئے اس میں دھنسنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہیجان کا طوفان بہت جلد اپنی موت مر گیا۔ جنرل کیانی اور ان کی زیرکمان فوج پر ایک ہلہ کیری لوگر بل کی صورت میں بولا گیا۔ فوج کئی برس سے وار آن ٹیرر میں امریکی حلیف بن کر دہشت گردوں سے نبرد آزما تھی مگر جونہی مشرف منظر سے ہٹے تو نئے آرمی چیف کے سامنے کیری لوگر بل کا سرخ رومال لہرا دیا گیا۔ امریکی کانگرس نے پاکستان کی امداد کو کئی باتوں سے مشروط کر دیا تھا اور صاف کہہ دیا کہ جو بھی امداد دی جائے گی وہ براہ راست پاکستانی عوام کو ملے گی، فوج کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی نہ حکومت کو کوئی دھیلا دیا جائے گا۔ میں صدقے جاؤں اس غیرت مند لابی کے جو اچھل اچھل کر اس بل کو مسترد کر دینے کا واویلا کر رہی تھی مگر جونہی بل منظور ہو گیا اور روشن پاکستان کے نام پر براہ راست ڈالر ملنے لگے تو وہ غیرت مندی کی ساری چوکڑی بھول گئی اور وہ اس فوج کے مفاد کو بھی بھول گئی جو قوم کو تحفظ فراہم کرنے کی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے اپنے بچے قربان کر رہی تھی۔ اُلٹا یہی غیرت لابی اس وقت فوج پر پل پڑی جب بریگیڈیئر امتیاز بل منظر عام پر لائے، رہی سہی کسر اصغر خاں کیس نے پوری کر دی۔ بظاہر اس کا نشانہ سابق آرمی چیف اسلم بیگ تھے یا ان کے دور میں آئی ایس آئی کے چیف جنرل درانی تھے لیکن اس کج بحثی میں فوج کو لپیٹ لیا گیا اور جس کے دل میں فوج کے خلاف جو عناد اور بغض تھا، اس کا کھلے عام اظہار کیا جانے لگا، آئین کا جو آرٹیکل عدلیہ کی تضحیک میں رکاوٹ ہے، وہی فوج کی تضحیک کی بھی ممانعت کرتا ہے۔ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور درجنوں دوسرے سیاستدانوں اور حکومتی اہلکاروں کو عدلیہ کی تضحیک کے الزام بھگتنے پڑے مگر آئین کا یہ آرٹیکل فوج کی تضحیک پر چپ سادھے رہا۔ لاپتہ افراد کے مسئلے پر تو جنونی میڈیا نے فوج کی پیٹھ پر طعن و تشنیع کے کوڑے برسائے۔ کراچی میں قانون نافذ کرنے کے جرم میں رینجرز کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا، کوئٹہ میں بے چہرہ ازبکوں کے خلاف رینجرز کی کارروائی پر بھی تادیبی کارروائی ہوئی۔ لاہور میں رینجرز کے ایک ڈرائیور کو مار پٹائی کے معمولی جرم میں حوالات اور جیل کی راہ دکھائی گئی مگر ان میں سے کسی معاملے پر فوج نے کسی جوابی اقدام کا سوچا تک نہیں۔ پچھلے پونے پانچ برس میں فوج کی تذلیل کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر واردات ہوئی مگر کسی نے کسی کو گھر نہیں بھیجا، پارلیمنٹ بھی اپنی

میعاد پوری کرنے والی ہے اور اس کے ٹوٹنے کا جب بھی اعلان ہوگا تو خود حکومت کی طرف سے ہوگا اور وہ بھی لیڈر آف دی اپوزیشن کے مشورے کے ساتھ۔ ان پانچ سالوں میں حکومت اور ریاست کو کسی نے چلنے نہیں دیا تو اس کی ذمہ داری صرف اور صرف حکومت اور اس کے اتحادیوں اور اس کی فرینڈلی اپوزیشن پر عائد ہوتی ہے، عوام بلک رہے ہیں، مسائل کے جہنم میں سلگ رہے ہیں، اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، سی این جی کی تلاش میں میلوں لمبی قطاروں میں ذلیل ہو رہے ہیں، نوجوانوں کی ڈگریاں کسی روزگار کا دروازہ نہیں کھولتیں، خودسوزیاں ہو رہی ہیں، پنکھوں سے لٹک کر موت مانگی جا رہی ہے یا ڈینگی، دل کی غلط دواؤں، کھانسی کے شربت اور خسرے سے جانیں ضائع ہو رہی ہیں تو کیا اس کے لیے فوج کو موردالزام ٹھہرایا جا سکتا ہے، جواب ہے، ہرگز نہیں۔ ایک زمانے میں ایسی ہی قیامت برپا تھی تو ایک منچلے شہری نے لاہور کی نہر کنارے اپنے مکان کی منڈیر پر آرمی چیف کی تصویر کے نیچے یہ مصرع لکھ دیا تھا: مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے۔ خود میں بھی ایک سویلین آمریت کی گھٹن سے تنگ آ کر یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اگر کئی برس سے قحط کا عالم ہو، فصلیں برباد ہو رہی ہوں، زمین کی سطح انگاروں میں تبدیل ہو چکی ہو اور محکمہ موسمیات پیش گوئی کر رہا ہو کہ مستقبل قریب میں بارش کے کوئی آثار نہیں ہیں تو کیا انسان بارش کے لیے دعا نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ جمہوریت کے خلاف بات کرنا آئین کے تحت جرم ہے، لیکن جمہوری نظام کی مروجہ خامیوں کی نشاندہی تو کوئی جرم نہیں ہے، جمہوریت کسی تھانیداری کا نام تو نہیں، جمہوریت کسی آمریت کا نام بھی نہیں، جمہوریت کسی کمپنی حکومت کا نام بھی نہیں، اس لیے ڈاکٹر طاہرالقادری ہوں یا عمران خان ہوں یا میرے جیسا کوئی ایک فرد، لوگوں کی بھلائی کی خاطر ہر تجویز دے سکتا ہے، نظام پر ہر جائز تنقید کر سکتا ہے اور اب تو ڈاکٹر طاہرالقادری کے دھرنے کے جرم کی تقلید میں ن لیگ نے بھی دھرنا دیا ہے، ن لیگ نے تو لاہور میں عمران خان کے جلسے پر بھرپور تنقید کرنے کے بعد اس کی تقلید میں جلسے کرنے کی کوشش کر دیکھی تھی تو کسی نے ن لیگ کے اقدام کو مارشل لا لگوانے کا باعث قرار نہیں دیا تھا۔ ویسے جس نے جس کسی کو مارشل لا لگوانے کا طعنہ دینا ہو وہ اپنا شوق پورا کر دیکھے، مارشل لا جنرل کیانی نے لگانا ہے لیکن نہیں لگایا، نہ لگائیں گے۔ کیوں نہیں، جواب کوئی اتنا بھی مشکل نہیں۔

جنرل کیانی سرخرو ٹھہریے (3)

عدلیہ کے سابقہ فیصلوں کے مطابق پاکستان کا کوئی مارشل لا غیرآئینی نہیں تھا تو پھر آئندہ کے کسی مارشل لا سے چڑ کاہے کو۔ ابتدا میں قائداعظمؒ کی بہن اور مادرملت فاطمہ جناحؒ نے ایوب خان کے مارشل لا کی تائید کی تھی۔ بعد میں محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ایوب خاں کے مقابل صدارتی الیکشن بھی لڑا۔ جن سیاسی اور بزعم خویش جمہوری قوتوں نے محترمہ کو الیکشن میں کھڑا کیا اور ان کی انتخابی مہم چلائی، انہوں نے ایوب خاں کے اقتدار کو بالواسطہ طور پر قبول کیا۔ ایوب خان کے مارشل لا کو غلط

ثابت کرنے کے لیے آج تک کوئی تحقیق اور تفصیل سامنے نہیں آئی۔ چینی چور کے نعرے کے ساتھ لاہور کی مال روڈ پر سوٹڈ بوٹڈ بچوں سے جلوس نکلوا کر ایوب خاں کے اقتدار کا جلوس نکال دیا گیا، کیا کسی مارشل لا ڈکٹیٹر کو تخت سے اُتارنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے، جی ہاں، صرف اس وقت، جب اگلا آرمی چیف خود اقتدار سنبھالنا چاہتا ہو۔ ایوب خاں کی جگہ یحییٰ خاں نے لے لی، اسی کے منعقد کردہ انتخابات میں ان دونوں عوامی سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا جنہیں مشرقی اور مغربی پاکستان سے اکثریت حاصل ہوئی۔ بھٹو اور شیخ مجیب یحییٰ خاں کو غاصب سمجھ رہے ہوتے تو الیکشن میں کیوں جاتے۔ یہی حال شوکت اسلام والوں کا ہے جنہیں شکست فاش ہوئی مگر انہوں نے بھی الیکشن میں حصہ لیا۔ یحییٰ خاں پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس کے مارشل لا نے پاکستان دولخت کیا لیکن اس حوالے سے جمہوریت نواز سیاستدانوں کا کردار سب کے سامنے ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی نہیں، بھارتی فوج نے جارحانہ یلغار کر کے ڈھاکہ پر قبضہ جمایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے سوچئے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی باہمی سرپھٹول میں بھارتی فوج کا کیا کام تھا۔ بھائی، یہ سارا کام تو بھارت ہی کا تھا جس نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی دعویٰ کر دیا تھا کہ نئی اسلامی مملکت زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی، سرنڈر کے بعد کس نے کہا تھا کہ نظریۂ پاکستان کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا گیا ہے، اگر یہ قول تاج الدین یا شیخ مجیب کا نہیں، اندرا گاندھی کا تھا تو ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنا بنگالیوں کا نہیں، بھارت کا منصوبہ تھا جس میں وہ کامیاب رہا اور بھارت کے منصوبوں میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ آج اندرا گاندھی کی بہو سونیا گاندھی کہہ چکی ہیں کہ پاکستان کو ثقافتی یلغار میں ڈھیر کر دیا گیا ہے۔ یہ بات کسی بلوچ لیڈر یا سندھو دیش کے لیڈر نے نہیں کی۔ بھارتی کانگرس کی صدر نے کی ہے۔ تو پاکستان کے بارے میں مذموم عزائم کس کے ہیں اور ان کے ثبوت میں مزید دلائل لانے کی ضرورت کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بھارت کے ساتھ اب امریکہ بھی کھل کر پاکستان کے مقابل آن کھڑا ہے، رچرڈ ہالبروک مر گئے، اس کی روح نہیں مری، اس کے افکار نہیں مرے، ملکوں کے حصے بخرے کی پی ایچ ڈی اس کے ساتھ قبر میں نہیں اُتری۔ ستمبر دو ہزار دو میں ری پبلکن امریکی صدر بش نے نئی صلیبی جنگ کے آغاز کا بگل بجایا تھا، یہ صلیبی جنگ دو مرتبہ صدارتی الیکشن جیتنے والے سیاہ فام امریکی صدر اوبامہ کی زیر کمان بھی جاری ہے، اس جنگ میں اصل مدمقابل پاک فوج ہے، اس کی ایٹمی قوت ہے، اس کا جذبۂ ایمانی ہے، اس کے ایثار کی لازوال تاریخ ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جو پاکستانی فوج پہلے دن سے وار آن ٹیرر میں امریکہ کے ساتھ ہے، وہ مدمقابل کیسے ہو گئی۔ امریکہ بڑا ہوشیار ہے۔ اس کی فوج افغانستان میں اُتری، عراق میں اُتری، اس کے شہ پر نیٹو افواج نے لیبیا کے مرد آہن قذافی کا دھڑن تختہ کیا، تیونس میں صدر زین العابدین کو چلتا کیا، مصر میں حسنی مبارک کا بولو رام ہو گیا اور اب شام کے بشار الاسد

مہمان اداکار کے طور پر دمشق کے تخت پر بیٹھے ہیں۔ امریکہ کی یہ نقل و حرکت کیموفلاج اور دھوکے کی ذیل میں آتی ہیں، اس نے اعلان کر دیا کہ وہ افغانستان خالی کر جائے گا، اور ہم اس پر یقین کر کے بغلیں بجانا شروع کر دیں، شاداں و فرحاں دکھائی دینے لگیں، مگر آگے ایک پل صراط ہے جس پر پاکستان کو لٹکنا ہے۔ یہ پل صراط اصل میں پاک فوج کے لیے ٹکٹکی ہے۔ پاک فوج اس پل صراط کو اسی صورت پار کر پائے گی جب عوام اس کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور عوام اور فوج کے درمیان فاصلے پیدا کرنا ہی امریکہ کی اصل کامیابی ہوگی۔ اگر ہمارے ہاں پتہ بھی ہلنے لگے اور ہم اپنی فوج کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں تو قوم اور فوج کے مابین اعتماد کے رشتے کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ عمران خان کی نئی انگڑائی سے جنرل پاشا کا کیا لینا دینا، ڈاکٹر طاہر القادری کی اچانک آمد سے پاک فوج کا کیا تعلق مگر ہم نے اس مفروضے پر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ اصل میں تو ہم چاہتے یہ ہیں کہ ملک میں سٹیٹس کو قائم رہے، جاگیردار، وڈیرے، کرپٹ اور خونی بلائیں ہماری گردنوں میں نوکیلے دانت گاڑھ کر ہمیں مُردار میں تبدیل کر دیں اور پھر ہماری ہڈیاں بھی نوچ ڈالیں اور کوئی تیسری سیاسی قوت اس سٹیٹس کو، کے لیے چیلنج نہ بن سکے۔ اسی لیے ہم بڑی آسانی سے تیسری قوت کے ظہور پر شیر آیا، شیر آیا کے نعروں کی طرز پر فوج آئی، فوج آئی کے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم سٹیٹس کو کے جبر کو مسلط رکھنے کے لیے مارشل لا کا ہوا کھڑا کر دیتے ہیں اور کس قدر ستم کی بات ہے کہ ماضی میں جب بھی فوج آئی تو یہی سٹیٹس کو کے علمبردار اچھل کر فوج کی گود میں بھی بیٹھ گئے۔ دادے، پردادے، پوتے اور نواسے، بھتیجے اور بھانجے، ظل الٰہی اور ان کی اولادیں ہر مارشل لا کے ساتھ تھے اور ہر جمہوری تماشے میں بھی ڈگڈگی انہی کے ہاتھ میں تھی، عوام تو اس تماشے میں صرف ناچنے کے لیے تھے۔ ان دنوں کارگل کی رام کہانی دہرائی جا رہی ہے، اس کا کیا مقصد ہے، صرف یہ کہ فوج کو ٹھاپ لگائی جا سکے۔ اسی فوج کو عالمی اخبارات میں شائع کیے گئے اشتہارات میں روگ آرمی کہا گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ جب بھی فوجی حکومت ہوتی ہے تو بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ جاتی ہے، پینسٹھ میں جنگ چھڑی، اکہتر میں جنگ چھڑی، چوراسی میں سیاچن کی جنگ چھڑی مگر کارگل کی جنگ کس دور میں چھڑی، ایک جمہوری حکومت کے دور میں نا!۔ اس جمہوری حکومت کا دعویٰ تھا کہ اسے جنگ کی اطلاع نہیں دی گئی، چار کے ایک جرنیلی ٹولے نے ہاتھ دکھایا۔ پہلی افغان جنگ چھڑی، وہ بھی فوجی حکومت کے دور میں، دوسری افغان جنگ چھڑی، وہ بھی فوجی حکومت کے دور میں۔ یہ سب کچھ عام آدمی کے علم میں ہے تو جنرل کیانی کے علم میں بھی ہے۔ کیا وہ مارشل لا لگا کر اگلی کسی جنگ کا دوش لینے کے لیے تیار ہوگا، اس کا جواب نفی میں ہے۔ تو پھر ہر کوئی مارشل لا، مارشل لا کی دہائی کیوں دے رہا ہے، اپنے گھر کو درست کرنے کے بجائے دوسرے کو گھر کی خرابیوں کے لیے موردالزام کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ سن لیجئے، مارشل لا نہ آ رہا ہے نہ آئے گا مگر یہ بھی نہیں ہو

پائے گا کہ مارشل لاؤں کے پروردہ یہی مگرمچھ اور نہنگ اپنے جبڑوں میں سادہ لوح عوام کو دبوچے رکھیں۔ اس نظام کا بوریا بستر اب گول ہونا ہے، کیسے گول ہوگا، اس کے لیے پردۂ غیب کے اٹھنے کا انتظار کیجیے۔

جنرل کیانی سرخرو ٹھہرے (4)

یہ ایک الف لیلیٰ کی داستان ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ مارشل لا بہت بڑی بدی ہے، آئین سے انحراف ہے مگر ہمارے ہاں یہ سکہ رائج الوقت رہا ہے اور ماضی کی عدلیہ سے لے کر سیاستدانوں تک نے اس کی چوکھٹ پر سر جھکایا ہے۔ موجودہ عدلیہ نے اعلان کیا ہے کہ وہ آئندہ کسی مارشل لا کو سند جواز نہیں بخشے گی اور نہ کوئی جج پی سی او کے تحت حلف لے گا مگر اس سے بھی پہلے موجودہ آرمی چیف کہہ چکے ہیں کہ ان کی زیر قیادت فوج کوئی سیاسی یا حکومتی مہم جوئی نہیں کرے گی، اس واضح اعلان اور پچھلے پانچ برس میں اس پر مکمل عمل درآمد کے باوجود فوج کے خلاف بلیم گیم جاری رہنا اور نادیدہ قوتوں، انٹیلی جنس اداروں یا خفیہ سازشوں کی اصطلاح میں فوج کو رگڑا دینے میں کوئی منطق نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے دشمنوں کا یہ ایجنڈہ پورا کر رہے ہیں کہ اپنی اس فوج کو کمزور کریں جو پچھلے پینسٹھ برس سے بھارتی بالادستی کے عزائم کو چکنا چور کر رہی ہے، جو بھارت کی بلیو واٹر نیوی کے ان عزائم یک تکمیل کی راہ میں حائل ہے کہ عالم عرب کی خلیج فارس کے دہانے سے براعظم افریقہ کی راس کماری تک کے پانیوں پر بھارت کا پھریرا لہرائے۔ جس فوج نے لارڈ کرشنا کے دور کے مہابھارت کے جغرافیے کے احیاء میں رکاوٹ کھڑی کی ہے اس فوج کے ناقابل شکست ہونے کے تصور کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں سرنڈر کی ایک تقریب کے ذریعے گہنانے کی کوشش ضرور کی گئی مگر سیاچن اور کارگل میں اسی فوج نے بھارت کا غرور خاک میں ملایا، ہم کارگل پر جتنی مرضی سیاست کرتے رہیں مگر بھارت اس کو اپنی بدترین شکست مانتا ہے اور اس نے کئی تحقیقاتی کمیشن بنا کر اس شکست کے ذمہ داروں کو کڑی سزائیں دی ہیں۔ سیاچن میں اس نے جس قائد پوسٹ پر چوروں کی طرح قبضہ جما لیا تھا، پچھلے اٹھائیس برس میں اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکا حالانکہ وہ بلندی پر بیٹھا ہے اور جب پاکستان نے کارگل کی بلندیوں پر قبضہ جمایا تھا تو بھارت کو امریکی صدر کلنٹن کی مداخلت سے ان کا قبضہ واپس مل پایا تھا۔ پاکستان کی اس مایہ ناز فوج کا لوہا پوری دنیا مانتی ہے، وار آن ٹیرر میں جو نتائج اس فوج نے حاصل کیے، وہ امریکی اور اس کی اتحادی نیٹو افواج کے درجنوں ممالک کی افواج مل کر بھی حاصل نہیں کر سکیں اور آخر بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے کی تصویر بنے، وہ واپسی کے محفوظ راستے کی بھیک مانگ رہی ہیں۔

اپنے ذہن پر زور دیجیے، اس فوج کا ڈنگ کیسے ختم کیا جا سکتا ہے، صرف اور صرف اسے سویلین دلدل میں دھکیل کر۔ کیا پچھلے پانچ سال میں اس کے لیے ہزار ہا کوششیں نہیں ہوئیں، کس نے کب

اور کہاں حالات خراب کرنے کی جان بوجھ کر کوشش نہیں کی تاکہ فوج بیرکوں سے نکلے اور ایوان حکومت پر قابض ہو جائے اور پھر اسے عوام سے دو بدو مقابلے میں سرنڈر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مشرف کے آخری دنوں میں اس فوج کو کیا کیا طعنے نہیں ملے، میں وہ سب کچھ یہاں نقل کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ اور دُور کیوں جائیں ایبٹ آباد سانحے پر جس کسی کے منہ میں جو آیا، کیا وہ سب کچھ نہیں کہا گیا۔ کون سا طعنہ ہے جو فوج کو نہیں ملا۔ پہلا سوال یہ اٹھایا گیا کہ کاکول جیسے حساس علاقے میں ایک اجنبی کیسے چھپ کر رہ سکتا ہے اور وہ بھی عالمی سطح کا ٹارگٹ۔ اس الزام کا مطلب واضح تھا۔ اس کو بار بار دہرایا گیا تو جنرل پاشا نے ٹوپی اُتار کر پارلیمنٹ میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا تھا مگر جنونی طبقے استعفے پر کب راضی ہونے والے تھے، وہ تو صرف اس فوج کو دنیا کی نظروں میں ذلیل اور رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ ایجنڈہ ہے جو بھارتی خفیہ ادارے را کا دیا ہوا ہے، یہ وہ مشن ہے جسے اسرائیلی موساد نے انہیں سونپا ہے اور امریکی سی آئی اے ان سب کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ ڈالروں کی جھنکار پر یہ اپنی افواج کو بے توقیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسا صرف پاکستان میں ہو سکتا ہے ورنہ بھارتی عوام اور ان کا میڈیا اپنی افواج کے پیچھے کھڑا ہے اور امریکی عوام اور ان کا میڈیا اپنی افواج کی ہلہ شیری میں مصروف ہے، امریکہ نے نائن الیون کے سانحے کے پانچ منٹ بعد یہ کہہ دیا تھا کہ یہ اسامہ بن لادن کا کیا دھرا ہے تو ہر امریکی ایرے غیرے نے یہی ڈفلی بجانا شروع کر دی تھی مگر پاکستانی فوج جو موقف اختیار کرتی ہے اس کے برعکس جانا ہمارا قومی وطیرہ بن گیا ہے۔ میں اپنی فوج کے دشمنوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انہیں آخر تو اپنی حفاظت کے لیے کوئی فوج چاہیے، اپنی نہیں تو غیروں کی فوج آ جائے گی۔ اور ہم میں سے ہر کوئی اسی کوشش میں مصروف ہے کہ اپنی فوج کا بستر بوریا گول کرو، استعماری افواج کے چھاتہ برداروں کے گلے میں ہار ڈالو۔ یہی وہ ذہنیت ہے جو جنرل کیانی کے خلاف کارفرما ہے اور انہیں ہر کوئی بلا وجہ مارشل لا نہ لگانے کے طعنے دے رہا ہے۔ جنرل کیانی تو شریف انسان ہے، نجیب آدمی ہے، اپنے قول پر پورا اُترنے والا ہے، صادق اسی کو کہتے ہیں۔ وہ امین بھی ہے، اس نے اپنے منصب کا بار امانت ذمہ داری سے اٹھا رکھا ہے، اس میں خیانت کا مرتکب نہیں ہوا، وہ کریز سے باہر نہیں نکلا، اس نے حد پار

نہیں کی تو پھر اس کو روز کس بات کے طعنے، وہ اگر نادرا کے دفتر میں چیف الیکشن کمشنر سے اتفاقیہ ملا یا طے شدہ پروگرام کے تحت ملا تو اس ملاقات کی بات کا بتنگڑ کیوں بناتے ہو۔ اس کی چسکے دار رپورٹنگ کی کیا ضرورت! یہ تو جنرل کیانی کے فرائض کا حصہ ہے کہ انتخابات پرامن ہوں۔ کیا پرامن انتخابات کی یقین دہانی کرانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جمہوری سورماؤں کے سامنے کوئی کمزوری دکھا رہا ہے اور اگر ڈاکٹر طاہرالقادری کہتے ہیں کہ وہ دھرنا ختم نہ کرتے تو پانچ منٹ میں مارشل لا لگ جاتا تو اس پر ڈاکٹر قادری اور ممکنہ یا مبینہ مارشل لا لگانے والوں پر طنز کے تیر کیوں چلائے جا رہے ہیں۔ یاد رکھئے مارشل لا لگانے کے لیے کسی ریہرسل کی ضرورت نہیں ہوتی، کوئی ڈیوٹی چارٹ تیار کرنا بھی نہیں پڑتا، یہ سب کچھ کتابوں میں لکھا موجود ہے۔ یہ دنیا جہان کی فوجی کتابوں میں لکھا موجود ہے، بھارت میں بھی چند ماہ پہلے انہی کتابوں میں لکھی ہدایات کے مطابق فوج حرکت میں آ گئی تھی۔ جنرل اسلم بیگ اور جنرل کاکڑ نے مارشل لا نہیں لگایا تو یہ ان کی کمزوری نہیں، شرافت تھی۔ جنرل مشرف سے کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ مارشل لا لگا سکتا ہے، اسے تو فضاؤں میں ریٹائر کر دیا گیا تھا اور لنڈے بازار سے فیتے منگوا کر اس کی جگہ نیا آرمی چیف متعین کر دیا گیا تھا مگر انہونی کو کون روک سکتا تھا، جب نیا آرمی چیف حالات سے خود بے بہرہ تھا جو آئی ایس آئی کا سربراہ ہونے کے باوجود آج بھی یہ کہتا ہے کہ مشرف نے وزیراعظم کو کارگل سے بے خبر رکھا تو جناب آپ کس مرض کی دوا تھے۔

اور آخر میں یاد رکھئے۔ پاکستان میں کسی مارشل لا کو آج تک غیر آئینی قرار نہیں دیا گیا، ہر مرتبہ عزیز ہم وطنو! کی دھن پر عوام نے رقص کیا، مٹھائیاں بانٹیں، حلوے کھائے، آتش بازی کی اور غاصبوں کی نرسریوں میں پرورش پائی۔ اور اب ہمی کو میاؤں کر رہے ہیں، بڑے جمہوریت پسند بنتے ہیں، جمہوریت پسند تو جنرل کیانی نکلا جس نے ہر موقع پانے اور ہر اختیار رکھنے کے باوجود جمہوریت کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے اپنا نام جمہوریت پسندی کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھوا لیا۔ اس کے شاہنامے تحریر کیے جائیں گے، وہ رزم ناموں کا ہیرو ہوگا، کوئی فردوسی، یہ رزم نامے اور یہ قصیدے لکھے گا اور جنرل کیانی کو تاریخ سلام پیش کرے گی لیکن جمہوریت جب بھی پٹڑی سے اُترے گی تو کسی جنرل کیانی کی وجہ سے نہیں بلکہ جمہوریت کے ٹھیکیداروں کی وجہ سے جو فاشزم کی علامت بن گئے ہیں، عوام کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ بھی چوسنے پر تلے ہوئے ہیں، یہ نئے دور کے ظل الٰہی ہیں۔ ان کی جمہوری آمریت کو عوام کب تک برداشت کر سکیں گے، یہ ملین ڈالر کا سوال نہیں، سامنے کی حقیقت ہے، دیوار پر لکھی ہوئی ایک واضح تحریر ہے، آئینے میں نظر آنے والا عکس ہے جسے دیکھ کر ہم منہ دوسری طرف کر رہے ہیں مگر آئینے کے اندر سے بلا نکل کر رہے گی بدبودار جمہوری نظام کو ہڑپ کرنے کے لیے۔

ہنسی علاجِ غم ہے

"عوام"

پہلا دوست: "تمہاری گھریلو زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

دوسرا دوست: "دراصل ہم لوگ جمہوریت پسند ہیں پریشانی سے بچنے کے لئے ہم نے مختلف شعبے آپس میں تقسیم کر رکھے ہیں..... میری بیوی وزیر خزانہ، ساس وزیر جنگ ہے، سسر کے پاس امور خارجہ ہیں، سالی وزیر اطلاعات جبکہ سالا وزیر داخلہ ہے....."

پہلا دوست: "اور تم وزیر اعظم ہو؟"

دوسرا دوست: "نہیں..... میں غریب عوام ہوں۔"

"دیر ہوجاتی"

مجاہد نے ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! کیا شبیر کا آپریشن ہوگیا؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "ہاں آپریشن ہوگیا اور شکر ہے کہ وقت پر ہوا ورنہ اگر دیر ہوجاتی تو آپریشن بیکار تھا۔" مجاہد نے پوچھا۔ "خیر تھی نا! کیا کوئی خطرناک معاملہ تھا؟" ڈاکٹر نے جواب دیا "نہیں تو، بات صرف یہ ہے کہ اگر دو دن کی تاخیر ہوجاتی تو شبیر خود بخود ٹھیک ہوجاتا....."

"ماں....."

ماں نے اپنے نوجوان بیٹے کو آواز دی۔ "بیٹا نیچے آجاؤ اتنی رات گئے چھت پر کیا کر رہے ہو؟"

"امی! چاند دیکھ رہا ہوں....." بیٹے نے جواب دیا۔

"بیٹا! بہت دیر ہوگئی ہے۔ تم بھی نیچے آجاؤ اور چاند سے بھی کہو کہ اپنے گھر چلا جائے۔" ماں نے کہا۔

"عمر خیام"

ایک امیدوار کسی پوسٹ کے لئے انٹرویو دے رہا تھا۔ ایک افسر نے سوال کیا۔ عمر خیام کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ امیدوار نے کہا۔ عمر خیام بہت اچھی جگہ ہے۔ بالکل راس الخیام کے پاس ہے۔ میں وہاں گیا تھا۔ انٹرویو کے بعد وہی افسر اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا۔ "آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوگیا ہے اسے عمر خیام کا بھی پتہ نہیں ہے حالانکہ عمر خیام کلفٹن کے بالکل قریب ہے آج کل وہاں ایک میرج ہال والوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔"

"غلطی"

ایک قیدی: اب تو تمہاری سزا ختم ہونے والی ہے۔ باہر جا کر تم کیا کرو گے؟

دوسرا قیدی: میں ٹارچ خریدوں گا۔

پہلا قیدی: وہ کیوں؟

دوسرا قیدی: کیونکہ پچھلی چوری میں غلطی سے میں نے الارم بجا دیا تھا۔

"عقل مند"

ایک شخص نے اپنے لان میں سبزیاں اُگا رکھی تھیں۔ کبھی کبھار جب کسی سبزی کی بیوی کو ضرورت نہ ہوتی تو وہ اسے گھر کے سامنے سڑک کے کنارے ایک کرسی پر رکھ دیتا جس پر لکھا ہوتا۔ مفت لے جایئے۔ ایک دن اس نے بہت بڑا کدو فالتو سمجھ کر کرسی پر رکھ دیا۔ شام کو دیکھا تو کدو زمین پر رکھا ہوا تھا اور کرسی کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔

"خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی گھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

husain.8@hotmail.com

حاصل مطالعہ

☆.....قرآن حکیم کا اصرار، فکر سے زیادہ عمل پر ہے!

☆.....تم آدمی کو تو قتل کر سکتے ہو مگر سوچ کو نہیں۔

☆.....اصولوں کی قربانی دیتے ہوئے دشمن کو مسلسل راضی رکھنے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے آپ مگرمچھ کو اس امید پر کھلائے چلے جائیں کہ وہ آپ کو نہیں کھائے گا۔

☆.....تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆.....سقراط سے پوچھا گیا کہ موت سے بھی کوئی سخت تر چیز ہے؟ جواب دیا گیا کہ زندگی، کیونکہ ہر قسم کے رنج و آزار و مصیبتیں زندگی ہی میں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور موت ان سے نجات دلاتی ہے۔

☆.....دنیا ایک خس پوش کنواں ہے۔ عقل مندوں کو ہوشیاری کے ساتھ قدم رکھنا چاہیے۔

☆.....تمہارا دشمن خواہ مچھر سے بھی چھوٹا ہو مگر اسے ہاتھی سے بڑا سمجھو۔

☆.....جو بات کان میں سنائی جائے وہ اکثر سو سو میل کے فاصلے سے سنی جاتی ہے۔

☆.....اس خیال میں مت رہنا کہ میں ہمیشہ تندرست، خوبصورت اور تونگر ہی رہوں گا۔

☆.....اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اس کے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ اس سے بچو!

☆.....محض لباس سے مردم شناسی نہیں ہو سکتی کیونکہ آدمی کا بنانے والا اللہ ہے اور لباس کا بنانے والا درزی۔

☆.....زندگی میں انسان کی ناکامی پر غور نہ کرو کیونکہ بہت سے انسان اس وجہ سے بھی ناکام رہتے ہیں کہ وہ دیانتداری کا خیال زیادہ رکھتے ہیں۔

☆.....حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے کسی نے پوچھا ''آپ نے وہ دانائی جو آپ کے کلام سے ٹپکتی ہے، کیونکر حاصل کی؟'' آپ نے فرمایا ''کم کھانا، کم سونا، کم بولنا اور دوسرے دن کے لیے کوئی چیز جمع نہ کرنا۔''

☆.....ایک عورت صرف ایک راز مخفی رکھ سکتی ہے اور وہ اس کی عمر کا راز ہے۔

☆.....تاریخ معمولی اور غیر اہم واقعات کا غلط ریکارڈ ہے۔ یہ واقعات ایسے شخص کے تحریر کردہ ہیں جس نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

عظیم ترین انسان

مدینہ منورہ سے میری عقیدت بہت پرانی تھی۔ حضرت محمد ﷺ سے میرا جذبۂ احترام صرف اسلام کی وجہ سے نہ تھا کہ وہ رسول اللہ تھے بلکہ اس لیے کہ وہ عظیم ترین انسان بھی تھے۔

اس زمانے میں انگریزی زبان میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ تھی جو اسلام یا محمد ﷺ کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کرتی البتہ ایسے ہندو اور عیسائی مصنفین کی کتابیں ضرور ملتی تھیں جو اسلام کے خلاف تعصب کی وجہ سے مشہور تھے جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب میں revolt کی عمر میں تھا۔ جب مذہب میرے نزدیک اپاہج کے لیے ایک سہارا تھا، اندھے کے لیے راستہ تلاش کرنے کی لاٹھی تھا۔ جب میں نہ تو اندھا تھا نہ اپاہج۔ جب میں سب کچھ جانتا تھا، سمجھتا تھا۔ ان دنوں مجھے ایسی کتابوں کی تلاش تھی جو اسلام کے عیب گنواتی تھیں۔ ان سے مجھے عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔ میں نے ایسی کئی کتابیں پڑھی تھیں۔ سمتھ ڈی این سین، لالہ جپت رائے، ایڈورڈ گبن، باڈلے، شیلے پول..... یہ سب مصنف اسلام کے خلاف زہر افشانی کرنے میں لذت محسوس کرتے تھے لیکن نہ جانے بات کیا تھی کہ وہ یک زبان ہو کر محمد ﷺ کی تعریف پر مجبور تھے۔

یا اللہ! تیرا یہ بندہ کتنا عظیم انسان ہوگا کہ دشمن بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا، کوئی کہتا ہے انہوں نے سب امتیازات مٹا دیے، کوئی کہتا ہے وہ گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، چولہے میں آگ جلاتے، لیکن کئی دن ایسے بھی آتے جب اس عظیم انسان (ﷺ) کے گھر کے چولہے میں آگ نہ جلتی تھی۔

ان تعصب بھری تحریروں کے دھوئیں سے حضور ﷺ کی منور کرن اُبھری اور میرے ذہن پر چھا گئی۔

(''لبیک'' ممتاز مفتی کی کتاب سے اقتباس)

شیخ سعدی

شیخ سعدی سفر کر رہے تھے۔ ساتھ ان کا گدھا تھا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو رات پڑ گئی۔ سردی کے دن تھے۔ رات بسر کرنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی ٹھکانہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والے نے کہا ''میری بیوی دردِ زہ میں تڑپ رہی ہے بچہ نہیں ہوتا۔ اگر دعا کریں تو جگہ دے دُوں گا۔'' شیخ سعدی مان گئے۔ انہیں کمرہ مل گیا۔ پھر انہوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر ایک تعویز لکھا اور گھر والے سے کہا اسے مریضہ کے ناف پر باندھ دے۔ تعویز

باندھتے ہی بچہ ہو گیا۔

اگلی صبح شیخ سعدی تو چلے گئے لیکن گاؤں والوں نے تعویز سنبھال کر رکھ لیا۔ جب بھی کسی گاؤں والی کو زچگی کی تکلیف ہوتی تو وہ وہی تعویز لے جا کر باندھ دیتے۔ تکلیف رفع ہو جاتی۔

گاؤں کے مولوی کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر تعویز پر لکھی ہوئی آیت کا پتہ چل جائے تو اسے بڑا فائدہ ہو گا۔ مولوی نے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراشا اور تعویز مانگ کر لے گیا۔ اسے کھولا تو لکھا تھا ''یا اللہ میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں۔ ٹھکانہ مل گیا ہے۔ باقی تُو جانے اور تیرا کام جانے۔''

زندگی ایک میلہ ہے

ایک حکیم کا قول ہے کہ ''زندگی ایک میلہ ہے'' اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے، اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے (بہت سے گرم و سرد زمانے کے دیکھتا ہے، نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے، بچپن سے لے کر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے، جب گھس پس کر بڈھا ہو لیتا ہے تو ذرا آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سُنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ بھی سکے)۔

جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلبگار ہوتا ہے۔ ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد و مصیبت کی فریاد، خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا (ابھی ایک طرف ناچ، رنگ، شادی اور مبارکبادی ہے دوسری طرف سے رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ایک گھر میں دولت و اقبال کا جوش و خروش ہے۔ ابھی ایک صدمہ ایسا پڑا ہے کہ ساری خوشیاں مٹی ہو گئی ہیں۔ ادھر آبادی ہے ادھر بربادی ہے۔ ادھر ہوائے ترقی اور جوش و اقبال ہے ادھر ادبار کی آندھی ہے۔ ابھی عمر کا جہاز صحیح سلامت بادِ مراد پر چلا جاتا ہے۔ ابھی طوفان طلاطم میں غوطے کھا رہا ہے۔ اول تو دل بہت حیران ہوا، بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے؟

ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب کہاں جاتے ہیں، دریائے حیات میں تیر رہے ہو، پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کشتیوں کی کمزوری سے (بچوں کے نازک بدن اور دھان پان سے بدن) کچھ ملاحوں کی غفلت سے (اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیماردار مراد ہیں) کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر ہم اُتر آئے۔ اب منجھدار سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے (یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاش معاش اور راہ ترقی میں اسے پیش آتے ہیں) کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی

نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کئے ہیں جو راستہ بتانے اور پار اُتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی۔ فقط خدا کی آس ہے اور بس۔

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھنا شروع کیا اور دل سے کہا کہ پہلے نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہرانہ کچھ زور تھا نہ شور تھا مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا وہ اسے بلبلے کی طرح بہا لے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع ہوتا ہے (فی الحقیقت دنیا کی ابتدا کس نے دیکھی ہے، جو آیا چلتا ہوا کارخانہ دیکھا اور چلتا ہوا ہی چھوڑ جائے گا

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گی)

یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں اور جابجا گرداب (انہیں دنیا کے مکروہات، جسمانی بیماریاں، دشمنوں کی برخلافیاں اور اپنی بدپرہیزیاں اور بے اعتدالیاں سمجھو) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادمراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے اور جو بیچارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اُڑاتے چلے جاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا بہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے، اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے یا کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آ جائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اس مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے جو موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اُڑتی چلی جاتی تھیں، وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ الحمدللہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے جو گرداب اوروں کو نگل گیا میں اس سے بچ جاؤں گا اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر اسی رستے چلے جاتے تھے۔ اس بے پرواہی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

(''نیرنگ خیال'' از شمس العلماء مولوی محمد حسین

آزاد مرتبہ ڈاکٹر محمد صادق سے اقتباس)

آواز

جو سماج اور معاشرہ دھاندلی، جبر، دھونس اور ناانصافی پر آواز نہیں اٹھاتا وہ نہ تو مہذب ہے اور نہ ہی معزز کہلا سکتا ہے۔

عظیم لوگ

دنیا بھر کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے آج صدر آفس غیر ضروری ٹیکسوں کے نہ ہونے سے سنگاپور منتقل ہو چکے ہیں۔ بابائے قوم لی کون یو خود بھی قانونی ذرائع سے حاصل ہونے والی سب سے بڑی آئی ٹی اور موبائل کمپنیوں کے مالک ہیں۔ ان کا شمار سنگاپور کے ارب پتیوں میں ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی کو عدالت نے کوڑوں کی سزا دی۔ امریکی اخبارات نے بہت اچھالا کہ یہ غیر انسانی سزا ہے۔ امریکی انتظامیہ نے بہت زور لگایا اور سنگاپور کے حکمرانوں کو بہت ڈرایا دھمکایا مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس امریکی کو کوڑوں کی سزا دے کر جہاز میں بٹھا کر سنگاپور سے بے دخل کر دیا گیا۔ ایک بینک نے ایک کمپنی کے قرضے معاف کر دیئے۔ انہوں نے اس رقم پر لگنے والی انکم ٹیکس کی رقم بینک والوں سے وصول کر لی۔

لی کون صاحب ایک مرتبہ خصوصی دعوت پر پاکستان آئے۔ کراچی میں گورنر ہاؤس میں ان کا ڈنر تھا۔ پہلے انہوں نے ہمارے گورنر ہاؤس کے متعلق معلوم کیا کہ اس میں کتنے افراد رہتے ہیں۔ اتنا بڑا رقبہ کیوں صرف ایک فیملی کے لیے رکھا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کہنے لگے لگتا ہے پاکستان سنگاپور سے زیادہ امیر ہے کیونکہ ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ جب ڈنر وقت کے مطابق شروع نہ ہوا تو انہوں نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ جہاز کی فلائٹ کا وقت رات دس بجے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے وہ لیٹ ہو جائیں اور دوسرے مسافروں کو تکلیف ہو لہٰذا فوری طور پر کھانا لگا دیا جائے۔ ہمارے پروٹوکول والوں نے کہا کوئی بات نہیں ہم کھانا لگاتے ہیں مگر چند رسمیں ابھی تقریب کی باقی ہیں۔ جب کھانا دیر سے لگا انہوں نے گھڑی دیکھی صرف سوپ پیا اور اے ڈی سی کو گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی آ گئی تو انہوں نے گورنر اور مدعوئین سے معذرت کی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانگی کا حکم دیا۔

اس طرح 80ء کی دہائی میں ملائیشیا میں ڈاکٹر مہاتیر محمد نے وزارت عظمیٰ سنبھالی۔ چار بار اس اسلامی مملکت کے وزیراعظم جمہوری طریقے سے چنے گئے۔ 21 سال حکومت کی۔ کوئی کرپشن کا داغ نہیں لگا۔ اپنے اچھے اور کاروباری دوستوں کو بڑے بڑے ٹھیکے بھی دیئے کیونکہ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ اگر بڑے تعمیراتی کام بڑے اداروں کو نہیں سونپے گئے تو غیر معیاری کام اور دیر سویر ہونے کا امکان رہتا ہے لہٰذا وہ ٹینڈر دیتے وقت صرف کاروباری ساکھ کا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی بہت پیسہ کمایا مگر قانون کے مطابق۔ خود بھی ارب پتی ہیں۔ آج جاپان کے بعد ملائیشیا ایشیا میں الیکٹرانک، کاروں اور صنعتوں میں دوسرے نمبر پر آ چکا ہے۔ تمام عمر امریکہ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔

خیال

شب بھر بہ رنگ شمع دل جل گیا ہمارا
روشن ہوا نہ تیری آمد کا استعارا
خود مجھ کو ڈوبنے کا تھا شوق ورنہ
کچھ دور بھی نہ تھا میرے لیے کنارا
محرومیاں ہی ٹھہری بہر مزاج آدم

جنت کی نعمتوں پر ہو سکتا تھا گزارا
گل لالہ سے کہا باد صبا نے آ کر
داغ جگر کسی پر مت کرنا آشکارا
شکوہ نہیں ہے اچھا شاکی! ترے لب پر
کچھ لفظ بن جاتے ہیں باعث خسارا

(خیال: قلندر حسین سیّد
اصلاح شد جناب رفیق احمد پوری)

غزل

مری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں
یا مقدر میں راستہ ہی نہیں
وہ بھرے شہر میں کسی سے کبھی
مرے بارے میں پوچھتا ہی نہیں
پھر وہی شام ہے، وہی ہم ہیں
ہاں! مگر دل میں حوصلہ ہی نہیں
ہم چلے اس کی بزم سے اٹھ کر
اور وہ ہے کہ روکتا ہی نہیں
میں تو اس کی تلاش میں گم ہوں
وہ کبھی مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں

(کلام: پروین شاکر)

معیار

کسی ملک کی تہذیب کا معیار نہ تو اس کی آبادی پر ہے نہ عبادت گاہوں پر نہ بڑے شہروں کے وجود پر نہ دولت کی مقدار پر..... اصل معیار یہ ہے کہ وہ ملک کس قسم کے انسان پیدا کر رہا ہے۔

تعلیم

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ چکی تھیں، اس دور میں ہٹلر نے چرچل کو پیشکش کی ''اگر اتحادی فوج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیڈل برگ اور گوٹن جن پر بم نہ گرانے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی۔'' چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیراعظم کے ایک ساتھی نے آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا ''اگر برطانیہ پورا تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئیں تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں گے کہ پورا برطانیہ تباہ ہو گیا۔''

اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوّے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کے لیے اگر اس وقت کرۂ ارض پر کوئی محفوظ جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں۔ بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی جائے پیدائش کے خانے میں بھی ہائیڈل برگ یا گوٹن جن لکھا گیا۔

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی افادیت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا کہ دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں، کالج اور سکول آباد رہتے ہیں، ان کے لیکچر ہالوں میں علم و ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو برس بعد کا زمانہ، قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں مصر کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ 1952 میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 ملین پاؤنڈ کے

اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدقماش جاگیرداروں کی جاگیریں بیچ کر سکول بنانے شروع کر دیئے۔ اس دور میں مصر میں دو، دو دنوں میں تین تین سکول کھولے گئے۔ تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے پچاس برس میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آج چوٹی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا حصہ 70 فیصد ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد سکولوں میں آج بھی ٹوائلٹ نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے بھی ہزاروں سکول ہیں جن میں طالبعلم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے اساتذہ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں استاد کی تنخواہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا فوکس بنالے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دے۔ ٹیکنالوجی کی پچاس ساٹھ یونیورسٹیاں بنائے۔ شہروں اور قصبوں اور دیہات سے چن چن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے۔ بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے، انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم و ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو۔ حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے۔

(''زیرو پوائنٹ'' جاوید چودھری کی کتاب سے اقتباس)

اپنی زبان

ایک پنجابی لڑکے کی شادی پنجابی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے تو دونوں پہلے دن اردو بولنا شروع کرتے ہیں اور پوری زندگی بولتے چلے جاتے ہیں، اگر آپ اردو بولنے والے پنجابی گھروں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو وہاں عجیب منظر دکھائی دے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ خاتون اپنی ساس اور سُسر کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کر رہی ہے اور خاوند اپنے دوست احباب، پڑوسیوں اور دکانداروں سے پنجابی بول رہا ہے لیکن جوں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے دونوں آپس میں اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی صورتحال بچوں کے ساتھ ہے۔ بعض گھرانوں میں میاں بیوی آپس میں پنجابی بولتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ وہ اُردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ پنجابیوں کے مقابلے میں پشتونوں، بلوچوں اور سندھیوں کا رویہ یکسر مختلف ہے۔ یہ لوگ گھروں سے لے کر دفتروں اور کاروباری مراکز تک احساس کمتری کے بغیر اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کی زبانیں بڑی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ ہیں جبکہ ہم پنجابیوں کو عام روزمرہ کے الفاظ تک نہیں ملتے اور ہم پنجابی میں اردو اور انگریزی کے الفاظ جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک لطیفہ نہیں حقیقت ہے کہ ایک خاتون نے مجھ سے ''جزیرہ'' کی پنجابی پوچھی تھی، مجھے معلوم نہیں تھی۔ میں نے اپنے چند پنجابی دان دوستوں سے رابطہ کیا لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ ذرا سے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد معلوم ہوا پنجابی زبان میں ''جزیرہ'' لفظ ہی نہیں اور اس کی وجہ پنجاب کا جغرافیہ ہے۔ پنجاب کی سرحدیں کیونکہ سمندر سے بہت دُور ہیں چنانچہ پنجابی زبان کو سمندر اور جزیرے جیسے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑی لہٰذا پنجابی

زبان ان الفاظ سے محروم ہے۔

زبانیں کیسے بنتی ہیں اور کن کن مراحل سے ہو کر پختہ ہوتی ہیں، یہ ایک مکمل سائنس ہے۔ میں اس سائنس سے ناواقف ہوں لیکن میں ایک بات جانتا ہوں زبانوں کا جغرافیے، ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ زبانیں ہمیشہ ماحول سے جنم لیتی ہیں اور لوگوں کا مزاج ان میں رنگ بھرتا ہے۔

پچھلے دنوں ملک کے نامور ادیب، شاعر اور صف اوّل کے کالم نگار جناب عطا الحق قاسمی صاحب کے ساتھ میری گپ شپ ہو رہی تھی، اس گپ شپ کے دوران ہم لوگوں نے ''ڈسکور'' کیا پوری پنجابی زبان میں شکریہ اور معافی کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان دو بنیادی الفاظ کی کمی ہماری تاریخ اور ثقافت کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم لوگ کیونکہ کسی کے مشکور ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی سے معافی مانگتے ہیں لہٰذا ہماری زبان میں یہ دونوں الفاظ موجود نہیں ہیں۔ ہم لوگ کندھا مارنے کے ماہر ہیں اور کندھا مارنے کے بعد اس کی زد میں آنے والے شریف انسان کی طرف آنکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے لہٰذا آج تک ہماری زمین میں شکریہ اور معافی جیسے الفاظ کاشت نہیں ہوئے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں اگر اسلام میں شکریہ ادا کرنا نیکی نہ ہوتا تو پنجابی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی کے مشکور نہ ہوتے۔

حاتم

اگلے زمانے میں یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ نہایت صاحب چشم، عالی جاہ، فوج کی طرف سے فرخندہ حال، زر و جواہرات سے مالا مال۔ بادشاہ کے ہاں ایک مہر لقا شہزادہ پیدا ہوا اور نجومیوں، رمالوں اور پنڈتوں نے اپنی پوتھیوں، زائچوں اور قرعوں کی مدد سے بتایا کہ یہ شہزادہ مفت اقلیم کا بادشاہ ہوگا اور ساری عمر براہ خدا دوسروں کی خدمت گزاری میں صرف کرے گا۔ یہ شہزادہ آرائش محفل یا قصہ حاتم طائی کا ہیرو حاتم ہے۔

ملک خراسان کے ایک سوداگر برزخ جس نے مرتے وقت اپنی ساری دولت اور مال و اسباب اپنی بیٹی حسن بانو کو سونپا تھا۔ حسن بانو نے اپنی بوڑھی دائی کے کہنے سے اپنے محل کے دروازے پر سات سوال لکھ کر لگا دیئے تھے کہ جو کوئی ان سات سوالوں کو پورا کرے وہی شہزادی کا مالک ہو۔ شہزادی کے حسن کا شہرہ سن کر منیر شامی نامی ایک شہزادہ حسن بانو کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے شادی کی درخواست کی۔ حسن بانو نے اپنی شادی کی شرطیں پیش کیں تو وہ بہت دل گرفتہ ہوا اور مایوسی کے عالم میں صحرا صحرا مارا مارا پھرنے لگا۔ فراق محبوب میں جنگلوں کی خاک چھاننا اور پہاڑوں سے سر ٹکرانا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں رو رو کر صبح سے شام اور شام سے صبح کرتا اور موت کی آرزو میں جیتا۔

ایک دن اتفاقاً ادھر سے حاتم کا گزر ہوا۔ منیر شامی کی زبوں حالی دیکھ کر اسے اس پر ترس آیا اور اس نے تہیہ کیا کہ جس طرح ہو گا منیر کو اس کے محبوب سے ملائے گا۔ اس کے بعد وہ (حاتم) حسن بانو کے پاس جاتا ہے اور اس سے اس کے سات سوال پوچھتا ہے۔ وہ سات سوال یا سات شرطیں یہ ہیں:

(۱) ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس۔
(۲) نیکی کر دریا میں ڈال۔
(۳) کسی سے بدی نہ کر، اگر بدلی کرے گا تو بدی پائے گا۔
(۴) سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے۔

(۵) کوہ ندا کی خبر لانا۔
(۶) اس موتی کا جوڑا تلاش کرنا جو مرغابی کے انڈے کے برابر ہے۔
(۷) حمام بادگرد کی خبر لانا

ان سات سوالوں میں دوسرا، تیسرا اور چوتھا بظاہر بالکل سیدھے سادے ہیں اور ان کی نوعیت اخلاقی ہے۔ ان سوالوں کو دیکھتے ہی پڑھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال، کسی کی بدی نہ کر، اگر کرے گا تو وہی پاوے گا اور سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والے انسانوں کو زندگی میں کوئی ایسا تجربہ ہوا ہے کہ وہ اسے خود بھی یاد رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی آرزو یہ بھی ہے کہ ہر آدمی ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائے لیکن پہلے اور اس کے بعد پانچویں، چھٹے اور ساتویں سوال میں کوئی نہ کوئی انوکھی بات ہے۔

حاتم حسن بانو کا پہلا سوال حل کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اور تو کل بخدا جدھر کو منہ اٹھتا ہے چل پڑتا ہے کہ اتنے میں اسے ایک بھیڑیا نظر آتا ہے جو قریب ہے کہ ایک ہرنی کو کھا جائے۔ حاتم اسے للکارتا ہے اور ہرنی کو مارنے سے باز رکھتا ہے لیکن جب بھیڑیا کہتا ہے کہ حاتم! میں نے تیرے کہنے سے ہرنی کو تو چھوڑ دیا اب میں اپنا پیٹ کیسے بھروں تو حاتم اسے اپنے جسم سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہے اور خود زخمی ہو کر ایک درخت کے نیچے پڑ جاتا ہے۔ بھیڑیا گوشت کھا کر سیر ہو چکتا ہے تو حاتم سے پوچھتا ہے کہ تجھ پر ایسی کیا مصیبت پڑی کہ تو اس ویرانے میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ حاتم نے منیر شامی کی محبت اور حسن بانو کے سوال کا تذکرہ کیا تو بھیڑیے نے بتایا کہ میں نے بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ یہ آواز جس کا تُو نے ذکر کیا ہے دشت ہویدا سے آتی ہے۔ بھیڑیے نے یہ کہا اور چلا گیا۔

یہ حاتم کی پہلی مصیبت ہے جس میں وہ خود اپنے ہاتھوں مبتلا ہوا لیکن چونکہ اس نے یہ کام نیکی کے جذبے سے کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی مشکل آسان کرنے کی ایک صورت پیدا کر دی..... صورت یہ ہے کہ جہاں حاتم پڑا تڑپ رہا تھا وہیں گیدڑ کا ایک بھٹ تھا۔ گیدڑ عالم الغیب تھا۔ جب مادہ نے اس سے پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے تو اس نے حاتم کا سارا حال بتا دیا کہ وہ کیوں گھر سے نکلا ہے اور کس طرح اپنا گوشت بھیڑیے کو کھلا کر یوں تڑپ رہا ہے۔ گیدڑ کی مادہ نے پوچھا کہ آخر اس کا زخم کس طرح اچھا ہوگا؟ نر بولا اس کے زخم پر پری رو جانور کا بھیجا لگے تو یہ بھر آئے۔ مادہ نے پوچھا کہ وہ جانور کس طرح ہاتھ آئے تو نر نے کہا کہ اگر سات روز تک دن رات اس کی خدمت کرے تو میں جا کر پری رو کا سر کاٹ لاؤں۔ مادہ راضی ہو گئی اور گیدڑ دشت ماژندراں جا کر وہاں سے پری رو کا سر لایا۔ مادہ نے اس کا بھیجا حاتم کے زخم پر لگایا تو زخم فوراً بھر آیا۔ اس احسان کے بدلے میں حاتم نے ان گفتاروں کو مارا جو ہمیشہ گیدڑ کے بچے کھا جایا کرتی تھیں۔ گیدڑ حاتم کے اس احسان پر اتنا ممنون ہوا کہ اس نے اسے دشت ہویدا کا راستہ بتا دیا جہاں سے یہ آواز آتی تھی کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

گیدڑ نے راستہ بتاتے وقت حاتم کو یہ سمجھا دیا تھا کہ جو راستہ دور کا ہے وہ خطروں سے پاک ہے اور جو نزدیک کا ہے اس میں بے شمار خطرے ہیں لیکن حاتم نے یہ سوچ کر کہ اللہ ہر مشکل کو آسان کرنے والا ہے، نزدیک کی راہ اختیار کی اور اسے طرح طرح کے خطروں سے دوچار ہونا پڑا۔ حاتم

دور کی راہ چھوڑ کر نزدیک کی راہ اختیار کرتا ہے۔ حاتم ایک جگہ کھڑا ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ کدھر کا رُخ کرے کہ سو دو سو ریچھ سیر کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ یہ جنگل ریچھوں کا جنگل تھا اور اس پر ایک ریچھ کی حکومت تھی۔ سیر کرتے ہوئے ریچھوں نے جو حاتم کو یہاں کھڑے دیکھا تو اسے اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ریچھوں کا بادشاہ اسے دیکھ کر خوش ہوا اور کہا کہ تم ہمیں اپنا حال سناؤ۔ ہمیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تم حاتم بن طے ہو۔ حاتم نے کہا کہ تمہارا خیال درست ہے۔ میں حاتم ہی ہوں۔ اس پر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا تمہارا آنا ہمارے لیے مبارک ہے۔ اب میں اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے کروں گا اس لیے کہ جنگل میں کوئی میری دامادی کے لائق نہیں۔ حاتم یہ سن کر بہت گھبرایا لیکن بادشاہ اپنی بات کا پکا تھا۔ اس نے اپنی لڑکی کو دلہن بنایا اور حاتم کو اس کے پاس لے گیا۔ اس نے جوں ہی اس پری پیکر، رشک قمر کو دیکھا، متعجب ہو کر مجلس میں پھر آیا اور کہنے لگا ''اے خرس! تُو بادشاہ اور میں فقیر، اس شہزادی کو اپنی جورو کروں، نہایت ترک ادب ہے.....''

اس بات کو خرس حاتم کا حیلہ سمجھا، اسے بہت کچھ سمجھایا بجھایا لیکن وہ نہ مانا تو اسے ایک غار میں قید کر کے اس کا منہ سنگ خاراں سے بند کر دیا.....

(''ہماری داستانیں'' پروفیسر سیّد وقار عظیم کی کتاب سے)

پاکستان کیا ہے؟

آج کسی پاکستانی سے پوچھا جائے کہ پاکستان کیا ہے؟ تو وہ کہے گا ''پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں غربت، مہنگائی، دہشت گردی، لوڈشیڈنگ، بدامنی اور سیاہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں.....''

زندگی

ہر انسان اپنی زندگی کی مدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یہی اس کی ڈیزائن لائف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مارا نہیں جاتا تو وہ زندگی کی اس مدت کو پہنچے گا بصورت دیگر اپنے وقت سے پہلے ہی چل بسے گا۔ یہ سوال کہ کسی آدمی کی ڈیزائن لائف کس قدر ہے؟ اس کے جواب کے لیے ہنوز انسانی علم فی الحال بہت ہی محدود ہے۔ ابھی تک انسان اپنے جین (Genes) پر لکھے ہوئے پروگرام کے صرف کچھ ہی حصے پڑھنے کے قابل ہوا ہے لیکن توقع کی جا سکتی ہے کہ مزید سائنسی تحقیقات کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ ٹیسٹوں کے ذریعے انسان کی ڈیزائن لائف یعنی قدرتی مدت معلوم ہو سکے۔ قرآن کریم سے ہمیں یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ عموماً ڈیزائن لائف آج کل کی طبعی زندگی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی عمریں ہزار سال یا اس سے زیادہ تھیں مثلاً ارشاد خداوندی ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے درمیان ایک ہزار کم پچاس سال رہا پھر انہیں ایک طوفان عظیم نے آلیا اور وہ ظالم تھے۔'' (سورۃ العنکبوت، آیت ۱۴)

حضرت نوح علیہ السّلام اس طوفان سے بچا لیے گئے اور اس طرح وہ نو سو پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السّلام کی عمر بھی ایک ہزار سال سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ اس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے آغاز کے وقت آدمی کی اوسط ڈیزائن لائف ہزار برس کے قریب تھی البتہ انفرادی طور پر اس سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس فی زمانہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل اگر کوئی آدمی ڈیڑھ دو سو سال

کی حدود کو بھی چھو جائے تو وہ ایک معجزہ سے کم بات نہیں سمجھی جاتی۔ انسان کی زندگی کا کم ہوتے جانا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے جو انسان کے بدلتے ہوئے رہن سہن، بڑھتی ہوئی ذہنی الجھنوں، خوراک میں تبدیلی، موسموں کے تغیر وغیرہ کی وجہ سے ہو لیکن یہ عمل ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی وجوہات اور اسباب کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے جس کے نتیجہ میں اوسط انسانی عمر سکڑ کر ایک صدی سے بھی کم ہو گئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب بھی اگر حالات سازگار ہوں تو کبھی انسانی زندگی عمرِ نوح کو پہنچ جائے لہٰذا اگر سائنس کسی طرح آدمی کی زندگی کو لمبا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو قرآن کریم کے طالبعلم کے لیے یہ کوئی حیرانی کی بات نہ ہو گی بلکہ قدرت کی ایک منشا پوری ہو رہی ہو گی جسے انسان نے اپنی نادانیوں سے کھو دیا۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ طبعی موت سے پہلے مرنے پر بھی کسی کا کوئی ذاتی اختیار نہیں۔ دراصل انسان پر ماحول کے اندر اور باہر سے لاکھوں اوامر اثر انداز ہوتے ہیں جن کا صحیح ادراک ماسوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس ذاتِ باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی سائنسدان یا محقق موت کے وقت کا تعین نہیں کر سکتا۔ جہاں تک غیر طبعی موت کا تعلق ہے ناسازگار حالات، قدرتی آفات اور حادثات میں مرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن کلی طور پر ان اتفاقات اور امکانات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس لیے ماسوائے اللہ موت کو کوئی نہیں جان سکتا البتہ اگر ہم اللہ کی راہ میں صعوبتیں اٹھائیں، بیمار ہو جائیں، زخمی ہو جائیں یا شہید ہو جائیں تو ایسی موت پر اجرِ عظیم کے حق دار ضرور بن جاتے ہیں۔ بڑے انعام کی بات یہ ہے کہ ایسے آدمی کے لیے ڈیزائن لائف کو پہنچنے سے پہلے مرنے کی صورت میں بقایا زندگی نیکی میں شمار ہو جاتی ہے۔

ہم قصور وار وہاں ہوتے ہیں جہاں ہم جان بوجھ کر اپنی صحت کو نقصان پہنچائیں یا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں اور اس طرح دانستہ کوتاہیوں سے اپنی طبعی عمر کی حد کو پہنچنے سے پہلے ہی روح کا رشتہ زندگی سے توڑ دیں۔ یہ زندگی جیسی نعمت کی ناقدری ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے۔

(''ماوری'' اٹامک سائنٹسٹ انجینئر سلطان بشیر محمود کی کتاب سے اقتباس)

صرف عادت نہیں

برطانوی طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ کاہلی اور سُستی صرف ایک عادت نہیں بلکہ بیماری بھی ہے جو دوسری بہت سی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق ورزش اور جسمانی محنت نہ کرنے کو بھی بیماری ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ خراب صحت اور جسمانی محنت نہ کرنے میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے ڈاکٹروں کو صرف بیماری کے علاج کی نہیں بلکہ بہتر طریقے سے زندگی گزارنے کا شعور بیدار کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

چراغ تلے اندھیرا

ایک دفعہ شہنشاہ بیربل محل کی بالکونی میں بیٹھے تھے اور سورج کے طلوع ہونے کا نظارہ کر رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں دریائے جمنا کے چمکتے پانی پر پڑتی ہوئی اسے سنہری بنا دیتی تھیں۔ شہنشاہ ہر روز یہ قدرتی منظر کا نظارہ کرتا تھا۔ آج بیربل بھی شہنشاہ کے ساتھ یہ نظارہ کر رہا تھا۔

اچانک اس کی توجہ بلند آوازی سے تبدیل ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ چند چور مسافروں کو لوٹنے کے لیے بھاگ رہے ہیں اور غریب مسافر اس غم کی وجہ سے چیخ رہے تھے۔

شہنشاہ نے اپنے محافظ کو چوروں کو پکڑنے کا حکم دیا مگر چور پہلے ہی غائب ہو گئے تھے تو محافظ خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ شہنشاہ سپاہی کو خالی ہاتھ واپس آتے دیکھ کر بڑا غضبناک ہوا۔ اس سے کیا زیادہ برائی ہو سکتی ہے کہ شاہی محافظ چوروں کو نہیں پکڑ سکا جنہوں نے محل کے قریب ہی راہگیروں کو لوٹ لیا؟

شہنشاہ خوفناک انداز میں برس رہا تھا تو اس نے بیربل سے پوچھا کہ ''بیربل! یہ سب کچھ جو کچھ واقع ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نظام بہتر نہیں ہے۔ کیا یہ باعث شرم نہیں ہے؟ ایک عام آدمی شہنشاہ کے سامنے لوٹا جا رہا ہے اور شہنشاہ اس کے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کیوں ہے؟''

بیربل نے کہا کہ عالی جاہ! اگرچہ چراغ (دیے) کی روشنی اور پھیلتی ہے مگر چراغ کے نیچے ہمیشہ اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ شہنشاہ بیربل کے جواب سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مسافروں کی کچھ رقم اور کپڑے سرکاری خزانے سے دے کر تلافی کی۔ اس نے ان کی حفاظت کے لیے محافظ بھی روانہ کیے تاکہ حفاظت کے ساتھ ان کو گھر تک پہنچا آئیں۔

(''اکبر بادشاہ اور بیربل کی داستانیں''
کنور انیل کمار کی کتاب سے اقتباس)

مستشرقین

جب انسان اس وسیع و عریض کائنات کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس کائنات کی طرف مختلف تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ اس کائنات کے بالمقابل انسان کا یکطرفہ عمل یہ ہے کہ وہ اس کی حقیقت کو سمجھ لے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے انسانی تاریخ میں مختلف تہذیبوں کے اندر مختلف انداز سے کوشش کی جاتی رہی ہے۔

چونکہ مختلف تہذیبوں میں انسانی شخصیت کے مختلف تقاضے نمایاں رہے ہیں اس لیے تہذیبوں کے درمیان ایک بنیادی امتیاز بھی پایا جاتا ہے۔ جن تہذیبوں میں علم کا تقاضا غالب تھا مثلاً قدیم یونانی تہذیب، ان میں دنیا کی باقی تہذیبوں کے مقابلے میں علم اور فلسفے کا تقاضا پورا کرنے کی جدوجہد نمایاں ہے اور ان کی اس کوشش سے علوم اور فلسفے کے مختلف نظاموں کی نشوونما ہوئی۔

فلسفیانہ غور و فکر کے محرکات میں چند بنیادی محرکات یہ ہیں کہ ایک طرف انسان کے بالمقابل کائنات کا وجود ہے جو انسان میں علم اور فلسفے کا تقاضا یعنی حقیقت کو سمجھنے کی طلب پیدا کرتا ہے۔ دوسرے پہلے سے موجود حقیقت، کائنات کے بارے میں کوئی نظریہ، کائنات کی حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تیسرے اس نظریے میں کوئی پہلو اس اعتبار سے اطمینان بخش ہو کہ اس میں کائنات کی حقیقت کو واضح کرنے میں کوئی نقص باقی رہ گیا ہو یا اس دیئے ہوئے نظریے میں سوچنے والے کے اپنے روحانی تقاضوں سے کوئی پہلو متصادم ہوتا ہو اور اس بات کی ضرورت محسوس ہو کہ کائنات کا کوئی ہم آہنگ اور سازگار نظریہ مدون کیا جائے یہ سب موثرات مل کر سوچنے والے کے ذہن پر ایک بوجھ پیدا کرتے ہیں جسے رفع کرنے کے لیے فلسفیانہ مسئلے کو نئے سرے سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

فلسفیانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے انسان نے ڈھائی ہزار سال تک جدوجہد کی ہے اور فلسفیانہ فکر کو نشوونما دی ہے۔ اس کوشش میں مسلمان مضمحل ہوئے ہیں، ان کے ہاتھ سے دنیا کی علمی امامت چھن گئی ہے اور ان کے زوال کے بعد سے علم کی امامت دوسری قوموں اور تہذیبوں کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی ہے جبکہ بین الاقوامی زندگی میں یہ صورتحال ہے کہ مختلف طبقہ ہائے فکر ایک

دوسرے سے اختلاف رکھنے کی بنا پر اپنی اپنی برتری کے لیے مسابقت میں مصروف ہیں اور دوسری تہذیبوں کے فضائل کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے ان کی غلط تعبیر سے ذہنوں کو بے راہ کرنے کی ہمیشہ کوشش ہوتی رہی ہے۔ ان احوال میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل کو حل کریں اور دوسروں کی غلط نمائی اور غلط راہنمائی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہ ہونے دیں اور اپنے مستقبل کی نسبت اپنے اندر ایک اعتماد پیدا کریں تو بین الاقوامی سطح پر ہم اپنے مفاد کو بحال کر سکیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کے فلسفیانہ فکر کی نشوونما کی توجیہہ کرنے کی جو کوشش اسلام کے دشمنوں نے کی ہے اس کو سمجھے بغیر ہم اپنی جدوجہد اور اپنے فکر کا رُخ صحیح نہیں کر سکتے۔ جب سے ہم اپنے اقتدار سے محروم ہو کر استعماری طاقتوں کے زیر اثر آئے تھے اس وقت سے ہماری تہذیب کی غلط تعبیرات کر کے ہمیں بے راہ کرنے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے جسے سمجھے بغیر ہم اپنے ثقافتی مستقبل کو محفوظ نہیں کر سکتے۔

جن لوگوں نے ہماری تہذیب و ثقافت کی تعبیر اپنے نقطہ نگاہ، اپنے مفاد کی خاطر اور ہمارے نقطہ نظر کے خلاف پیش کی ہے وہ مستشرقین کہلاتے ہیں۔ مستشرقین وہ اہل مغرب ہیں جنہوں نے قدیم تہذیبوں کا مطالعہ اپنا فن بنایا چونکہ وہ تمام تہذیبیں مشرق میں پھلی پھولیں اور زوال پذیر ہوئیں۔ اس لیے ان کے شارح مستشرقین کہلائے۔

قدیم تہذیبوں کا مطالعہ اس طرح شروع ہوا کہ جب علوم فطرت اور علوم طبعی مدون ہو گئے اور مغرب کے لوگوں نے اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ حواس ذریعہ علم ہیں اور محسوسات حقیقت ہیں تو پھر دو اور مظاہر انسان کے سامنے آئے جن میں ایک انفرادی ذہن تھا اور دوسرا اجتماعی ذہن۔ انفرادی ذہن نفسیات کا موضوع قرار پایا اور اجتماعی ذہن کا مطالعہ باقاعدہ طور پر عمرانیات کے سپرد ہوا۔ اجتماعی یا عمرانی ذہن کے مظاہر قدیم تہذیبوں کے آثار باقیات کے حوالے سے ان کا مطالعہ کرنے لگے اور اس سلسلے میں مصریات اور ہندیات یعنی Egyptialogy اور Indialogy مستقل فنون کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس طرح بابل کی تہذیب کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ اسی جوش و خروش کے تحت اسلامی تہذیب کو بھی مطالعہ کا موضوع بنایا گیا۔

ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کو اسلامی ماخذ کے حوالے سے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتا اور اسلام کے بارے میں جو رائے مستشرقین کی انگریزی تصانیف سے حاصل ہوتی ہے اسے قبول کر کے اپنی تہذیب کی نسبت وہی رائے قائم کرتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اسے قائم کرانا چاہتے ہیں مثلاً مسلم فلاسفی کی تاریخ جو دو جلدوں میں ''مجلس تاریخ فلسفہ'' نے مدون کی ہے جس پر ہم نے لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں اس کے دیباچے میں یہ اعتراف موجود ہے کہ ہم مسلمانوں کے فلسفہ کی تعبیر میں deboer کے نقطہ نگاہ کو اختیار کرتے ہیں (اور deboer کا نقطہ نگاہ وہی ہے جو تمام اسلام دشمن مسلمانوں کا ہے کہ تہذیب و ثقافت میں کوئی چیز اسلام اور مسلمانوں کی نہیں) اور اس کتاب میں یہ بھی اعتراف ہے کہ ایشیا فاؤنڈیشن نے ہمیں کاغذ مفت مہیا کیا تھا۔

(''عظیم مسلمان فلسفی'' ڈاکٹر میر ولی الدین
کی کتاب سے اقتباس)

معمولاتِ نبوی ﷺ

محمد ہارون ابراہیم شیخ

ترمذی نے شمائل میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیئے تھے۔ ایک عبادتِ الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کے لیے، اور تیسرا اپنی ذات کے لیے۔

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جاءنماز پر) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا۱ (اور یہی وقت دربارِ نبوت کا ہوتا، لوگ پاس آ آ کر بیٹھتے اور آپ ﷺ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے۲) اکثر صحابہؓ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے۔ آپ ﷺ اس کی تعبیر بیان فرماتے۳ کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے۴، اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی، لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے، آنحضرت ﷺ صرف مسکرا دیتے ۵، اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے ۶۔

بعض روایات میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے، گھر جا کر دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لگاتے، دودھ پیتے ۷۔

نمازِ عصر پڑھ کر ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک ایک کے پاس جاتے، اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے۔ پھر جس کی باری ہوتی وہیں رات بسر فرماتے۔ تمام ازواجِ مطہراتؓ وہیں جمع ہو جاتیں۔ عشاء تک صحبت رہتی ۸۔ پھر نمازِ عشاء کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آ کر سو رہتے، ازواج رخصت ہو جاتیں، نمازِ عشاء کے بعد بات چیت کرنا ناپسند فرماتے ۹۔

---

۱ صحیح مسلم باب تسمہ ابوداؤد صفحہ ۳۱۸
۲ جامع ترمذی
۳ صحیح مسلم کتاب التعبیر
۴ صحیح بخاری کتاب التعبیر
۵ نسائی باب قعود فی مصلاہ
۶ بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں
۷ صحیح بخاری
۸ صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات
۹ بخاری صلوۃ العشاء

اُداسی کی قیمت

عارف محمود اپل

اُداسی طاری ہونے کے بعد عمومی طور پر انسان مستقبل میں زیادہ فائدے کی بجائے وقتی اور فوری طور پر کم فائدے کے حصول کو ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا اُداسی کی حالت میں ایسے فیصلوں سے ہر ممکن گریز کرنا چاہیے جن کا تعلق مالی معاملات سے ہو۔

انسردگی اور اُداسی کی حالت میں عمومی طور پر انسان مالیات سے متعلق دانشمندانہ فیصلے نہیں کر سکتا۔

خوشی اور اُداسی ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے لیکن شاید آپ کو یہ علم نہ ہو کہ اُداسی کی حالت میں کیے گئے فیصلے اکثر اوقات مہنگے پڑتے ہیں اور بسا اوقات ان کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ موسم اور مزاج پر کسی کا اختیار نہیں چلتا ہے۔ انسان کبھی بلاوجہ خوش ہو سکتا ہے اور کبھی مسرت کے لمحات میں بھی اس پر اُداسی طاری ہو سکتی ہے۔

کئی سائنسی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ خوشی اور اُداسی کی کیفیت دماغ کے مخصوص حصوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے تابع ہے جو اپنے خاص سگنلز کے ذریعے انسان پر اُداسی یا خوشی طاری کر دیتے ہیں۔

مارکیٹ میں بعض ایسی دوائیں اور کیمیکلز دستیاب

ہیں۔ وہ دماغ کے احساسات پیدا کرنے والے حصوں کو متاثر کرتی ہیں اور ان کے استعمال سے انسان پر خوشی یا غمی کی عارضی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ گردوپیش کا ماحول اور حالات و واقعات بھی انسان میں خوشی یا اُداسی کے احساسات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

موسموں میں تبدیلی بھی انسان کے مزاج پر اثرانداز ہو کر اس پر خوشی یا افسردگی کی کیفیت طاری کردیتی ہے۔ چنانچہ خودکشی کے اکثر واقعات سردیوں کے ان ایام میں رونما ہوتے ہیں جب کئی دنوں تک سورج نہیں نکلتا اور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

لیکن ایک حالیہ سائنسی مطالعے سے پتا چلا ہے بعض اوقات انسان کو اپنی اُداسی کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑسکتی ہے۔

امریکہ کے معروف اور قدیم تعلیمی ادارے ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہرین کی ایک ٹیم نے اُداسی کی حالت میں کیے گئے فیصلوں پر تحقیق کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اُداسی کی حالت میں مالیاتی امور سے کیے جانے والے اکثر فیصلے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

'سائیکالوجیکل سائنس جنرل' میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہرین نے اپنی تحقیق کے لیے رضاکاروں کا چناؤ کرکے انہیں دو گروپوں میں تقسیم کیا اور پھر ایک گروپ کو اُداس اور افسردہ کرنے والی ویڈیوز تواتر کے ساتھ دکھائیں، حتیٰ کہ ان پر اُداسی طاری ہوگئی۔ جب کہ دوسرے گروپ کو ویڈیوز سے دُور رکھا گیا۔

ہر گروپ میں شامل رضاکاروں کو سوال ناموں پر مبنی پراجیکٹ دیا گیا، جس کے صحیح جوابات سے انہیں مالی فوائد حاصل ہوسکتے تھے۔

ماہرین کو معلوم ہوا کہ جن افراد نے اپنے پراجیکٹس پر کام شروع کرنے سے پہلے اُداس کرنے والی ویڈیوز دیکھی تھیں، انہوں نے ایسے جوابات کا انتخاب کیا جن سے انہیں فوری فوائد تو مل سکتے تھے لیکن عمومی طور پر ان میں منافع کی شرح کم تھی اور لمبے عرصے تک اس پر کام جاری رکھنے سے نمایاں مالی نقصان ہوسکتا تھا۔

ویڈیوز نہ دیکھنے والے گروپ نے، ویڈیوز دیکھ کر اُداس ہونے والے گروپ کے مقابلے میں، نمایاں طور پر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے اپنے پراجیکٹس کے ایسے پہلو چنے جن سے انہیں بھاری منافع حاصل ہوسکتا تھا۔

اس گروپ میں شامل افراد کا انفرادی اسکور عمومی طور پر افسردہ افراد کے مقابلے میں 13 سے 34 فیصد تک زیادہ تھا۔

اس سائنسی مطالعے کی قیادت ڈاکٹر جینیفر لیرنر نے کی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سائنسی مطالعے کے لیے ایک ایسا پراجیکٹ ترتیب دیا گیا جس میں نفسیات اور معاشیات کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔

نتائج سے پتا چلا کہ افسردگی اور اُداسی کی حالت میں عمومی طور پر انسان مالیات سے متعلق دانشمندانہ فیصلے نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر جینیفر کا کہنا تھا کہ مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ اُداسی طاری ہونے کے بعد عمومی طور پر انسان مستقبل میں زیادہ فائدے کی بجائے وقتی اور فوری طور پر کم فائدے کے حصول کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ افسردگی اور اُداسی کی کیفیت اسے اپنے مستقبل سے لاتعلق سا بنا دیتی ہے اور اس کے لیے لمحہ موجود ہی سب سے اہم بن جاتا ہے۔

رپورٹ میں مشورہ دیا گیا ہے کہ اُداسی کی حالت میں ایسے فیصلوں سے ہر ممکن گریز کرنا چاہیے جن کا تعلق مالی معاملات سے ہو۔

بڑھاپے کا آغاز کب ہوتا ہے؟

نصرت شبنم

اکثر لوگوں کو بڑھاپے کا احساس تب ہوتا ہے، جب وہ پہلے ہی سے اس میں قدم رکھ چکے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے لوگ جو جوانی سے ادھیڑ عمر کی جانب قدم رکھتے ہیں، ان کے لیے اس حقیقت کو ماننا ذرا مشکل ہوتا ہے اور یہ ہی خیال کرتے رہتے ہیں کہ وہ ابھی جوان ہیں۔

دنیا بھر کے لوگوں میں بڑھاپے کے بارے میں پائے جانے والا رویہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بڑھاپے کی عمر سے متعلق پایا جانے والا عام تاثر ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا ہے بلکہ عمر کے ہر دور میں لوگوں کی رائے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ انسان کی اصل زندگی 40 برس کی عمر کے بعد ہی شروع ہوتی ہے لیکن اب یہ کہنا بھی شاید مناسب ہوگا کہ وہ اسی عمر میں جوانی سے بڑھاپے کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔

یہ بات ایک تحقیقی سروے کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی ہے۔

برطانوی حکومت کی جانب سے ایک سروے لوگوں میں بڑھاپے کی عمر کے بارے میں پائے جانے والے رویے کو جاننے کے لیے کیا گیا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ 40 سال 8 ماہ وہ عمر ہے جب ہم اپنے آپ کو جوان کہنا بند کردیتے ہیں جبکہ 59 سال 2 ماہ کی عمر میں ہم بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنا شروع کرتے ہیں۔

'ڈپارٹمنٹ فار ورک اینڈ پینشن کمیشن' کی جانب سے کرائے جانے والے اس سروے میں 2،171

مرد اور خواتین نے حصہ لیا، جن کی عمریں 16 سال سے زائد تھیں۔

ان لوگوں سے پوچھا گیا کہ ان کے خیال میں بڑھاپے کی صحیح عمر کون سی ہوتی ہے؟

سروے میں شامل مرد اور خواتین نے بڑھاپے کی صحیح عمر سے متعلق متضاد رائے کا اظہار کیا، خصوصاً خواتین کی رائے مردوں کی بہ نسبت یکسر مختلف پائی گئی۔

مردوں کا عام خیال تھا کہ 38 سال اور 6 ماہ کی عمر میں انھوں نے اپنے آپ کو جوان کہنا بند کر دیا تھا۔

اس کے برخلاف، خواتین سمجھتی ہیں کہ 42 سال اور 9 ماہ وہ عمر ہے جب انھوں نے خود کو جوان سمجھنا بند کر دیا تھا۔

زیادہ تر خواتین کے نزدیک بڑھاپے شروع ہوتا ہے 60 سال 4 ماہ کی عمر سے لیکن اکثر مردوں کی رائے میں یہ کچھ پہلے یعنی 58 سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔

خواتین اور مردوں کی رائے کا مختلف ہونا اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ مرد خود کو جلد بوڑھا محسوس کرنے لگتا ہے، جبکہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین مردوں کے مقابلے میں زیادہ عمر تک جیتی ہیں۔

سروے کا حصہ بننے والے ایسے شرکا جن کی عمر 50 سال کے لگ بھگ تھی ان کی رائے میں 46 سال کی عمر سے ادھیڑ پن کی عمر کا آغاز ہوتا ہے، اس کے برعکس 50 سال سے زائد عمر کے لوگوں کے مطابق 62 سال کی عمر سے بڑھاپے شروع ہو جاتا ہے۔

16 سال سے 24 سال کے نوجوانوں کی رائے ان تمام لوگوں کے برخلاف نکلی جن کے مطابق 32 سال کی عمر میں جوانی کی سرحد پار کر لی جاتی ہے اور بڑھاپا 54 سال کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہی سوال جب 80 سال سے زائد عمر کے افراد سے کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ 52 سال کی عمر سے جوانی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔

اعداد کے مطابق لوگوں میں بڑھاپے کے بارے میں پایا جانے والا رویہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بڑھاپے کی عمر سے متعلق پایا جانے والا عام تاثر ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا ہے، بلکہ عمر کے ہر دور میں لوگوں کی رائے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

لوگوں کا معیار زندگی اور ان کی آمدنی کا فرق بھی ان کی عمروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بے روزگار افراد کے بڑھاپے کا آغاز ملازمت پیشہ افراد کے مقابلے میں 9 سال قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کرایہ کے گھروں میں رہنے والوں کی ادھیڑپن کی عمر کا آغاز ذاتی ملکیت کے گھروں میں رہنے والوں کی نسبت پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

50 سال سے زائد عمر کے گروپ سے روس الٹمین کا کہنا تھا کہ سروے کا نتیجہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کو بڑھاپے کا احساس تب ہوتا ہے، جب وہ پہلے ہی سے اس میں قدم رکھ چکے ہوتے ہیں۔

خاص طور پر ایسے لوگ جو جوانی سے ادھیڑ عمر کی جانب قدم رکھتے ہیں، ان کے لیے اس حقیقت کو ماننا ذرا مشکل ہوتا ہے اور یہ ہی خیال کرتے رہتے ہیں کہ وہ ابھی جوان ہیں۔

سروے کے نتائج کے مطابق خواتین اور مردوں کی رائے میں بہت فرق دیکھا گیا اور ساتھ ہی نوجوانوں میں پایا جانے والا رویہ کافی پریشان کن ہے جہاں ان کی رائے کے مطابق بوڑھے لوگ معاشرے کے لیے کارآمد شہری نہیں رہتے ہیں، جو کہ ہی نہیں ہے۔

خواتین سے ان کی عمر پوچھنا کوئی مناسب بات نہیں ہوگی۔ مگر، حالیہ برسوں میں مرد اپنی آمدنی کے ساتھ ساتھ اپنی عمر بھی چھپانے لگے ہیں۔ اگر آپ ہماری بات سے متفق نہیں ہیں تو بتایئے آپ کی عمر کیا ہے؟

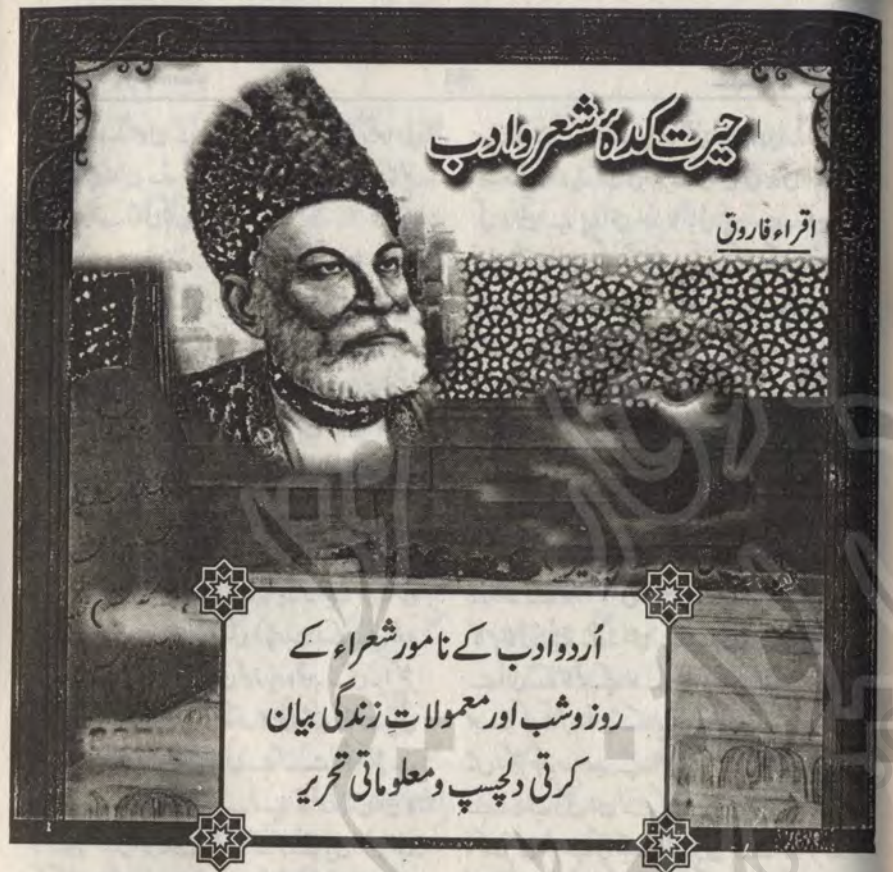

حیرت کدۂ شعر و ادب

اقراء فاروق

اُردو ادب کے نامور شعراء کے روز و شب اور معمولاتِ زندگی بیان کرتی دلچسپ و معلوماتی تحریر

ناسخ (شیخ امام بخش) اُردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اُس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے اُن کے حریف اور بامذاق لوگ پھبتی کستے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے، ورزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے۔ اس کے بعد قریب بارہ بجے کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو اُن سے ملنے آتے تھے۔ ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی۔ طبیعت میں شاعرانہ آزاد مزاجی پائی جاتی تھی مگر اس کے باوجود لوگ ان سے کثرت سے ملنے آتے تھے۔ جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے۔ خود کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدر دانوں کی قدر شناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ ان

کو دیا تھا۔ اُنھوں نے وہ رقم کسی کے پاس رکھوا دی تھی۔ چوروں نے جانا انہی کے یہاں ہے، چنانچہ رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا۔

.....

رام بابو سکسینہ اپنی تصنیف ''تاریخ ادب اُردو'' میں دلّی کے شعرا کے تذکرے میں میر عبدالحئی تاباں کے بارے میں لکھتے ہیں: ''نہایت خوبصورت خوش رُو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زبان زد تھا۔ یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ ان کے حسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اسی حسن کو دوبالا کرنے کے لیے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے حسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روئے صبیح کی زیارت کے لیے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں وفات پائی اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مے نوشی کثرت سے کرتے تھے۔ میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ شراب کی کثرت کی وجہ سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے بھی مجبور ہوکر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر (مرض کام دکھا چکا تھا اور) چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا کلام عاشقانہ، شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک، زبان بہت سلیس ہے۔''

.....

سرشار (پنڈت رتن ناتھ) عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ قوت حافظہ بہت قوی پائی تھی۔ تعصب اور مذہبی تفرقہ سے بالکل بری تھے۔ باتیں بہت دلچسپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبعاً ظریف واقع ہوئے تھے۔ شراب خوری نے اُن کے ساتھ بھی وہی کیا جو درگا سہائے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک ہونہار زندگی کا جلد خاتمہ کردیا۔ ان کی شہرت کی کمی کی بڑی وجہ اُن کی ذاتی بے پرواہی اور لاابالی پن ہے۔ اُن کی فسانۂ آزاد اور دیگر تصانیف میں اکثر جگہ رطب و یابس اور درجے سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اُس کی وجہ زیادہ تر اُن کے مزاج کی جلد بازی اور بے پرواہی کہی جاسکتی ہے۔ اُن کی شراب نوشی کبھی اُن کے تخیل میں پَر لگا دیتی اور کبھی اُس کے خمار سے اُن کا دماغ معطل اور بیکار ہوجاتا تھا۔ انہی وجوہ سے نہ وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظر ثانی کرتے اور نہ کبھی پروف پڑھنے کے عادی تھے۔ ہمیشہ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پرواہی اور بے اُصولی سے اُن کے قائم کیے ہوئے پلاٹ، اُن کے دکھائے ہوئے کیریکٹر، اُن کے بیان کیے ہوئے واقعات میں اکثر جگہ حد درجہ بے ربطگی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی ان سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور سرشار اُس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ ان میں خودداری اور آزاد روی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی۔

.....

مومن خاں، مومنؔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے اور شعر کہنے کی استعداد اُن میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جو بات سنتے، فوراً یاد ہوجاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو اُن کا موروثی پیشہ تھا، اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی اُنھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ حاصل کیا کہ اُن کی پیش گوئیاں سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔

اکثر پیش گوئیاں درست ہونے کے سبب لوگ اُن کے بہت معتقد تھے اور اکثر آئندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے۔ شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی اور دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو اُنھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ اُن کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زباں زد تھے۔ جب جوانی کی رنگینی ختم ہوگئی تو اُنھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔ جو کلام اُن کی جوانی اور آوارہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ مومن خان نہایت آزاد مزاج، قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربار داری اور خوشامد سے اُن کو سخت نفرت اور عار تھی۔ یہی اُن کے کیریکٹر کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اُن کا دیوان اُمرا کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے۔ اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اُس کے مقابلے میں دیگر شعرا و اُدباء کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستانِ سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خاطر میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہِ حقارت سے دیکھتے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔

.....

آتش (خواجہ حیدر علی) معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے۔ آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ حسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے مگر اس میں بھی بانکپن کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی۔ کبھی کسی امیر کی اُس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ کبھی کوئی شاگرد اعانت کرتا تو انکار نہ کرتے، مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔ اسّی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے بہ مشکل گزارہ ہوتا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجے کی وضع داری اور خود داری تھی۔ بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے۔

.....

رنگین (سعادت یار خان) انھوں نے فحش قصے اور حکایات کے حوالے سے شہرت پائی، بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدرآباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ گھوڑوں کی شناخت (نیک و بد) اور اُن کے علاج وغیرہ میں بھی مہارت تھی اور اس موضوع پر ایک کتاب ''فرسنامہ'' بھی لکھی۔ اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ چونکہ امیر آدمی تھے، حسین بھی تھے لہٰذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پری وشوں کے جمگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق، متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ اسّی برس کی عمر پائی۔

.....

جانصاحب (معراج میر یار علی): لکھنؤ میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ فرمانرواؤں اور اُمرا کی

محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہوگیا تھا۔ شہر کے نوجوان اُمرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے اُن کو کھلم کھلا اور بلا خوف و جھجک عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کی نظم میں بھی یہی رنگ جھلکتا تھا۔ ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں جو نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل تھیں، اُس زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ شاعری کی اس صنف کو ترقی جانصاحب کے زمانے میں ہوئی۔ یہ میر امن کے بیٹے تھے اور تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کردی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس پہن کر شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقے سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔

.....

جرأت (مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصل نام یحییٰ امان) فن شاعری کے علاوہ نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے۔ جوانی ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کو بہت طول دے کر لکھا ہے مختصر یہ کہ نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پُرلطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب شرفا اور اُمرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کردیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا۔ اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا۔ آخر کار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہوگیا۔

(تاریخ ادب اُردو.....رام بابو سکسینہ)

.....

"جگر صاحب کو گل بوٹے بنانے کا خبط تھا۔ آپ اگر خالی بیٹھے ہوں، سامنے کاغذ، پنسل، یا کوئی کتاب پڑی ہو، بس اس پر گل بوٹے بنانا یا فوراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا طغرا لکھنا شروع کردیں گے۔ آپ پر شاعری کی جب کیفیت طاری ہوتی ہے، تو یہ صورت زیادہ ہوجاتی ہے۔ یہ بیل بوٹے اور طغرے نہایت خوش نما اور دلفریب ہوتے ہیں۔ جب وہ غزل کہنے لگتے ہیں تو کاغذ پر پہلے بسم اللہ ضرور لکھتے ہیں اور فکر شعر کے ساتھ ساتھ کاغذ پر گل بوٹے بنتے چلے جاتے ہیں۔"

(محمود علی خاں جامی.....تذکرہ جگر)

.....

مشہور شاعر جگر مراد آبادی ترک مے نوشی کے بعد ایک مرتبہ لکھنؤ میں کسی قدر داں کے ہاں قیام پذیر تھے۔ انہی دنوں جوش ملیح آبادی بھی وہاں تشریف لائے اور جگر صاحب کو اپنے ہمراہ کسی دعوت میں لے جا کر ان کی توبہ تڑوادی۔

جگر صاحب بڑے نادم و شرمسار واپس اپنے میزبان کے گھر تشریف لائے اور رات بھر سجدے میں اپنی خطا کی معافی کے لیے گڑگڑاتے اور گریہ و زاری کرتے رہے۔

میزبان نے صبح کو یہ واقعہ مشہور عالم دین مولانا فرنگی محلی کو سنایا۔ مولانا نے سن کر برجستہ کہا: "اس کا مطلب ہے کہ جگر خراب ہے، دل اچھا ہے۔"

(مولانا ابوالحسن علی ندوی.....
"پرانے چراغ")

.....

"میں نے جب پہلی بار مولانا حسرت موہانی کو

دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وضع قطع بے ڈھب، جسم بے ڈول، لباس بے طور، آواز ناخوش، اُن کی ذات میں اتنا کھردرا پن نظر آیا کہ پاس جاتے ہی چھل جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ شاعرانہ بانکپن کا ان کی شکل و صورت اور رہن سہن سے کوئی واسطہ نہ تھا، بلکہ تعجب ہوتا کہ نازک خیالی اور شوخی نے اپنے ٹھکانے کے لیے کیسا اُجاڑ مکان تلاش کیا ہے۔"

(مختار مسعود.....آواز دوست)

.....

ساحر لدھیانوی کو بمبئی گورنمنٹ نے جسٹس آف پیس اور اعزازی مجسٹریٹ مقرر کیا۔ ۱۹۷۱ء میں بھارت سرکار نے پدم شری کا اعزاز دیا۔ سوویت یونین کی طرف سے نہرو ایوارڈ ملا۔ اُردو اکیڈمی مہاراشٹر نے اسٹیٹ ایوارڈ دیا۔ فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔ لیکن اس کامیابی نے اُس کی ذات کو کیا دیا، حمید اختر یوں بتاتے ہیں:

"بیماری نے اُس کے خوف میں اور اضافہ کردیا تھا۔ وہ گھر سے نکلتا ہی نہ تھا۔ رات کو بیڈ روم میں سونے کے لیے جاتا، تو اُسے یہ خیال آتا کہ رات کو دل کا دورہ پڑا، تو یہاں سے کسی کو آواز تک نہ پہنچے گی؛ چنانچہ وہ کچن سے ملے ہوئے ڈرائنگ روم میں آکر سوجاتا۔ اُسے کہیں جانا نہیں ہوتا تھا، لیکن ڈرائیور کو حکم تھا کہ وردی پہن کر صبح آٹھ بجے حاضری دے اور شام تک انتظار کرے، شاید ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت پڑجائے۔"

.....

کراچی کی ایک محفل میں جو سبط حسن نے بیچ لگژری میں سجائی تھی، جوش صاحب کا انتظار ہورہا تھا۔ میں، سبط حسن، مصطفیٰ زیدی مرحوم اور دوسرے احباب اپنی باتیں کررہے تھے۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم نے کہا: "جوش صاحب نہ جانے گھاس کو گھاس کیوں کہتے ہیں اور پھر اصرار بھی کرتے ہیں کہ یہی صحیح ہے۔ ایک دن میں اور سبط بھائی، زیڈ اے بخاری کے گھر بیٹھے ہوئے اسی گھاس اور گھاس کی بات کررہے تھے۔ ہم نے سوچا لغت دیکھنی چاہیے۔ لغت میں دیکھا تو لکھا تھا۔ "صحیح تلفظ گھاس ہے مگر گنوار اسے گھانس بھی کہتے ہیں۔"

اتنے میں جوش صاحب آگئے۔ میں نے مصطفیٰ مرحوم سے کہا: "کہہ دوں جوش صاحب سے، گنوار والی بات؟"

مصطفیٰ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "خبردار"۔

(مرزا ظفر الحسن.....
"پھر نظر میں پھول مہکے")

.....

چند روز ہوئے شیکسپیئر ہٹ میں جو ہندی طلبا کا مسکن ہے، امن کے پیامبر ٹیگور کی زیارت ہوئی۔ طلبا نے اُن کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا تھا۔ جس وقت وہ جلسے میں آئے تو میرے سامنے عمر خیام کی صورت کھنچ گئی۔ دراز قد، لمبی ڈاڑھی، بڑا زرد کرتا، اُلجھے ہوئے سر کے بال، ایک سیاہ گول ٹوپی پہنے ہوئے۔ جب تک جلسہ ہوتا رہا، فرش پر سر نیچے کیے بیٹھے رہے۔ آخر میں لوگوں نے تقریر پر اصرار کیا تو نہایت متانت کے لہجے میں آنکھیں نیچی کیے چند منٹ تک بیٹھے بیٹھے باتیں کیں۔ مجھے اُن کی باتوں میں تو سراسر بناوٹ معلوم ہوتی تھی۔

(علامہ سید سلیمان ندوی.....
مُریدِ فرنگ، لندن)

.....

مصرعۂ برجستہ

نوابان رام پور شعر و شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، شعر سنتے بھی تھے اور کہتے بھی تھے۔ ایک

دن نواب صاحب نے مصرع طرح کہہ کر شعرا کو طبع آزمائی کی دعوت دی۔ ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ موزوں طور پر شعر مکمل کرنے والے کو تحسین کے ساتھ ساتھ نقد انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ مصرع طرح یہ تھا۔ع

دیکھا ہے جس نے چاند محرم میں عید کا

ایک شاعر نے اس پر فی الفور ایسا برجستہ مصرع لگایا جس کو سن کر نواب صاحب نے باوجود شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے کے چیں بہ جبیں ہوئے بغیر داد بھی دی اور امداد بھی۔

دیکھا ہے جس نے چاند محرم میں عید کا
نواب رام پور ہے نطفہ یزید کا

(ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" اگست ۲۰۰۳ء)

....

مختصر مختصر

☆......حضرت عمر فاروق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے ہجو کہنے پر سزا رکھی تھی اور آپ نے غزلیہ اشعار میں عورتوں کا نام لینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔

☆......انگریزی کے مشہور ادیب رڈیارڈ کپلنگ کوئٹہ میں پیدا ہوئے تھے اور لاہور میں اُنھوں نے خاصی مدت گزاری۔

☆......فرانس کا مشہور ناول نگار، فلابئیر عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ لکھنے کے لیے پورا ہفتہ سوچتا رہتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جملوں میں "کامے" لگانے کے ضمن میں بھی بڑا غور کرتا تھا۔ صبح کو جو کامے لگاتا تھا، اکثر شام کو انھیں نکال دیتا تھا۔

☆......ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمٰن ہمیشہ کھڑے ہو کر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو بھی کھڑے ہو کر لکھتے تھے اور لکھنے کے لیے اپنی کندھے جتنی اونچی ڈیسک استعمال کرتے تھے۔ ونسٹن چرچل کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں وہ بھی کھڑے ہو کر لکھا کرتے تھے۔

☆......جہاں شاعر کے کلام کی خوبیوں پر فراخ دلی سے داد دی جاتی، وہاں اُس کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی جاتی۔ ریاض کا کہنا تھا کہ "زلف"، "کاکل" اور "گیسو" کے الفاظ بہت سے شعرا نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں، لیکن بہت کم شعرا ہیں جنھوں نے ان الفاظ کا صحیح استعمال کیا ہے، ورنہ جہاں "گیسو" باندھنا تھا، وہاں وہ "زلف" باندھ گئے ہیں۔ ان تینوں الفاظ کی تشریح اُنھوں نے یوں کی ہے۔ "زلف تا بہ گوش، کاکل تا بہ دوش اور گیسو تا بہ آغوش۔"

(محفوظ الحق حقی......
'علی گڑھ میں چار سال")

☆......حاتم طائی (متوفی: ۶۰۵ء) قبیلہ طائی کا ایک مشہور سردار جس کی بدوی مہمان نوازی کی بہت سی حکایات مشہور عام ہیں اور جس کی سخاوت آج تک ضرب المثل ہے۔ وہ عرب کا نامور شاعر بھی تھا۔ اسلامی دور سے کچھ عرصہ قبل فوت ہوا۔ اُس کی بیٹی سَقانہ عروج اسلام کے زمانے میں گرفتار ہو کر دربار نبوت میں پیش ہوئی تو اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے باپ کی فیاضیوں اور جُود و کرم کا تذکرہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے رہا کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ حاتم، اسلامی اخلاق کا حامل تھا۔ حاتم کا دیوان پہلی دفعہ رزق اللہ حسون نے لندن سے ۱۸۷۲ء میں شائع کیا۔ ۱۸۹۷ء میں اُس کا ترجمہ جرمن زبان میں چھپا۔

....

زبیدہ آپا

ماہر کک، کامیاب ٹوٹکے اور 4 ہزار ٹی وی شوز کی میزبان

ایمان خان

کپڑوں پر تیل کے داغ لگ جائیں تو کیا کریں؟ فریج میں کسی قسم کی مہک بس جائے تو اس کا کیا حل ہے؟ اور بچوں کے پیٹ یا 'کان میں درد ہو تو کیا ٹوٹکا آزمایا جائے؟' آج کی خواتین ان مسئلوں سے نمٹنے کے لئے 'زبیدہ آپا' کے ٹوٹکے آزماتی ہیں۔

....

انھیں پاکستان کا ہر گھرانہ جانتا ہے اور اِس شہرت کی وجہ اُن کے وہ ٹوٹکے ہیں جو زبیدہ آپا ٹی وی کے اکثر 'پکوان شوز' یا 'مارننگ شوز' میں سب کو بتاتی ہیں۔

کپڑوں پر تیل کے داغ لگ جائیں تو کیا کریں؟ فریج میں کسی قسم کی مہک بس جائے تو اس کا کیا حل ہے؟ اور بچوں کے پیٹ یا 'کان میں درد ہو تو کیا ٹوٹکا آزمایا جائے؟' یہ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں جو پاکستان کی کم و بیش ہر خاتون خانہ کو درپیش ہوتے ہیں۔ پہلے کی خواتین اِن مسائل کے حل کے لئے پریشان ہوتی ہوں تو ہوں، آج کی خواتین ان مسئلوں

سے نمٹنے کے لئے 'زبیدہ آپا' کے ٹوٹکے آزماتی ہیں۔

زبیدہ طارق، عرف زبیدہ آپا، وہ شخصیت ہیں جن کو پاکستان کا ہر گھرانہ جانتا ہے اور اِس شہرت کی وجہ اُن کے وہ ٹوٹکے ہیں جو زبیدہ آپا ٹی وی کے اکثر 'پکوان شوز' یا 'مارننگ شوز' میں سب کو بتاتی ہیں۔

مسز زبیدہ طارق نے لگ بھگ 18 سال پہلے کوکنگ ایڈوائزر کی حیثیت سے شوبز میں قدم رکھا اور اپنے کوکنگ شوز کے ذریعے اس قدر ہردلعزیز ہوئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک فیملی ممبر کی حیثیت اختیار کرگئیں۔ چونکہ، وہ بہت اچھی کُک بھی ہیں لہٰذا اُن کی بتائی ہوئی کھانوں کی ترکیبیں کس گھر میں استعمال نہیں ہورہیں۔

زبیدہ طارق جس فیملی سے تعلق رکھتی ہیں، پاکستان کی مایہ ناز مصنفہ فاطمہ ثریا بجیا، منفرد لہجے کی شاعرہ زہرہ نگاہ اور ہر خاص و عام میں مقبول قلمکار، شاعر، مزاح نگار، مصور اور اداکار انور مقصود بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جی ہاں، زبیدہ طارق انہی نامور شخصیات کی سگی بہن ہیں۔ دس بہن بھائیوں میں زبیدہ آپا کا نواں نمبر ہے۔

زبیدہ طارق کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے عمر کے پچاس سال گھر کی چار دیواری میں رہ کر گزارے اور اس کے بعد جو ایک مرتبہ ٹی وی پر آئیں تو پھر چھاتی چلی گئیں۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر مختلف انٹرویوز کے دوران انہوں نے جو ذاتی معلومات لوگوں سے شیئر کی ہیں ان کے مطابق، 'میرے میاں ایک معروف ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھے، آئے دن گھر میں سو، ڈیڑھ سو افراد کی دعوتیں ہوتی تھیں۔'

وہ کہتی ہیں کہ، 'مجھے کھانا پکانے کا شوق تھا۔ لہٰذا، اچھے کھانے پکایا کرتی تھی۔ ان بڑی بڑی دعوتوں کا انتظام ہمیشہ میں نے خود سنبھالا، کبھی کسی کیٹرنگ سروس سے مدد نہیں لی۔ اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی والدہ اور نانی سے بہت کچھ سیکھا تھا، پھر تجربات کا شوق بھی تھا۔ لہٰذا، میرے بنائے ہوئے کھانے سب کو پسند آتے تھے۔'

وہ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے مزید کہتی ہیں، 'کھانا پکانے کا ہنر میرے کام آیا اور جس دن میرے شوہر ریٹائر ہوئے، اس سے اگلے دن میں نے اسی کمپنی میں ایڈوائزری سروس کی انچارج کی حیثیت سے کام سنبھال لیا۔ وہاں میں نے آٹھ سال تک کام کیا، 'تقریباً سارے ہی نجی ٹی وی چینلز سے کوکنگ شوز، ٹاک شوز اور مارننگ شوز کیے، ان کی تعداد تقریباً 4000 بنتی ہے۔'

ویڈیو گیمز کی عادت جان لیوا ہوسکتی ہے

ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ ویڈیو گیمز کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی عادت آپ کی جان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس کی حالیہ مثال بنکاک میں دیکھنے کو ملی جہاں ایک 24 سالہ شخص ساری رات ویڈیو گیمز کھیلتے رہنے کی وجہ سے جان کی بازی ہار گیا۔ پولیس حکام کے مطابق وہ شخص گیمز کا اس قدر شوقین تھا کہ دن دیکھتا نہ رات اور کرسی پر بیٹھا ویڈیو گیمز کھیلتا رہتا۔ چنانچہ جب اس کی موت واقع ہوئی تو اس وقت بھی وہ کرسی میں دھنسا گیمز کنٹرول ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ ٹیلی ویژن سکرین پر گیم چل رہی تھی مگر وہ خود زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

(مرسلہ: ضیغم بٹ، لاہور)

☆☆☆

میری بی بی جان

جاوید راہی

ایک روز بی بی جان دوپہر کو آئیں۔ میری والدہ کا ایک سوٹ ہم دونوں بہن بھائیوں کے کپڑے اور جاتے ہوئے پانچ روپے کے سکے بطور عیدی دے گئیں کہ ہمارا باپ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بی بی جان کے جانے کے بعد میری والدہ بی بی جان کی اس مہربانی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں......

ایک باوقار خاتون کی کہانی جو دوسروں میں محبت بانٹنے کا عزم کیے ہوئے تھیں

میں اس وقت غالباً تیسری چوتھی جماعت میں تھا جب ہم کچہری بازار کے چوباروں میں سے ایک میں رہائش پزیر تھے اور میں سارا دن اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتا تھا۔ محمد یامین اور راقم الحروف ہم جماعت تھے۔ بھائی محمد جمیل (مرحوم)، بھائی مبین (مرحوم) بھائی خلیل (مرحوم)، اور بھائی جلیل جو اس وقت چڑی ہوا کرتے تھے ان سے تو بھائیوں کا رشتہ نوعمری تک کا تھا مگر عبدالحمید جج سے واقفیت اس وقت ہوئی جب یہ لوگ مرحوم بھائی محمد مبین کے بعد پاکستان لوٹے اور پریس کلب کے رکن نامزد ہوئے۔ میں نے منیر چوہدری سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے تو انہوں نے بتایا کہ بھائی مبین کا سب سے چھوٹا بھائی جج ہے۔ پھر اس سے وہ تمام پرانے رشتے قائم ہوگئے جو روٹی روزی کے چکر میں گرد آلود ہوچکے تھے۔

آنا جانا شروع ہوا تو پھر بھائی محمد یامین اور

بھائی محمد جلیل سے بھی رابطہ ہو گیا۔ بی بی جان اور جج کے والد محترم صوفی غلام علی کی بے شمار یادیں جو ذہن کے اندر تہہ در تہہ جمی ہوئی تھیں وہ ایک ایک کر کے اُجاگر ہونے لگیں۔ کچہری بازار ماضی کا قصہ خوانی چوک پشاور کا سماں پیش کرتا تھا۔ گول چوک مسجد اس وقت تعمیری مراحل سے گزر رہی تھی۔ رحمت بیکری والی سائیڈ پر کرش، بجری، سریا اور پیپل کے درختوں کا جھرمٹ ایک طرف ٹھڑوں اور چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں لوگ اس وقت کاروبار کرتے تھے۔ مرحوم صوفی غلام علی صاحب کی دکان بھی ان ہی دکانوں میں تھی۔ بھائی محمد جمیل بھائی محمد یامین بھائی محمد مبین بھائی محمد خلیل بھائی محمد جلیل بھائی اور میں ایک ساتھ سارا دن کچہری بازار سے مسجد گول چوک تک کھیلتے پھرتے تھے۔

بی بی جان کو ان دنوں کچہری بازار کی معزز خاتون ہونے کے ناطہ آس پاس کے گھروں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ میں اپنی دادی پھوپھی اور اپنی ماں جنہیں ہم سب بھی بی بی جی کہتے تھے کے ہمراہ اس وقت نور حلوائی اور آٹے والی چکی جو شاہد مرحوم، اسلم کیلا..... کونسلر کے الیکشن میں جن کا انتخابی نشان کیلا تھا اور پھر وہ اسی نام کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ کام کے اعتبار سے ٹرانسپورٹر تھے اور پرانی ناکارہ بڑی گاڑیوں کو نئے سرے سے بنا کر خود بھی چلاتے اور قسطوں پر بھی دیتے۔ بھلے مانس اور شریف النفس انسان تھے۔ چکی اور نور حلوائی کے درمیان اوپر والے بڑے چوبارے میں ان دنوں صوفی غلام علی صاحب کی رہائش تھی۔ چونکہ میری دادی اور پھوپھی اور بی بی جان کا آپس میں ایسا رشتہ تھا جیسے ایک ہی گھر کے مکین ہوں چنانچہ سارا سارا دن بی بی جان کے گھر ہے اور اکثر کھانا وغیرہ بھی ادھر ہی کھاتے۔ میں سکول سے جلد واپس آنے کوشش کرتا کہ بھائی محمد یامین کے ساتھ رہوں کیونکہ بی بی جان کھلے دل کی خاتون تھیں اور کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دیتیں اور جاتے ہوئے کٹوری میں جو کچھ پکا ہوتا وہ میری پھوپھی کے لئے ضرور میرے ہاتھ بھجواتیں۔

بی بی جان کی ساری توجہ اور شفقت اس وقت ہم پر نثار ہو گئی جب والد صاحب دادا جی سے جھگڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ میں اور میری چھوٹی بہن اس صورت حال سے بہت دلبر داشتہ ہوئے کیونکہ ہم دونوں اپنے والد جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے، بہت مانوس تھے۔ بی بی جان اکثر میری والدہ کی دل جوئی کرنے آجاتیں تھیں۔

عید الفطر میں چند روز رہ گئے تھے، ایک روز بی بی جان دوپہر کو آئیں۔ میری والدہ کا ایک سوٹ ہم دونوں بہن بھائیوں کے کپڑے اور جاتے ہوئے پانچ روپے کے سکے بطور عیدی دے گئیں کہ ہمارا باپ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بی بی جان کے جانے کے بعد میری والدہ بی بی جان کی اس مہربانی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور سب کچھ لے کر دادا جی کے پاس پہنچیں تو صوفی غلام علی جو میرے دادا کے بہت گہرے دوست تھے، انہوں نے فخر سے کہا کہ مجھ میں اور صوفی صاحب میں کیا فرق ہے۔ آخر یہ میرا یار ہے۔ میرا سب کچھ ہے۔

بی بی جان مجھے بھی اپنے بچوں جیسا ہی پیار عطا کرتی تھیں۔ شام تک میرے حصہ کا سالن پڑا رہتا۔ جلیل جو اس وقت چڑی ہوا کرتا تھا ملتا تو مجھے بی بی جان کا پیغام دیتا کہ تمہارا سالن پڑا ہے جا کر لے آنا۔ جب تک کم سنی کا دور رہا میری بی بی جان، میری ماں جیسا ہی سلوک کرتیں رہیں پھر ہم لوگ کچہری بازار کو خیر باد کہہ کر شورہ کوٹھی (محلہ علی پورہ) اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے۔

کبھی کبھار بی بی جان دادی پھوپھی کے ہمراہ میری والدہ کی خیر خیریت پوچھنے آجاتیں تو ہم دونو ں بہن بھائی خوشی سے پھولے نہ سماتے کہ آج بی بی جان ہمارے گھر آئی ہیں۔ انہیں ہمارا ذاتی گھر اس لحاظ سے بھی پسند تھا کہ ہم ادھر کرایہ پر رہتے تھے۔ جاتے ہوئے بی بی جان ہم دونوں بھائی بہن کو ایک ایک اکنی ضرور دیتیں پھر ہم سب لوگ بچپن کو خیر باد کہہ کر اپنے اپنے معاملات میں اُلجھ گئے۔ بڑے حاجی صوفی غلام علی صاحب بھائی محمد جمیل بھائی محمد مبین دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ جب بی بی جان تقریباً اسی سال کی رفاقت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہوئیں تو ندیم بھائی کا پیغام ملا کہ عبدالحمید جج سابق صدر پریس کلب اوکاڑہ کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں ہیں ان کی نماز جنازہ..... اس کے آگے میری آنکھیں بے اختیار نکلے آنسوؤں کے باعث کچھ پڑھ نہ سکیں تو میں نے موبائل آف کر دیا۔ میری اپنی بی بی جان جو مرحوم بھائی محمد جمیل، بھائی محمد یامین، مرحوم بھائی محمد مبین، بھائی محمد خلیل بھائی محمد جلیل اور بھائی عبدالحمید جج جس کو میں بیٹا ہی کہتا ہوں ان کی ہی بی بی جی نہیں میری بھی بی بی جان تھیں۔

وہ اپنی ان گنت خوبیاں اور یادیں چھوڑ کر ہم سب کو سوگوار کر گئیں اللہ تعالیٰ جنت میں ان کو بلند مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین

چاند کی سیر کیلئے ٹکٹوں کی فروخت کا آغاز

ناسا کے سابق افسران ایک نجی فرم قائم کر کے لوگوں کو چاند پر بھجوانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ تاہم اس کے لئے چاند پر جانے کے خواہش مند افراد کو مہنگی ٹکٹ خریدنا ہو گی۔ گولڈن سپائک نامی کمپنی ڈیڑھ بلین ڈالر کا پیکج آفر کر رہی ہے جس کے تحت دو افراد کو چاند پر بھجوانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ چاند پر جانے والا محض سیر کے لئے جائے یا تحقیق وغیرہ کے لئے کمپنی کو محض ٹکٹ کی قیمت سے غرض ہے۔

کمپنی عہدیداران کے مطابق وہ 2020ء تک کم از کم چاند پر بیس دورے کرنے کا ہدف مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

ناسا نے قریب چالیس برس پہلے چاند پر آخری مشن بھیجا تھا اور روس کے ساتھ ''خلائی جنگ'' میں فتح کے بعد امریکی حکومت کی طرف سے دوبارہ کبھی اس ضمن میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ صدر اوباما نے بھی ناسا کے چاند پر جانے کے مشن کو منسوخ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم وہاں جا چکے ہیں اور یہ کارنامہ کئی بار انجام دے چکے ہیں۔ لہٰذا اس میں اب کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں رہ گئی۔ تاہم گولڈن سپائک کمپنی نے ان دیگر ممالک سے کامیاب مذاکرات کئے ہیں جو چاند پر تحقیقاتی مشن بھیجنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کمپنی ترجمان کے مطابق جنوبی افریقہ، جنوبی کوریا اور جاپان خاص طور پر اس طرح کے مشن بھیجنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

مشن کو کمرشل بنیادوں پر کرنے کے حوالے سے کمپنی ترجمان کا کہنا ہے کہ چاند پر جانے کا خواب اکثر لوگ دیکھتے ہیں اور ہم اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر کوئی اس کا خرچ برداشت کر سکتا ہے تو ہمیں اسے ساتھ لیجانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کمپنی نے ٹکٹوں کی فروخت کا آغاز کر دیا ہے۔

(عمران رؤف۔ فیصل آباد)

.....☆☆☆.....

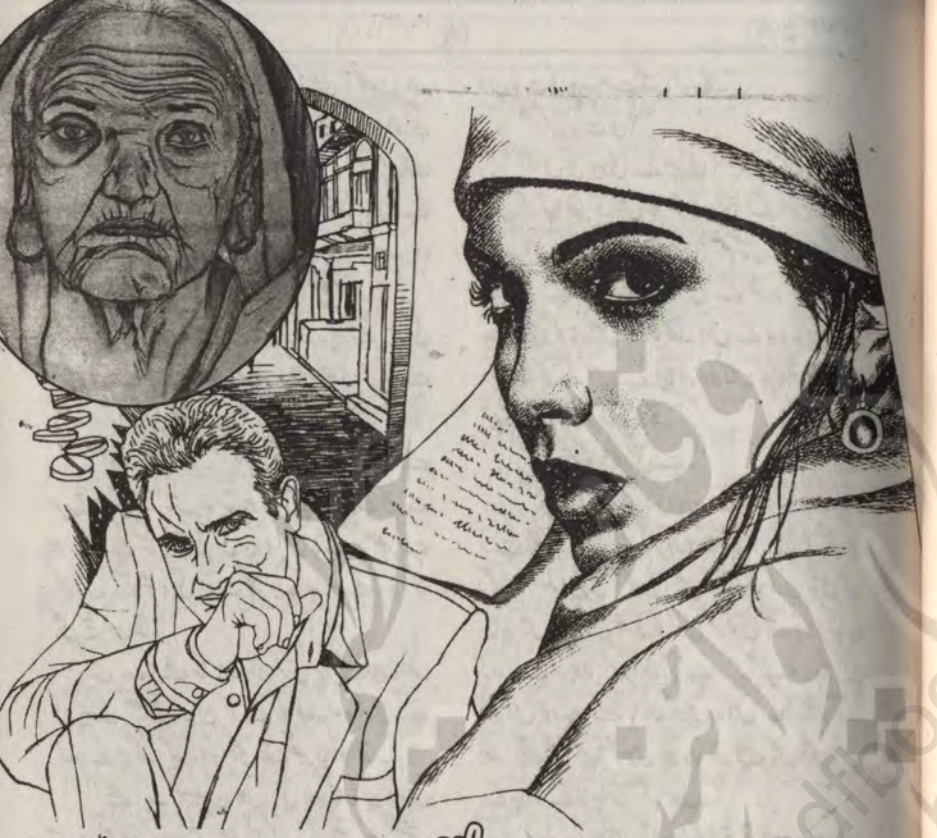

جادو

فوزیہ ظہیر

وہ کوئی چیز اُٹھانے کے لیے اُٹھی، پہلی نظر میں میں سمجھا کہ وہ چھڑی ہے پھر میں نے دیکھا وہ چیز حرکت کر رہی ہے، وہ ایک سانپ تھا۔ مجھے کمرے سے سرسراہٹ کی آوازیں آنے لگیں پھر وہ ایک گونج میں تبدیل ہو گئیں جیسے ناراض روحیں میرے گرد گھوم رہی ہوں۔ خوف سے میرے جسم کے بال کھڑے ہو گئے!

ایک پُراسرار قتل کی داستان، مشتبہ قاتل عملیات کی دُنیا کی ملکہ تھی

موجودہ جدید سائنسی دور میں کسی کی موت کا سبب کبھی جادو نہیں مانا جاتا لیکن انسپکٹر سلمان نے پولیس ہیڈ کوارٹر سے جو رپورٹ بھیجی ہے اس کیس میں موت کا سبب جادو ہے۔ میں گزشتہ بیس سال سے ایک بڑے شہر میں قتل کی تفتیش کے محکمہ میں کام کر رہا ہوں۔ چوری چکاری، خاتون کا پرس چھین کر بھاگنا، منشیات کا کاروبار وغیرہ چھوٹے چھوٹے کیس ہیں جن میں مجرم دوسرے ہی دن سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے۔ ایسے کیس میں اپنے جونیئر سلمان کو دے دیتا ہوں۔ دو ماہ پہلے میں نے قتل کا محکمہ اس کے

سپرد کیا ہے۔ وہ روشن چہرے، ذہین آنکھوں اور چوڑے شانوں والا نوجوان ہے۔ میری موجودگی میں بہت مؤدب رہتا ہے۔ اس کیس کی رپورٹ دیکھ کر میرا دماغ غصہ سے جھنجھنا اُٹھا۔ میں نے سلمان کو اپنے آفس فوری طور پر بلوا بھیجا۔ وہ بدحواسی کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا۔

''یہ کیا ہے سلمان؟'' میں نے رپورٹ اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہے یہ؟..... کیا یہ کوئی لطیفہ ہے؟''

''اوہ! نہیں سر۔'' اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوگیا۔ ''میں جانتا ہوں آپ کو بہت حیرت ہو رہی ہے لیکن متوفی کی بیوہ اس بات پر مصر ہے کہ اس کے شوہر کی موت کا سبب جادو ہے۔ ڈاکٹر بھی حیران تھا۔''

میں نے اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے اور واقعہ کی پوری تفصیل بیان کرنے کو کہا۔ وہ کرسی کے کنارے پر ٹک گیا۔ وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا۔

''مجھے ایک نیبفون کال آئی اور گارڈن ٹاؤن میں واقع ایک گھر میں متوقع قتل کے کیس کی تفتیش کرنے کی درخواست کی گئی۔ وہ بہت بڑا محل نما گھر ہے سر۔''

''گارڈن ٹاؤن کے سب گھر بڑے ہی ہوتے ہیں سلمان۔ بات کو مختصر کرنا سیکھو۔ آگے بولو۔''

''سوری سر! ان بڑے گھروں میں سے ایک بڑا..... اوہ..... گھر جو برنس روڈ پر واقع ہے ہم وہاں پہنچے تو مقتول کی پریشان حال بیوی نے دروازہ کھولا۔ وہ ہمیں اوپر ماسٹر بیڈ روم میں لے گئی جہاں بستر پر اس کا شوہر لاش کی حالت میں پڑا تھا۔ وہاں جدوجہد کے کوئی نشانات نہیں تھے۔ کسی بات سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ قتل کیا گیا ہے یا غیر طبعی موت مرا ہے۔ ان کا فیملی ڈاکٹر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ بھی اس بات کی وضاحت نہیں کر سکا۔''

''کس بات کی؟''

''اس کی بیوی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا کہ اس کا شوہر جادو کے اثر سے مرا ہے۔ اس کی یہ بات مجھے بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کہتی ہے ایک ماہ قبل اس کے شوہر نے ایک جادوگرنی کو ناراض کر دیا تھا۔ اس نے بددعا دے کر کہا تھا کہ اگر اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا تو وہ ایک مہینہ کے اندر مر جائے گا۔''

''وہ وہم کا شکار لگتی ہے۔''

''جی سر! اور پھر اسی دن کے بعد سے وہ بیمار رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا اور بالآخر ختم ہو گیا۔'' سلمان کی آنکھوں میں اُمید کی کرن چمکی کہ شاید میں بھی اس فلسفہ کو قبول کر لوں گا۔ وہ دوبارہ زور دے کر بولا ''میرا خیال ہے سر کہ آپ خود جائیں اور اس عورت سے بات کریں۔ اس سے ملنے کے بعد مجھے بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بھی اس کے جادو کے زیر اثر آ گیا ہوں۔''

''سلمان پولیس آفیسرز کو اتنا توہم پرست اور ڈرپوک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ انہیں بدترین حالت کی مسخ شدہ لاشوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

اس نے شرمندہ ہو کر کہا ''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔''

میں اپنی کرسی سے اُٹھا اور کہا ''اس وقت تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم دوبارہ وہاں جاؤ۔''

''میں سر.....؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس کو بدحواس دیکھ کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ''ہاں تمہیں ابھی فوراً وہاں واپس جانا ہوگا ورنہ..... تمہیں نوکری سے معطل کر دیا جائے گا..... اور ہاں تم میرے لیے ڈرائیو کرو گے۔''

میرا پہلا جملہ سن کر اس کے چہرے کا رنگ اُڑ

گیا لیکن دوسرا جملہ سُن کر اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ اس نے بے اختیار پوچھا ''سر کیا آپ بھی میرے ساتھ جائیں گے؟''

''ہاں بھئی کیوں نہیں؟ میرا بھی ہنسنے قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا سر کہ آپ کی یہ خواہش پوری ہو گی۔'' سلمان نے آہستہ سے کہا اور آفس سے نکل گیا۔

ایک گھنٹہ کے بعد ہم نادر پیلس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ نادر خان کا نام میرے لئے نامانوس نہیں تھا۔ اخباروں میں اس کا نام چھپتا رہتا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بڑا بزنس مین تھا اور کاروباری حلقوں میں جانی مانی شخصیت تھا۔ اس کے محل نما مکان میں بہت خوبصورت باغ تھا جو گھنے سایہ دار درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ سلمان نے ایک درخت کے نیچے کار پارک کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''شکر ہے یہاں درخت ہیں۔ اب واپسی میں گاڑی تندور کی طرح گرم نہیں ملے گی۔''

میرا خیال تھا کہ داخلی دروازہ کوئی ملازمہ کھولے گی لیکن وہاں مسز خان تھی جو بہت نازک اندام اور خوبصورت تھی۔ وہ اُداس ہونے کے باوجود بہت باوقار لگ رہی تھی۔ اس نے سفید قیمتی لباس کے ساتھ اس سے ہم آہنگ سچے موتیوں کے نقرئی آویزے کانوں میں اور گلے میں سچے موتیوں کی سفید مالا پہنی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک عورت جس کا شوہر مر گیا ہو اس کو اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں ایس پی صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ آیئے اندر آیئے اور انسپکٹر سلمان تم بھی آؤ۔ کیا میں آپ دونوں صاحبان کو ایک گلاس کولڈ کافی یا لیمونیڈ پیش کروں؟'' اس نے بڑے مہذب طریقے سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔ شکریہ محترمہ۔'' میں نے ہال کی خوشگوار ٹھنڈک میں اُترتے ہوئے کہا۔ ہم ہال سے گزرتے ہوئے ایک خوبصورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں پہنچے جس کا فرنیچر پرانی مہاگنی کا بنا ہوا تھا۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر مضبوط جسم، چوڑے شانوں اور گھنی ابروؤں کے نیچے ذہین چمکیلی آنکھوں والے شخص کی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً نادر خان کی تصویر تھی۔

''آپ کے پاس کوئی ملازمہ نہیں ہے مسز خان؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیس لگا خوبصورت رومال تھا۔ اس نے اسے اپنے منہ پر رکھ لیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''یہاں جو کچھ ہوا وہ اس سے بہت خوفزدہ ہو گئی تھی اور کہتی تھی مجھے یہاں ہر طرف روحیں گھومتی محسوس ہوتی ہیں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں نے اسے جانے دیا لیکن میں خود بھی یہاں عجیب سی بے چینی اور خوف محسوس کر رہی ہوں۔''

میں نے اسے ہمدردی اور ترحم کی نظر سے دیکھا ''جادو..... مسز خان! آپ کو کس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آپ کے شوہر کی موت سفلی عمل سے ہوئی ہے؟''

''اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' اس نے مجھے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ ''وہ اس عورت سے ملا۔ اس نے اسے بددعا دی اور وہ مر گیا۔ جیسا اس نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔''

''واہ کیا بات ہے..... آپ ذرا سا پس منظر بتائیں گی؟ آپ کس عورت کی بات کر رہی ہیں؟''

وہ ذرا سا رُک کر مخاطب ہوئی ''نادر دریا کے اس پار تک زمین کے مالک تھے۔ یہ ذرا سیم خوردہ زمین ہے جو کسی بھی چیز کی کاشت کے لیے مفید نہیں

ہے۔ میرے شوہر نے اس کے باوجود مذکورہ زمین استعمال میں لانے کا فیصلہ کیا لیکن دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر کچھ جھونپڑیاں ہیں جن میں سے ایک میں یہ بوڑھی عورت رہتی ہے۔ اس نے وہاں سے ہٹنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے غیر قانونی طور پر اس زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ نادر اس کو سمجھانے کے لیے اس کے جھونپڑے میں گئے لیکن وہ جگہ خالی کرنے کی درخواست پر بپھر گئی اور بولی اگر تم خالی کرانے کی ضد پر قائم رہے تو بہت پچھتاؤ گے۔''

''پھر آپ کے شوہر نے کیا کہا؟''

''ظاہر ہے وہ ہنس پڑے اور اس عورت سے کہا کہ میں اس زمین پر بل ڈوزر پھروا رہا ہوں اور مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی کہ تم جھونپڑی کے اندر ہو یا باہر۔''

''لیکن تمہارے شوہر نے اس عورت کی دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ٹھیک؟''

''یقیناً ایسا ہی ہوا۔ اس کی دھمکی کا نادر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جادوٹونے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ گھر آئے اور مجھے پورا واقعہ سنایا اور غصہ سے بولے بیوقوف بوڑھی چڑیل ..... اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے جادوٹونے کی بکواس سے ڈر جاؤں گا تو یہ اس کی بھول ہے.....' نازیبا الفاظ استعمال کرنے پر مجھے معاف کرنا لیکن وہ ایسے ہی تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک پارسل آیا جس میں گڑیا تھی۔'' اس نے خلا میں وحشت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور دوبارہ رومال منہ پر رکھ لیا۔

''جادو کی گڑیا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھی اور اندر غائب ہوگئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چیز تھی۔ کپڑا کھولنے پر اس میں سے ململ کے کپڑے کی بنی ہوئی ایک معمولی سی گڑیا نکلی جس کے چہرے پر کوئی نقش و نگار نہیں تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ گڑیا کے جسم میں دل، پیٹ اور حلق کے مقام پر سرخ گھنڈی والی سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کا معائنہ کر کے اسے سلمان کو پکڑا دیا۔ سلمان کا چہرہ یک دم متغیر ہوگیا۔ اس نے سہم کر اسے پکڑ تو لیا لیکن تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اسے چھونا بھی نہیں چاہتا۔

''میں اسے کہیں دُور لے جا کر پھینک دینا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں میں ایسا نہیں کر سکی۔ مجھے لگا ایسا کرنے سے کہیں کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ میں نے اسے نادر سے بھی چھپایا کہ کہیں وہ پریشان نہ ہو جائیں۔''

''اس واقعہ کو کتنا عرصہ بیت گیا؟''

''تقریباً ایک ماہ ہوگیا۔ اس عورت نے نادر سے کہا تھا تم ایک مہینہ کے اندر اندر مر جاؤ گے اور ایسا ہی ہوا۔''

''کیا متوفی ابھی بھی اوپر ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''بہتر ہے آپ مجھے اوپر لے چلیں۔ میں لاش کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہمیں گھومتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر اپنے شاندار بیڈ روم میں لے گئی۔ کھڑکیوں پر بھاری مخملی پردے گرے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں نے بجلی جلائی، بستر پر پڑا ہوا شخص پُرسکون نیند کی سی حالت میں تھا لیکن جس طرح وہ اپنی تصویر میں چوڑا چکلا اور مضبوط نظر آتا تھا ویسا نہیں تھا بلکہ

سمٹ کر مختصر ہو گیا تھا۔

''آپ کے شوہر بہت کمزور نظر آ رہے ہیں۔ ویسے نہیں ہیں جیسے تصویر میں ہیں۔''

''جب سے اس عورت نے بددعا دی وہ میری آنکھوں کے سامنے پگھلتے چلے گئے۔''

''کیا وہ کھانا نہیں کھاتے تھے؟''

''کھانا تو کھاتے تھے لیکن وہ حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا اور انہیں قے ہو جاتی تھی۔ ان کی یہ حالت اس عورت سے ملاقات کے دوسرے دن سے ہی ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ اپنے پیروں پر بھی نہیں کھڑے ہو سکتے تھے۔''

''آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟''

''ہاں اس نے کہا شاید یہ کوئی وائرس ہے۔ اس نے ان کی بیماری کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔''

''میرا خیال ہے یہ ہارٹ اٹیک تھا جس نے ان کی جان لے لی۔''

''ڈاکٹر بھی یہی کہتا ہے۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ پھر انہیں دل کے مرض کی بھی شکایت ہو گئی..... عارضۂ قلب ان کو پہلے بھی تھا لیکن اب شدّت بڑھ گئی تھی۔ وہ پہلے بھی اس مرض کی دوائیں لے رہے تھے۔ اب دواؤں کی طاقت بڑھا دی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے نادر سے بہت کہا کہ اس عورت کے پاس جا کر معافی مانگ لیں لیکن وہ بہت ضدّی تھے۔ اپنی زندگی داؤ پر لگا دی لیکن معافی نہیں مانگی۔''

پھر وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ میں نے بستر پر پڑے آدمی کو دیکھا اور اپنا گلا صاف کر کے کہا ''مسز خان مجھے آپ کے شوہر کی موت کا افسوس ہے لیکن آپ جس طرح سوچ رہی ہیں مجھے اس پر یقین نہیں ہے اور نہ ہی پولیس اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہے۔''

وہ مجھ پر برس پڑی ''اس عورت کو گرفتار کرو اور اس کو اس کے کیے کی سزا دو۔'' اس نے غصّہ سے کہا۔

میں نے اپنی مسکراہٹ کو مشکل سے دبا کر کہا ''مسز خان! آپ ایک سمجھدار اور تعلیم یافتہ خاتون لگتی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ بھی جانتی ہیں کہ دُنیا میں کوئی عدالت ایسی نہیں ہے جو جادو سے مارنے والے کو گرفتار کر سکے۔ عدالت کو ثبوت چاہیے۔''

''قانونی کتابوں میں یہ بات درست ہے لیکن یہاں حقیقت کچھ اور ہے۔ تم نے پہلے میرے شوہر کو دیکھا ہوگا۔ وہ ایک مضبوط، طاقتور، شعلہ صفت جھگڑالو انسان تھا..... زندگی سے بھرپور..... اس کو اس عورت کی بددعا کھا گئی۔ وہ اس کی بددعا کے بعد سے موم بتی کی طرح پگھلنے لگا اور آخر موت کی دہلیز پر پہنچ گیا۔''

''اس طرح تو بہت سے لوگ غصّہ میں کہہ دیتے ہیں کہ میں تمہیں جان سے مار دُوں گا لیکن اس طرح کہنے سے انہیں قاتل تو قرار نہیں دیا جا سکتا ورنہ تو پاکستان کی ساری جیلیں ایسے قاتلوں سے بھری ہوئی نظر آئیں اور جہاں تک گڑیا بھیجنے کا تعلق ہے اسے بھی جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیا اس نے کوئی اور چیز بھی بھیجی؟''

''ایک گڑیا ہی کافی تھی۔'' اس نے مجھے سرد نظروں سے دیکھا ''اس نے کام دکھایا یا نہیں؟''

''دیکھیں مسز خان! میں لاش کا پوسٹ مارٹم کروانا چاہتا ہوں تاکہ موت کا صحیح سبب معلوم ہو سکے کہ آیا ہارٹ اٹیک سے موت واقع ہوئی یا کوئی اور وجہ ہے۔ مجھے افسوس ہے یہ آپ کو بُرا لگے گا۔''

''مجھے یہ بات اور بھی بُری لگے گی کہ وہ عورت جب جی چاہے کسی کو بھی اپنے جادو سے قتل کرے۔ پھر اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔''

''اوکے۔'' میں نے آہ بھر کر کہا ''اچھا مجھے بتائیں یہ عورت کہاں رہتی ہے؟ میں اس سے بات

کروں گا۔''

اس نے مجھے جھونپڑیوں کی طرف جانے کا راستہ بتایا پھر میں نے سلمان سے کہا کہ لاش کے پوسٹ مارٹم کے انتظامات کرے پھر ایک فون ان کے خاندانی ڈاکٹر کو کیا اور اس کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔

ڈاکٹر چھوٹے قد کا لیکن سمارٹ آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ نادر خان کی موت کا سبب ہارٹ اٹیک تھا۔ وہ ایک چلتا پھرتا ٹائم بم تھا۔ اس کو کئی سال سے دل کا عارضہ تھا۔ وہ سگریٹ، شراب، کافی اور سوڈا جیسی نقصان دہ چیزوں کا عادی تھا۔ تیز مزاج اور غصّہ والا تھا۔ چھوٹی سی غلطی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بم کی طرح پھٹ پڑتا تھا۔ مضر صحت چیزوں سے پرہیز کرنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ یہی تمام عوامل تھے جو اس کے ہارٹ اٹیک کا سبب بنے۔''

''اس کا مطلب ہے تم اس بیوہ کی بات سے متفق نہیں ہو کہ وہ جادو کے اثر سے مرا ہے۔''

''کیا اس نے ایسا کہا؟'' اس نے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔ پھر سر ہلا کر بولا ''وہ بہت پریشان ہے۔ اس نے مجھے کئی دفعہ بتایا کہ کسی عورت نے اس کے شوہر کو بددعا دی تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ٹھیک اس واقعہ کے فوراً بعد وہ بیمار پڑ گیا لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے جادو کی تشخیص کرنے کی ٹریننگ نہیں ملی ہے۔ میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں یہی وجہ لکھی ہے کہ وہ پیٹ کے ایک وائرس میں مبتلا ہو کر بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کا خاتمہ ہارٹ اٹیک سے ہوا ہے۔''

''میں اس کا پوسٹ مارٹم کروانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے نہیں پتہ کہ تم کیا سوچ رہے ہو اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو ورنہ دل کے دورے کے سوا تمہیں موت کا اور کوئی سبب نہیں ملے گا۔''

وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آیا۔ ہم شکریہ ادا کر کے اگلے مرحلے کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہ رش کا وقت تھا۔ ہم شہر کی گہما گہمی سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ جھونپڑیوں کی طرف ایک کچا راستہ جاتا تھا۔ دو دن پہلے بارش بھی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور سڑک پر بہت کیچڑ تھی۔ ہم گاڑی سے اُتر کر بچتے بچاتے کودتے پھلانگتے بہت مشکل سے جھونپڑیوں تک پہنچے۔ سلمان بار بار مجھ سے معافی مانگتا اور شرمندہ ہوتا رہا۔ پورے راستے خوفناک مچھر ہم پر حملہ آور ہوتے رہے۔ میں تو پھر بھی پوری آستین کی قمیص پہنے ہوئے تھا لیکن سلمان آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں تھا۔ وہ مچھروں سے ہاتھاپائی کر رہا تھا۔ مچھروں کا ایک بادل تھا جو ذوں ذوں کی آواز کے ساتھ ہمارے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ ''یہاں رہنے کی کس کمبخت کو خواہش ہو سکتی ہے سر۔ یہ تو جہنم کا گڑھا ہے۔'' سلمان نے جل بھن کر کہا۔

''میرا خیال ہے کچھ لوگ شہر کے شور و غل سے دُور تنہائی میں سکون کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جس جگہ اس طرح کے خونخوار مچھر ہوں تو میں یہ زمین مفت میں دے دوں نہ کہ اس جگہ کے حصول کے لیے جھگڑا کر کے جان کی بازی لگاؤں۔'' سلمان نے کہا۔

ہم جھاڑیوں کے درمیان ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گھنے درختوں کے نیچے بنی ہوئی جھونپڑی تک پہنچے۔ ایک کتے نے کسی کونے سے نکل کر بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ اجنبیوں کو دیکھ کر اس کے جوش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی آواز سن کر ایک دبلے پتلے سیاہ رو شخص نے ایک جھونپڑی کے دروازے سے سر باہر نکال کر ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہم ماسی نذیراں کا گھر تلاش کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ماسی نذیراں..... وہ اجنبیوں سے نہیں ملتیں۔''

''ہم پولیس والے ہیں ان سے کچھ سوالات کرنے ہیں اگر انہوں نے ملنے سے انکار کیا تو تھانے بھی بلا سکتے ہیں۔''

اس شخص نے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ہم نے اپنے لئے موت کا گڑھا کھودلیا ہو۔ وہ ہمیں عصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''شاید تم نہیں جانتے ماسی نذیراں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ وہ تم پر ایک نظر ڈالے گی اور تم سکڑتے جاؤ گے اور مر جاؤ گے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے۔''

''مجھے یہ منظر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

بوڑھے شخص نے مایوسی سے کندھے اچکائے اور اشارے سے بتایا ''وہ وہاں اس درخت کے نیچے جو جھونپڑا ہے اس میں رہتی ہے۔''

ہم جیسے ہی اس جھونپڑے کے پاس پہنچے ساری مرغیاں جو درخت کے سائے میں بیٹھی تھیں شور مچاتی ہوئی بھاگیں۔ شور کی وجہ سے جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور تاریکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔

''کیا آپ ماسی نذیراں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔'' جواب ملا۔

''میں آپ سے نادر خان کے متعلق کچھ سوالات کرنے آیا ہوں۔''

''وہ ابھی تک مرا نہیں؟'' اس نے پُرسکون آواز میں پوچھا۔

''آج صبح اس کا انتقال ہو گیا۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے تم آ سکتے ہو۔ یہ باہر ہی ٹھہرے گا۔'' اس نے سلمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سلمان نے سکون کی سانس لی۔ وہ پہلے ہی بہت سہما ہوا تھا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا۔ اندر بڑی تاریکی تھی اور وہاں مرغیوں کی غلاظت اور پسینے کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ابکائی آنے لگی اور سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ وہاں ایک کرسی اور میز پڑی تھی۔ ماسی نذیراں نے مجھے وہاں بیٹھنے کو کہا۔

میں اس پر بیٹھ گیا۔ وہ خود بھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں تاریکی کے باوجود میں اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سر کے گرد ایک کپڑا لپیٹا ہوا تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی مالائیں پہنی ہوئی تھیں۔

''آج خان صاحب انتقال کر گئے۔'' میں نے بات کا آغاز کیا۔

اس نے سر ہلایا جیسے اسے یہی اُمید تھی۔

''وہ ایک ماہ پہلے تم سے ملنے آئے تھے اور تمہیں زمین خالی کرنے کو کہا تھا کیونکہ وہ یہاں کچھ تعمیراتی کام کرانا چاہتے تھے۔ تم نے انہیں دھمکی دی؟''

''میں نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی۔''

''ان کی بیوہ کا دعویٰ ہے کہ تم نے ان کو اپنے سفلی جادوئی عمل سے مار ڈالا۔''

''میں نے اسے صرف متنبہ کیا تھا۔ اس کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ مجھ سے زمین خالی کرائے۔ یہ اس کی زمین کیسے ہو گئی۔ میں اس زمین پر پیدا ہوئی۔ میری ماں اس زمین پر پیدا ہوئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی اور پتہ ہے پھر اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا میں اس جگہ بلڈوزر چلوا دُوں گا اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اس کے اندر ہو یا باہر۔''

''پھر تم نے اسے بددُعا دی؟''

اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور بولی ''میں نے اس سے کہا تھا کہ تم نے اگر اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا تو پچھتاؤ گے۔''

''پھر تم نے اسے ایک گڑیا بھیجی؟''

''میں نے کیا کیا؟'' اس نے کرسی پر آگے جھکتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے اسے ایک جادو کی گڑیا بھیجی جس کے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں؟''

''میں نے اسے کبھی کوئی گڑیا نہیں بھیجی نہ ہی مجھے اپنے کام کے لیے کسی گڑیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اگر ایک بار یہ کہہ دیا کہ یہ آدمی مر جائے گا تو وہ مر جائے گا۔ یہی میرے جادو کا کمال ہے۔ سمجھ میں آیا؟''

''تو تم نے کوئی گڑیا نہیں بھیجی؟''

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔''

''اس کے علاوہ بھی کوئی چیز نہیں بھیجی؟ جیسے کھانے یا پینے کے لیے؟''

یہ سن کر وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور بولی ''تم یہ کھوج لگا رہے ہو کہ میں نے کوئی زہر تو نہیں بھیجا۔ ماسی نذیراں کو کسی زہر کی ضرورت نہیں۔ تم پولیس والے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اگر میرے جادو سے کوئی آدمی مر جائے تو تمہارے پاس کوئی طریقہ ہے کہ اسے ثابت کر سکو؟''

وہ بیوقوف نہیں تھی۔ میں نے سوچا۔ اور کھڑا ہو گیا ''میں یہ بات جانتا ہوں لیکن یہ پاکستان ہے۔ تم یہ نہیں کر سکتیں کہ جب چاہو جس کو چاہو مار دو۔''

''کیوں نہیں کر سکتی؟ تمہارے اس شہر میں سینکڑوں لوگ ایسے ہیں جو ایک پرس، ایک موبائل فون اُڑانے، گھڑی اُتروانے کے لیے جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ تمہارا وہ خان ہم شریف اور بے ضرر کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ ہمیں بے سہارا اور بے آسرا چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کو کیوں ہم غریبوں پر رحم نہیں آیا۔''

''ایسے معاملات کے لیے یہاں عدالتیں موجود ہیں۔''

''ہونہہ عدالتیں! ہر شخص جانتا ہے کہ غریب لوگوں کی کوئی شنوائی نہیں۔ کوئی عدالت ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔ اسی لیے غریب لوگوں کو مجھ جیسی عورت کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کا خیال رکھ سکے۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی پھر تحکمانہ انداز میں کہنے لگی ''تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اب یہاں سے چلے جاؤ۔''

پھر وہ کوئی چیز اُٹھانے کے لیے اُٹھی۔ پہلی نظر میں مجھے لگا کہ وہ ایک چھڑی ہے پھر میں نے دیکھا وہ چھڑی حرکت کر رہی ہے۔ وہ ایک سانپ تھا مجھے اس کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ پھر وہ سرسراہٹ ایک گونج میں تبدیل ہو گئی جیسے ناراض روحیں میرے اردگرد منڈلا رہی ہوں۔ خوف سے میرے جسم کے بال کھڑے ہو گئے اور میرے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ ایسی کیفیت میں نے کہانیوں میں پڑھی تھی لیکن اس وقت میں خود محسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا ''میں جا رہا ہوں۔'' پھر تیزی سے میں دروازے کی طرف بڑھا۔

''اور لوٹ کر واپس نہ آنا۔ تم ہمیں سکون سے رہنے دو ہم بھی تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔'' اس نے میرے پیچھے سے آواز لگائی۔

میں اندھیری کوٹھری سے سورج کی روشنی میں باہر آیا تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ سلمان درخت کے سائے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو

اطمینان کی سانس لی۔

''آؤ سلمان ہم واپس جا رہے ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے سر، کیا وہ سچ مچ جادوگرنی ہے؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے وہاں سانپ دیکھا تھا اور خوف سے میری گردن کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔

''آپ نے نوٹ کیا تمام مرغیوں کا رنگ سفید ہے؟''

''ہاں..... آں..... میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔''

''کیا اس عورت نے اعتراف کیا کہ اس نے جادو کیا تھا؟''

''پورے طور پر نہیں لیکن اسے نادر خان کے مرنے پر حیرت بھی نہیں ہوئی اور ہم جادو کو کسی طرح ثابت بھی نہیں کر سکتے۔''

''نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اب تک صرف وقت ضائع کیا ہے۔''

''نہیں وقت ضائع نہیں ہوا۔ مجھے ایک اہم بات معلوم ہوئی ہے کہ گڑیا اس نے نہیں بھیجی تھی۔''

سلمان نے میرے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا ''تو پھر وہ کس نے بھیجی تھی؟''

''سلمان! یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔''

''میرا سر؟ میں کیسے پتہ لگاؤں گا کہ جادو کی گڑیا کہاں ملتی ہیں؟''

میں نے اسے خشونت سے گھور کر دیکھا۔

''سلمان! تمہیں اپنی بہتر کارکردگی دکھانی ہوگی۔ اس کے لئے اپنے دماغ کو استعمال کرو ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو ایک بال پین کا ہوتا ہے جب اس کی سیاہی ختم ہو جاتی ہے تو اسے اُٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔''

اس نے شرمندگی سے سر ہلایا ''اوکے سر! میں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''تم کام کی شروعات میرے ساتھ کر سکتے ہو۔ میں ان کی ملازمہ سے ملنے جا رہا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ اس کو اتنی جلدی میں گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس نے وہاں کوئی غیر معمولی بات دیکھی تھی؟''

''اوہ ملازمہ! میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔'' سلمان نے توصیفی انداز میں سر ہلایا۔

''ہم کل وہاں جا رہے ہیں۔''

''گڈ آئیڈیا سر۔'' اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

دوسرے دن میں نے اس ڈاکٹر کو فون کیا جس نے نادر خان کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔

''کوئی خبر؟''

''موت کا سبب ہارٹ اٹیک ہی ہے جیسا کہ ان کے فیملی ڈاکٹر نے کہا تھا۔''

''بیماری کے دوران اس نے کون سی دوائیں استعمال کی تھیں اور کتنی؟''

''ابھی میرے پاس تفصیلی رپورٹ نہیں ہے۔ آپ بعد میں فون کیجئے گا۔''

پھر میں سلمان کے ساتھ ملازمہ کے گھر گیا۔ اس کا نام شہلا تھا۔ وہ ایک لمبی چوڑی پروقار عورت تھی۔ دیکھنے میں ملازمہ نہیں لگتی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی شرمندگی سے کہا ''مجھے اس طرح جلدی میں خان ہاؤس سے بھاگنے کا افسوس ہے۔''

ہم اس کی راہنمائی میں ایک صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔

''دراصل میں نے کبھی کسی انسان کو اس طرح سکڑتے اور مرتے ہوئے نہیں دیکھا اور پھر وہ گڑیا جس میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔''

''ہمیں گڑیا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''ایک دن مسز خان نے مجھے ایک گڑیا دکھائی اور کہا کہ دیکھو اس نے اب مجھے کیا بھیجا ہے۔ میں اسے جلا دُوں گی لیکن نادر کو نہیں دکھاؤں گی۔''

''کیا وہ گڑیا ڈاک سے آئی تھی؟''

''جی ہاں! ڈاکیہ صبح ساڑھے نو بجے آیا تھا۔ وہ کچھ خطوط اور ایک پارسل دے کر چلا گیا۔''

''تو سب سے پہلے تم نے اس پارسل کو دیکھا؟''

وہ گھبرا کر بولی ''نہیں سر! سب سے پہلے میں نے پارسل نہیں دیکھا، مسز خان نے خود پارسل اُٹھایا تھا اور اسے کھول کر گڑیا نکالی تھی۔''

''شہلا یہ بتاؤ تم کتنے عرصہ سے ان لوگوں کے ساتھ ہو؟''

''سات سال ہونے والے ہیں۔''

''تمہارا وہاں دل لگ گیا ہوگا؟''

اس نے اپنی ناک سکیڑی ''میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہاں میرا دل لگ گیا تھا یا میں انہیں پسند کرنے لگی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ مجھے تنخواہ بہت اچھی دیتے تھے اور کام بھی سخت نہیں تھا۔ برا نہ مانئے گا مسٹر خان مرحوم کو مشکل سے ہی کوئی خوش رکھ سکتا تھا۔ وہ بہت نفاست پسند تھے۔ ہر چیز جگہ پر پسند کرتے تھے۔ کوئی تقریب ہو رہی ہوتی تو وہ میرے سر پر سوار رہتے تھے۔ حکم پر حکم صادر کرتے تھے اور بہت شور مچاتے تھے۔''

''وہ بہت چیختے چلاتے اور غصہ کرتے تھے۔ ہے ناں؟''

وہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی اور سر ہلا کر بولی ''جی ہاں جناب! وہ بہت غصہ کرتے تھے۔ طوفان سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ کوئی چیز اگر بے جگہ ہو جاتی یا ان کی پسند کے مطابق نہ ہوتی تو وہاں کھڑے ہو کر اس وقت تک چیختے تھے جب تک کہ وہ چیز صحیح جگہ پر نہ رکھ دی جاتی۔ مسز خان خود کھانا پکاتی تھیں کیونکہ وہ کھانے کے معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ انہیں نوکروں کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا۔''

''اور مسز خان کو انہیں خوش رکھنے کے لیے بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہوگی؟''

''جی ہاں سر۔''

''اور مسٹر خان کا اپنی بیگم کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟''

''وہ بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب وہ موڈ میں ہوتے تھے تو شہد کی طرح میٹھے ہو جاتے تھے۔ جب بھی دوسرے ممالک کے دورے پر جاتے تو ان کے لئے ڈھیروں تحفے اور پھول لاتے تھے۔''

''اچھا تو اب تم کیا کرو گی؟ کیا تم واپس جاؤ گی؟'' میں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو مسز خان پر منحصر ہے۔ وہ بلائیں گی تو ضرور چلی جاؤں گی۔'' اس نے باہر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہم دوبارہ چلچلاتی دھوپ میں باہر نکلے۔ میں نے سلمان سے پوچھا ''اس عورت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تو شریف عورت لگتی ہے سر۔''

''کبھی کبھی شریف لگنے والے لوگ حیرت انگیز کام کر دکھاتے ہیں۔ تم اس پر بھی نظر رکھنا۔ اس وقت میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے وہ شخص ہارٹ اٹیک ہی سے مرا ہو لیکن کوئی تو تھا جس نے وہ گڑیا پارسل کے ذریعے بھیجی تھی۔ کوئی اسے خوفزدہ کر کے مارنا چاہتا تھا۔ بہرحال میں اب مسٹر خان کے وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔ میں ان کی وصیت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

.....

وصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کافی رقم خیراتی اداروں کے نام تھی۔ کچھ رقم یتیم خانوں کے لئے مختص تھی اور باقی رقم اپنی پیاری بیوی کے نام تھی۔ مسز خان اب ایک دولت مند بیوہ تھی۔ اس کے بعد میں دوبارہ مسز خان کے درِ دولت پر حاضر ہوا کیونکہ ان سے نادر خان کی دواؤں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا تھیں۔

''میرے شوہر کے استعمال میں آنے والی دوائیں؟ آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے؟'' وہ کچھ تذبذب سے بولی۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ان کے سسٹم میں digoxin (عارضۂ قلب کی دوا) کی ڈبل مقدار میں موجودگی پائی گئی ہے اور میں دوائیں دیکھ کر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس ڈاکٹر نے تشخیص کی تھیں۔''

''اس کی دوا کی بوتل دواؤں کی الماری میں رکھی ہے۔''

میں اس کی راہنمائی میں ایک فینسی باتھ روم میں داخل ہوا جس میں ماربل اور کرسٹل کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے بوتل دکھائی۔

''کیا وہ اپنی دوائیں وقت پر لیتے تھے؟''

''بہت تنگ کرتے تھے۔ نادر سمجھتے تھے جیسے انہوں نے آبِ حیات پی رکھا ہو اور انہیں کچھ نہ ہو سکتا ہو۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے تو کبھی ایک گولی بھی نہیں کھائی۔ مجھے اور شہلا کو زبردستی دوا کھلانی پڑتی تھی۔''

''شکریہ۔ مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔'' میں نے دوا کی بوتل اسے واپس کر دی۔ وہ بوتل ہاتھ میں تھامے رہی۔ پھر پوچھنے لگی ''آپ کا کیا خیال ہے اب مجھے یہ بوتل پھینک دینی چاہیے؟''

''کچھ دن اور نہ پھینکئے شاید ضرورت پڑ جائے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے تاثرات پر بڑا قابو تھا۔ اس محکمہ میں میں بیس سال سے کام کر رہا ہوں۔ میرے چہرے کے تاثرات سے کبھی کوئی یہ نہیں جان سکا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس کیس میں میں نے اس ڈاکٹر کے نام کو ذہن میں محفوظ کر لیا جس نے دوا تشخیص کی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ اکتوبر کی پہلی تاریخ کو بوتل میں ایک سو بیس گولیاں تھیں جو دن میں تین بار لینی تھیں۔ اس بوتل میں اب دس گولیاں باقی تھیں۔ نادر خان نے پہلی تاریخ سے گولیاں کھانی شروع کیں تو اس وقت بوتل میں کم سے کم تیس گولیاں ہونی چاہیے تھیں تو پھر یا تو گم ہوگئیں یا پھر کسی نے زیادہ مقدار میں کھلانے کی کوشش کی۔

میں نے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا اور پوچھا ''مسز خان نے بتایا ہے کہ تم نے دوا کی خوراک بڑھانے کی تاکید کی تھی۔''

''میں نے بہت تھوڑی سی مقدار بڑھانے کو کہا تھا۔''

''روزانہ تین گولیوں کے علاوہ دینے کو کہا تھا؟''

''نہیں وہی تین گولیاں دینے کا کہا تھا۔ صرف ان کی طاقت بڑھا دی تھی۔''

''شکریہ۔'' میں نے فون بند کر دیا۔ میرا شک صحیح ثابت ہوا تھا۔

.....

جب میں ہیڈ کوارٹر کے دروازے میں داخل ہوا تو سلمان کو بہت پرجوش پایا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

''میں نے پتہ لگا لیا ہے سر کہ گڑیا کس نے خریدی تھی۔'' وہ اتنی زور سے چیخا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''کون ہے وہ؟''

''ایک عورت۔'' اس نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

''بڑی بات ہے۔ پاکستان کی آدھی آبادی عورتوں پر مشتمل ہے۔''

وہ میرے طنز کو نہیں سمجھ سکا اور بولا ''آپ کو پتہ ہے اس شہر میں جادو ٹونے کے سامان کی دکانیں ہیں۔ آپ ہیبت ناک ڈیزائنوں کی چیزیں خرید سکتے ہیں جیسے انسانی کھوپڑی، انسانی ہڈیوں کے ڈیزائن والی چیزیں۔ وہاں جادوئی الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔''

''مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی، بہرحال تم نے وہ سٹور کیسے تلاش کیا؟''

''میں نے اسے انٹرنیٹ پر ڈھونڈا تھا پھر میں سٹور پر گیا۔ دکاندار نے بتایا ایسی گڑیا سیاح خریدتے ہیں لیکن وہ عورت یقیناً یہاں کی شہری تھی۔ اس نے گڑیا تین ہفتے پہلے خریدی تھی۔ تو پھر یہ ثابت ہو گیا سر.....''

''کیا ثابت ہو گیا؟''

''کہ وہ جھوٹ بولی رہی تھی۔''

''کون جھوٹ بول رہی تھی؟''

''ماسی نذیراں۔ اس نے جھوٹ بولا کہ اس نے گڑیا نہیں بھیجی۔''

''اور کس بات نے تمہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ماسی نذیراں تھی؟''

''دکاندار نے کہا تھا وہ یہیں کی رہنے والی تھی۔ ماسی بھی یہیں کی رہنے والی ہے۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ''تم نے اس سے عورت کا حلیہ پوچھا تھا؟''

وہ بغلیں بجانے والے انداز میں کھسیا کر بولا ''نہیں جناب میں اندازہ لگا رہا تھا۔''

''سلمان! ملازمت کو قائم رکھنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ منہ کھولنے سے پہلے تمام شواہد جمع کر لو۔ چلو اب مجھے سٹور پر لے کر چلو۔''

سلمان تمام راستے خاموش رہا اور شرمندگی محسوس کرتا رہا۔ اس نے دکان کے آگے گاڑی روکی۔ یہ علاقہ سیاحوں کی خرید و فروخت کے لیے مشہور تھا۔ دکاندار سلمان کو دوبارہ دیکھ کر حیران ہوا اور سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

''گھبراؤ نہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس عورت کا حلیہ کیسا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مجھے اس عورت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔ مجھے وہ اس لئے یاد رہ گئی کیونکہ وہ ان عورتوں سے ذرا مختلف تھی جو میرے سٹور پر آیا کرتی ہیں۔ وہ درمیانی عمر کی خوبصورت عورت تھی۔ بال سلیقے سے بنائے ہوئے تھے۔ بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ سیاح عام طور پر قیمتی لباس نہیں پہنتے اور نہ اونچی ایڑی کی سینڈل پہنتے ہیں کیونکہ انہیں گھومنا پھرنا ہوتا ہے۔'' دکاندار نے تفصیل سے ہر بات بتائی۔

ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھے۔ میں نے سلمان سے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے سلمان، کیا ماسی نذیراں اتنی دُور سے ایک گڑیا خریدنے کے لیے شہر آ سکتی ہے؟ اگر اس کو گڑیا بھیجنی تھی تو وہ خود گڑیا بنا کر اور اس پر جادو کر کے بھیج سکتی تھی۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ ابھی تک شرمندہ تھا۔

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے سر.....؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی یہ کیس جتنا میرا ہے اتنا ہی تمہارا ہے۔''

''میرا خیال ہے سر یہ ملازمہ کا کام ہے۔ نادر خان کی موت کے بعد وہ جتنی تیزی سے وہاں سے فرار ہوئی تھی یہ چیز اس کو مشکوک بناتی ہے۔''

''ڈیٹیکٹو ٹریننگ کے دوران تمہیں سکھایا گیا ہے کہ زیادہ تر قتل کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔''

اس نے بھنویں سکیڑیں اور بولا ''کسی کا مفاد مدِنظر ہوتا ہے۔''

''اور اس قتل کے پیچھے کس کا مفاد نظر آتا ہے؟''

وہ حیرت سے دیکھتا رہا اور بولا ''ملازمہ کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اُلٹا اس نے تو اپنی نوکری بھی گنوا دی۔''

''اور وصیت میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔''

''اس کی بیوی صرف اپنے شوہر سے محروم ہوئی ہے۔''

''اور ایک دولت مند بیوہ بن گئی ہے۔''

''اوہ!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''آپ کا کیا خیال ہے..... اس کی اپنی بیوی؟؟ وہ تو بہت غمزدہ تھی۔''

''اور اب میں تمہاری معلومات میں ایک اہم اضافہ کروں گا کہ عورتیں دنیا کی بہترین اداکارائیں ہوتی ہیں۔ میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو ضرورت کے مطابق رو نہ سکے۔''

''تو پھر نادر خان کی موت کیسے واقع ہوئی سر؟ وہ تو جادو میں یقین نہیں رکھتا تھا۔''

''اس کی بیوی اسے دوا کی زیادہ مقدار کھلا کر پہلے تو اسے کمزور کرتی رہی تاکہ وہ آہستہ آہستہ موت کے قریب ہوتا جائے اور کسی کو شک بھی نہ ہو۔ پھر دنیا کو دکھانے کے لئے یہ جادو کی گڑیا اور جادوگرنی کا ڈرامہ رچایا۔''

''ہم اسے کیسے ثابت کر سکتے ہیں سر؟''

''اس شک کی تصدیق کے لیے ابھی ایک میڈیکل رپورٹ آنی باقی ہے۔''

.....

میرا شک صحیح ثابت ہوا۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے ہمیں لیب میں بلایا اور بتایا کہ نادر خان کے جسم کے ٹشوز میں ایک زہر سنکھیا کی مقدار پائی جاتی ہے جو کسی کو فوراً مارنے کے لیے کافی نہیں ہوتا لیکن کسی انسان کو آہستہ آہستہ کمزور کرنے اور قریب المرگ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی تھی اس لیے اس نے موت سے دو ہفتے پہلے سنکھیا دینا بند کر دی تھی۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ سنکھیا کے اثرات تاحیات باقی رہتے ہیں۔

جب ہم مسز خان کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو سلمان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات گویا منجمد ہو گئے تھے۔ وہ اُداس لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا سلمان؟ تم اس عورت کے لیے اُداس ہو؟ ایک پولیس والے کو کسی کیس میں جذبات سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کیا تم یہ جانتے ہو؟''

''یس سر! میں جانتا ہوں لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''تم عورتوں کی نفسیات کو نہیں جانتے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

مسز خان کی پروقار شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ عدالت کی تمام کارروائی کے دوران وہ خاموش اور سنجیدہ رہی۔ وہ اسی طرح شاندار لباس، اونچی ایڑی کے جوتے اور سچے موتیوں والے زیورات پہنتی رہی۔ جب وہ عدالت کے دروازے سے باہر نکلتی تو اس کے چاروں طرف کیمروں کی فلیش لائٹ کی برسات ہونے لگتی اور وہ ان کے درمیان سر اُٹھائے گردن تانے مسکراتی رہتی۔

''قیدی موت کی وادی کے''

ایان خان

وہ تین عورتیں تھیں، انہوں نے ''موت کی وادی'' میں داخل ہونے کی غلطی کی تھی.....اور پھر تین دن تک مسلسل بھٹکتے رہنے اور 300 میل کا سفر طے کرنے کے بعد بھی وہ اس خوفناک وادی سے نکلنے میں کامیاب نہ ہوسکیں.....گاڑی میں گیس ختم ہوچکی تھی اور اس کے ساتھ ان کے بچنے کی اُمید بھی.....!

زیرِنظر سچی کہانی امریکی ریاست کیلی فورنیا میں واقع ''موت کی وادی'' میں بھٹک جانے والی تین عورتوں کی ہے جو 7770 مربع کلومیٹر پر محیط وسیع و عریض وادی میں جی پی ایس ڈیوائس کی غلطی سے ایسی بھٹکیں کہ اس وادی سے نکلنا ان کے لئے زندگی کا بھیانک ترین تجربہ بن گیا۔ 480 کلومیٹر مسلسل گاڑی چلانے اور تین روز تک بھٹکتے رہنے کے باوجود ان کے پاس منزل کا پتہ تھا اور نہ درست راستے کا نشان۔ ان کی گاڑی میں پٹرول ختم ہو چکا تھا اور زندہ بچ نکلنے کی اُمیدیں دم توڑ رہی تھیں۔

اپنے دیگر ہمسایوں کی طرح ''ڈونا گوپر'' بھی بیشمار دفعہ ''ڈیتھ ویلی نیشنل پارک'' سے گزر کر جا چکی تھی۔ موت کی اس وادی کو امریکہ کا گرم اور خشک ترین علاقہ قرار دیا جاتا ہے جہاں گرمیوں میں درجہ حرارت 40 سے 50 ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔ اپنی گاڑی پر تنہا اس وادی سے گزرتے ڈونا کو کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس سے گزرنا ڈونا کے لئے ایک معمول بن چکا تھا۔ تاہم جولائی 2010ء

کی ایک جمعرات کو 62 سالہ ڈونا گوپر نے اس وادی کے ان حصوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا جہاں وہ اب تک نہیں گئی تھی۔ دراصل ڈیتھ ویلی نیشنل پارک کے جنوبی حصے میں ایک ہسپانوی طرز کی قدیم عمارت تھی ڈونا نے اس کے بارے میں سنا ضرور تھا مگر اب تک اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُس صبح ڈونا نے اسی عمارت کو دیکھنے جانے کا ارادہ کیا تو اس کی بنی سترہ سالہ جینا اور اس کی مہمان ہانگ کانگ سے آئی جینی لی پونگ نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی جسے ڈونا نے بخوشی قبول کرلیا۔

وہ تینوں مطلوبہ مقام پر دوپہر ایک بجے کے قریب پہنچ گئیں اور دو گھنٹے تک اس جگہ پر ہی گھومتی پھرتی اور عمارت کے مختلف حصوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر انہوں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا اور گاڑی میں سوار ہو کر سڑک پر روانہ ہوگئیں۔ راستے میں انہیں ایک ریس ٹریک نظر آیا جو خشک مٹی سے بنا تھا۔ تینوں نے اس ٹریک پر گاڑی چلا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ جینا جو گاڑی چلا رہی تھی، اس نے اپنی ماں ڈونا کی ہدایت پر ٹریک 267 پر گاڑی چلانا شروع کی۔ باہر کا درجہ حرارت 52 سنٹی گریڈ تھا اور تیز ہوا کے گرم بگولے گاڑی سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ ایسے موڑ پر پہنچ گئیں جہاں لگا سائن بورڈ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا، جینا نے کچھ سوچ کر بائیں طرف گاڑی موڑ لی۔ قریب 16 کلومیٹر آگے جا کر اسے محسوس ہوا کہ اُس نے غلط سمت میں گاڑی موڑ لی تھی۔ جینا کی ماں ڈونا نے نقشہ سے مدد لینے کی کوشش کی مگر اس میں صرف وادی کی بڑی سڑکوں کے بارے میں ہی نشاندھی کی گئی تھی۔

''اب کیا کریں؟'' جینا نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو.....میں اپنی جی پی ایس ڈیوائس سے پوچھتی ہوں۔ یہ ضرور ہمیں درست طور پر بتا دے گی۔ کہ سکوٹی کیسل نامی اس ہسپانوی عمارت تک کیسے واپس پہنچنا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈونا نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جی پی ایس ڈیوائس کی ہدایات کی روشنی میں آگے بڑھنے لگی۔

موت کی اس وادی میں سفر کرنے والے اس وقت سے راستہ سے بھٹکتے آئے ہیں جب 1849ء میں پہلی بار اس وادی کو کیلی فورنیا کے سونے کے ذخائر کی طرف جانے والے مختصر راستے کے طور پر اختیار کیا گیا۔ کئی مسافر اس خوفناک ریتلی اور گرم وادی میں راستہ سے بھٹک کر موت کا شکار ہو چکے ہیں اور اسی لئے اسے ''موت کی وادی'' کہا جاتا ہے۔ ان حادثات کے تدارک کے لئے جگہ جگہ رہنما نشان اور ہدایات درج کی گئی ہیں نیز جی پی ایس ڈیوائسز کی مدد سے اس وادی کے سفر کو محفوظ بنانے کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئی ہیں مگر ڈونا اور اس کی ساتھی نوجوان لڑکیاں جس راستے پر بھٹک چکی تھیں اس پر نشان تھے اور نہ ہدایات راستہ پتھریلا اور تنگ ہو رہا تھا..... جینا کا سر چکرا رہا تھا اور اسے متلی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے گھر جانا ہے.....'' جینا روہانسی لہجے میں بول اُٹھی۔

''بچی مت بنو جینا.....حوصلے سے کام لو، جلد ہم درست راستہ ڈھونڈ لیں گے۔''

مگر ڈونا کو خود اپنی آواز میں یقین کی کمی واضح محسوس ہوئی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھی جینی بھی بمشکل خود کو رونے سے روک رہی تھی۔ مئی کے مہینے میں امریکہ آنے کے بعد سے اس نے ڈونا اور جینا کے ساتھ بے شمار پرلطف مقامات کی سیر کی تھی اور خوب مزے کے دن گزارے تھے جن میں بعض مقامات پر مہم جوئی کا

لطف بھی شامل تھا مگر یہ سفر اس کے لئے کچھ زیادہ ہی ہنگامہ خیز ثابت ہوا تھا۔ اگرچہ ان کی گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی اس کے باوجود جینی کے ہونٹ بے حد خشک ہو رہے تھے وہ پانی پینا چاہتی تھی مگر ان کے پاس موجود چار بڑی پانی کی بوتلوں میں سے تین پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں اور آخری بوتل کو کھولنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ جب ڈونا نے اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے پانی کی بوتل اسے تھمائی تب بھی جینی محض اس کے ٹپکتے قطروں سے ہی کھیلتی رہی۔

''جینی..... اسے کھولو اور اپنے حصے کا پانی پی لو!

''ڈونا نے اسے ہدایت کی۔ جینی نے ایک گھونٹ بھرا اور اسے حلق سے نیچے اُتارنے سے پہلے کافی دیر منہ میں گھماتی رہی۔

وہ آگے بڑھتے رہے، راستہ انہیں کہاں لیجا رہا تھا ان تینوں کو صحیح اندازہ نہ تھا۔ دن ڈھلنے لگا تھا مگر گرمی کی شدت کم نہ ہوئی تھی۔ وقفوں وقفوں سے وہ تینوں ایمرجنسی سروسز کو فون ملانے کی کوشش کرتی رہیں مگر کسی نے ان کی فون کالز کا جواب نہیں دیا۔

ڈونا نے ایک نظر اشیاء ضروریہ پر ڈالی۔ پانی کی آخری بوتل کے علاوہ اب ان کے پاس ایک چپس کا بڑا پیکٹ دو سیب اور کچھ بسکٹ ہی بچے تھے۔ جن پر ان تینوں کو گزارا کرنا تھا۔ گاڑی کی ڈگی میں البتہ اس نے مبل، گرم سوئیٹر، اضافی جوتے، ایک اوزاروں کی کٹ اور ابتدائی طبی امداد کی کٹ رکھی ہوئی تھی جو وہ ہمیشہ سفر پر نکلتے ہوئے ضرور رکھا کرتی تھی۔ گاڑی میں نصف سے کچھ کم ٹینک ایندھن باقی تھا۔

ڈونا نے طویل سانس لیتے ہوئے اس خوف کو بھی باہر نکالنے کی کوشش کی جو اس کے اندر جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ اس نے بے شمار دفعہ مشکل اور خوفناک صورتحال کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ بیس بائیس برس کی تھی تو ایک حادثے کے نتیجے میں اسے ہفتوں ہسپتال داخل رہنا پڑا تھا۔ جبکہ اسی برس آنت کی خطرناک بیماری نے اسے موت کے دھانے پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر آٹھ بچوں کی پرورش کی تھی۔ اب وہ جانتی تھی کہ دو نوجوان لڑکیوں کی زندگی کا انحصار اس پر ہے اور اسے انہیں اس صحرا سے کسی طرح زندہ نکالنا ہے۔

رات 8 بجے کے قریب ان کی جی پی ایس ڈیوائس کی روبوٹک آواز نے انہیں جس راستے پر چلنے کی ہدایت کی وہ کچھ ہی آگے جا کر ایک بند گلی کی صورت اختیار کر گیا۔ جینا نے ایک طرف کو جاتے ناہموار اور تنگ راستے کی طرف اشارہ کیا اور وہ اس سے ہوتے ایک ریتلی سڑک پر پھر آگے بڑھنے لگے۔ ڈیوائس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ڈونا نے گاڑی کو اسی سڑک پر بائیں موڑا جو اب پختہ چٹانوں کے درمیان تنگ گلی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ جینا نے مڑ کر اس سڑک پر نظر ڈالی جس سے وہ مڑے تھے، اسے لگا جیسے وہاں اس نے کسی نشان کو دیکھا ہے۔ مگر رات گہری ہو رہی تھی اور اب وہ اتنا آگے بڑھ آئے تھے کہ واپس مڑنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈونا کے گھر میں اس وقت اس کی ایک پرانی کولیگ اور فیملی فرینڈ ''چارلین ڈیل'' ڈنر پر ان تینوں کی منتظر تھی مگر وہ ڈونا کی طبیعت سے خوب واقف تھی اور اسے اس بات سے کوئی پریشانی نہ تھی کہ ڈونا، جینا اور جینی ڈنر پر واپس کیوں نہیں آئیں۔ ایسا پہلے کئی بار ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی دن اچانک کسی مہم پر روانہ ہو جاتی تھی۔ ڈونا کا شوہر 62 سالہ راجر فلوریڈا میں اپنی بیٹی سکائے سے ملنے گیا ہوا تھا۔ وہ بھی ڈونا کی آزاد منش طبیعت کا عادی تھا۔ لیکن سکائے جو ڈونا اور راجر کی 21 سالہ بیٹی تھی۔

اس کا دوپہر کو ایک سنجیدہ نوعیت کا آپریشن ہوا تھا اور اسے یہ بات آسانی سے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ آپریشن کے باوجود اس کی ماں نے اس کی خیر خیریت دریافت نہیں کی۔

''کچھ گڑ بڑ ہے، پاپا!'' سکائے نے اپنے والد راجر کو تشویش سے آگاہ کیا۔

☆.....☆.....☆

ڈونا اس وقت تک گاڑی چلاتی رہی جب تک کہ ایندھن کی سوئی نے ٹینک خالی ہونے کا اعلان نہ کیا۔ پھر وہ رُک گئی۔ رات کے 10 بج چکے تھے اور انہوں نے 320 کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا تھا۔

گاڑی پر گرد کی تہیں جم چکی تھیں اور اوپر سیاہ رات کی تاریکی کو ستاروں کی روشنی کچھ کم کر رہی تھی۔

''لگتا ہے ہمیں یہیں رات بسر کرنا پڑے گی'' ڈونا نے کہا۔

''کیا یہاں جنگلی جانور ہوتے ہیں؟'' جینی نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''ہاں..... پہاڑی شیر اور ریچھ یہاں عام ہیں۔ گاڑی کے شیشے بند کر لو۔'' ڈونا نے انہیں ہدایت کی دونوں لڑکیوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ڈونا نے انہیں کھانے پینے کی اشیاء دیں، جنہیں رات کے کھانے کا متبادل سمجھ کر انہوں نے پیٹ میں اُتارا اور ختم ہوتے پانی کے کچھ گھونٹ لے کر رات بسر کرنے کی تیاری کرنے لگیں۔ جینا تو جلد پُرسکون ہو گئی مگر جینی کو جنگلی جانوروں کا ڈر ستا رہا تھا۔ جبکہ ڈونا کو گاڑی کے بیکار ہو جانے کا مسئلہ پریشان کئے ہوئے تھا۔ دونوں دیر تک آنے والے دن کی مشکل کے بارے میں سوچ کر جاگتی رہیں۔ جمعہ کے روز صبح 6 بجے سورج کی کرنوں سے بکھرتی روشنی میں انہیں معلوم ہوا کہ ان کی گاڑی وادی کی ایک اونچی جگہ پر جنگل کے قریب ہی کھڑی ہے۔ ڈونا نے انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

''اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ کوئی ہمیں یہاں سے نکال کر محفوظ جگہ پہنچائے۔'' جینا نے مایوسی کے عالم میں کہا۔ ڈونا اور جینی نے کچھ سوچ کر پتھر اٹھائے اور زمین پر جگہ جگہ ''مدد'' لکھ دیا۔ جینا نے گاڑی میں پڑے کاغذوں اور لکڑیوں کو ملا کر آگ جلانے کے لئے ایک جگہ رکھا مگر جب گاڑی کے سگریٹ لائٹر سے انہیں جلانے کی کوشش کی تو لائٹر میں سے آواز کے سواء کچھ برآمد نہ ہوا۔

پھر انہیں کچھ فاصلے پر ایک ہوائی جہاز اُڑتا دکھائی دیا۔ انہوں نے گاڑی سے سی ڈی اُٹھا کر اسے ''سگنل مرر'' کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا وہ جہاز اور اس کے بعد اور کئی جہاز بھی آئے اور گزر گئے، انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ 11 بجے کے قریب جب ان کے پاس پانی کا آخری قطرہ بھی ختم ہو چکا تھا..... جینا گرد آلود ہواؤں کے درمیان سڑک پر چلتی تین کلومیٹر راستہ تلاش کرتی رہی مگر اسے ریت اور صحرا کے سوا کچھ نہ ملا۔ ڈونا اور جینی نے گاڑی کے نزدیک موجود جنگلی پھلوں کو کاٹ کر چکھنے کی کوشش کی مگر ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ جو ان کے ختم ہو چکے ذخیرہ خوراک کا متبادل ثابت ہو سکتا۔ اسی دوران جینا واپس لوٹ آئی اور آتے ہی کہنے لگی۔

''ہمیں کسی بھی طرح اس مقام پر واپس پہنچنا ہو گا، جہاں کل ہم رُکے تھے۔''

''میری جان..... مگر ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟ گاڑی تو سٹارٹ ہی نہیں ہو رہی۔'' ڈونا سخت پریشانی کے عالم میں بھی خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پھر کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔'' جینا نے تجویز

دی۔ ڈونا نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے دل میں دعا کی اور پھر چابی گھما دی۔ انجن چنگھاڑا اور گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔

تینوں نے دروازے بند کئے اور ڈونا نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی کوشش تھی جلد سے جلد گاڑی کو بھگا کر اس مقام تک لے جائے جہاں گذشتہ روز انہوں نے قیام کیا تھا وہ جانتی تھی اگر گاڑی رُک گئی تو اس کے ساتھ ہی ان کے زندہ بچ جانے کی اُمید بھی ختم ہو جائے گی۔ دس، بیس، تیس اور پھر چالیس کلومیٹر..... گاڑی اب بھی چل رہی تھی۔ پھر وہ نمک والی ندی کے ساتھ نسبتاً مانوس راستے پر پہنچ گئے پھر آخر کار بند گیٹ نمودار ہوا اور تینوں بے اختیار چلا اُٹھیں انہیں کم از کم محفوظ ٹھکانہ مل گیا تھا۔

وہ تینوں گاڑی سے اُتر کر باڑ عبور کرتی اندر داخل ہوئیں۔ گرمی کی شدت سے تپتی زمین ان کے جوتوں سے ہوتی پیروں کو محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے پوری قوت سے پکارا کہ شاید وہاں کوئی موجود ہو مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر کھلے میدان میں تین بڑے ٹرالر کھڑے تھے۔ معائنہ پر معلوم ہوا کہ تینوں ٹرالر لاک ہیں۔ ڈونا نے سب سے بڑے ٹرالر کے عقب میں ایک خاص چیز ڈھونڈ نکالی..... یہ باغیچہ کو پانی دینے والا پائپ تھا..... تینوں نے پیاس بجھانے کے لئے اس کا رُخ کیا۔ پانی گرم تھا مگر پیاس کی شدت ختم کرنے کے لئے وہ بھی کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ پانی پینے کے بعد وہ کچھ دیر ستانے کے لئے لیٹ گئیں۔

کچھ دیر آرام کے بعد جینا گاڑی سے اوزاروں کی کٹ اُٹھا لائی۔ اس نے بڑے ٹرالر کے پیچ ڈھیلے کئے مگر دروازہ نہ کھول سکی۔ تاہم سب سے چھوٹے ٹرالر کا دروازہ کھل گیا جس کے اندر انہیں کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں۔ نوڈلز، چپس، سافٹ ڈرنک اور دیگر اشیا کچھ دنوں تک انہیں زندہ رکھ سکتی تھیں۔ ٹرالر کے اندر دو میٹریس بھی پڑے تھے مگر چونکہ اندر ہوا نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے انہوں نے میٹریس اُٹھا کر باہر برآمدے میں رکھ لئے جہاں نسبتاً بہتر ماحول تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ٹرالر کے پائپ سے پانی کی بوتلیں بھی بھر لیں تاکہ پائپ خشک ہونے پر پانی کا یہ واحد ذریعہ بھی ختم نہ ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

فلوریڈا میں اگلے روز ہسپتال سے گھر شفٹ ہوتے ہی سکائے کو سب سے پہلے اپنی ماں کے بارے میں معلوم کرنے کی فکر تھی۔ اس نے ڈونا کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے ماں کے فیس بک پیج کو دیکھا مگر کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ آخر میں اُس نے ڈونا کے کریڈٹ کارڈ کی تفصیل دیکھی تو معلوم ہوا کہ آخری بار اُس نے کریڈٹ کارڈ سے گزشتہ روز دوپہر ایک بجے ''سکوٹی کیسل'' کے لئے ٹکٹ خریدے تھے۔ اُس نے اپنی ماں کی کولیگ چارلین ڈین کو فون کیا مگر اُسے بھی ڈونا کی کوئی خبر نہ تھی۔ ڈونا کے دفتر فون کرنے پر بھی سکائے کو یہی پتہ چلا کہ ڈونا دفتر نہیں آئی۔ اب اُس نے انتہائی فکر مند ہو کر اپنے والد کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

''سکائے، اب تو مجھے بھی فکر ہونے لگی ہے۔'' راجر نے اپنی بیٹی سے کہا۔ سکائے نے چارلین سے دوبارہ مشورہ کیا اور دونوں اس نتیجے پر پہنچیں کہ انہیں فوراً پولیس کو آگاہ کرنا چاہئے۔ انہوں نے پولیس کو صورتحال سے آگاہ کیا مگر یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ اس روز چونکہ زیادہ دیر ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان کی باقاعدہ تلاش کا کام اگلے روز ہی شروع ہو سکے گا تاہم ہائی وے پٹرولنگ والوں کو اطلاع کر دی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے وقت ''موت کی وادی'' میں پھنسی تینوں

عورتیں مدد کی منتظر تھیں۔ جینا نے ٹرالر میں سے ملنے والی ماچس کی مدد سے علامتی آگ جلا دی تھی۔ وہاں اس قدر گرمی تھی کہ تینوں عورتیں ہر پندرہ منٹ بعد پانی پینے کے لئے جاتیں اور پانی کے پائپ سے کچھ اپنے اوپر بھی ڈال لیتیں۔

صبح سویرے ڈونا اور جینی نے باہر نکل کر سڑک پر درخت کی ٹہنیوں سے کراس کا نشان بنایا اور ساتھ ہی اپنی گاڑی پر جمی مٹی پر ''مدد کرو، پولیس کو بلاؤ'' کے الفاظ تحریر کئے۔

اس کے بعد انہوں نے ایک بڑے ٹرالر کا دروازہ کسی نہ کسی طرح کھول لیا۔ اس کے اندر ایک ریڈیو ٹرانسسٹر نصب تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ اسے کیسے کام میں لایا جائے کیونکہ ٹرالر بند ہونے کی وجہ سے ٹرانسسٹر کام نہیں کر رہا تھا۔ ڈونا نے اس کی تاروں کو ٹرالر کی بیٹری سے جوڑ کر چلا دیا مگر جب انہوں نے اس پر پیغام بھیجنے کی کوشش کی تو انہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ ریڈیو ٹرانسسٹر کے سگنل بالکل ڈیڈ تھے۔

جینا بس رونا ہی چاہتی تھی مگر اس کی والدہ ڈونا نے اسے سنبھالا دیتے ہوئے کہا ''آؤ پہلے ہم نہا دھو لیتے ہیں ..... مجھے یقین ہے فریش ہو کر ہم بہتر سوچ سکیں گے۔''

جینی اور ڈونا نے پہلے ٹرالر میں پانی بھر کر غسل کیا اور اس کے بعد جینا کی باری تھی۔ ڈونا نے اپنے ہاتھوں سے جینا کے بال دھوئے اور اُسے پانی ڈالنے میں مدد کر رہی تھی جب اُسے لگا کہ کوئی چلا رہا ہے۔ یہ جینی تھی ''باہر نکلو..... جلدی کرو باہر آؤ!'' وہ چلا رہی تھی۔

ڈونا تیزی سے باہر دوڑی اور جینا بھی اُس کے پیچھے تھی۔ جینی پیلے رنگ کے ایمرجنسی کمبل کو پکڑے آسمان کی طرف بے چینی سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اسی لمحے انہیں کانوں کو پھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ہائی وے پٹرول ہیلی کاپٹر اُن کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔

آخر کار انہیں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔

قریب ہی لینڈ کرنے کے بعد ہیلی کاپٹرز کے پائلٹس نے جو پیرا میڈیکل بھی تھے تینوں عورتوں کا طبی معائنہ کیا اور انہیں پینے کے لئے پانی دیکر ہدایت کی کہ جس قدر پی سکتی ہیں پی لیں۔ ''ہم بس مایوس ہو کر واپس لوٹنے ہی والے تھے'' پائلٹس میں سے ایک نے انہیں بتایا۔ تینوں عورتیں بالکل ٹھیک لگ رہی تھیں اس لئے پائلٹس نے انہیں دو تجاویز پیش کیں۔ ایک یہ کہ وہ باری باری ہیلی کاپٹر پر سوار ہوں اور نزدیکی قصبے لون پائن تک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر پہنچ جائیں اور یا پھر اس پارک آفیشل کا انتظار کریں جو ان کی گاڑی کے لئے پٹرول کا کین بھر کے لے آئے گا اور اپنی نگرانی میں ہی انہیں پارک سے باہر پہنچا دے گا۔

ڈونا اور ساتھی لڑکیوں نے دوسری تجویز کو پسند کیا۔

پارک کے نگران آفیسر نے آ کر ان کی گاڑی میں پٹرول بھر دیا۔ ریسکیو ہیلی کاپٹر کا شکریہ ادا کر کے وہ اس آفیسر کے پیچھے اپنی ہی گاڑی پر منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اس بار انہیں پتہ تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہیں۔

☆.....☆.....☆

ریسکیو ہیلی کاپٹرز سے متاثر ہو کر جینا نے دوسروں کے کام آنے کے لئے خود کو تیار کیا اور نرسنگ سکول میں داخلہ لے لیا۔ اسی طرح جینی نے ہانگ کانگ سے نقل مکانی کر کے امریکہ میں امداد باہمی کے ادارے کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کیا اور مقامی کالج میں تربیت بھی حاصل کرنے لگی اور ڈونا ..... اپنے معمول پر صحراؤں کی خاک چھاننے اب بھی نکل کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے ..... ''مجھے تو ایک پل کے لئے بھی ایسا نہیں لگا تھا کہ ہم ''موت کی وادی'' سے نکل نہیں سکیں گے۔''

فوجی کیمپ میں بدروح

م۔ب۔شبنمی

جس جگہ ہم نے کیمپ کیا وہ آموں کا ایک دقیانوسی سا باغ تھا۔ ہر درخت اپنی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے اپنی عمر رسیدگی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ جب ہم نے کیمپ ٹھیک کرنے کے لیے کھدائی شروع کی تو زمین سے انسانی ڈھانچے، ہڈیاں اور انسانی کھوپڑیاں نکلنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ قبرستان ہے اور یہاں کئی انسانی نسلیں مدفون ہیں۔

ایک فوجی کا ماجرا جو محیر العقول واقعات پر یقین نہیں رکھتا تھا

وہ ایک شدید طوفانی رات تھی۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ دیوقامت درختوں کے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر ہوائی خوفناک چیخوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ جب بجلی چمکتی تو پرانے کھنڈرات ایسے منہ کھولے نظر آتے جیسے ان میں ہزاروں بدروحیں قید تھیں اور اب قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے ناگہاں انہیں آزاد کر دیا ہو۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی اس قدر طوفانی تھی جیسے قدرت نے آسمان کے تمام دروازے کھول دیئے ہوں۔

ہمارے فوجی ٹرک میں پانی ہر سمت سے اندر آ رہا تھا اور ہمارے بستر اور وردیاں سب بھیگ گئی تھیں۔ جب بارش سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو ہم تھک ہار کر گاڑی کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ گاڑی لحظہ بہ لحظہ پانی میں ڈوب رہی تھی کیونکہ لڑائی کے دوران فوجی گاڑیوں کو گڑھا کھود کر اس میں کھڑا کیا جاتا ہے تاکہ دشمن کی بمباری سے گاڑی کے انجن اور پہیوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ہماری گاڑی ضرورت سے

زیادہ زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ ہم چار جوان تھے۔ ہمارے پاس صرف وائرلیس کا سامان تھا اور ہمارا مشن ڈپو کی تمام یونٹوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا تھا۔ اشرف جو وائرلیس کا آپریٹر تھا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا:

''استاد کیا طوفانِ نوح (علیہ السّلام) کے وقت بھی ایسی ہی بارش ہوئی تھی؟''

میں نے کہا..... ''بھئی میں اس زمانے میں موجود نہ تھا مگر کتابوں میں پڑھا ہے کہ شدید بارش ہوئی تھی۔ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آسمان کے تمام دروازے کھول دو اور اہل زمین پر خوب پانی برساؤ۔ زمین کو حکم دیا تھا کہ تم میں جو پانی ہے اس کو نکال کر باہر پھینک دو۔ خدا کے حکم سے شدید بارش برسنے لگی اور سمندر کا پانی زمین پر چڑھ دوڑا۔ حتیٰ کہ آسمان اور زمین کا تمام پانی مل کر خشکی پر چھا گیا اور یہ خطۂ ارض سارے کا سارا زیرِ آب آ گیا۔''

میرا یہ وعظ سن کر رشید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''استاد اگر ایسے ہی پھر ہو گیا تو ہم کہاں جائیں گے؟''

ڈرائیور اسلم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''میں گاڑی چلا کر بھاگ جاؤں گا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

مجھے اس کی اس بات پر بے ساختہ ہنسی آئی مگر ہنسی کے ساتھ میرے ذہن میں قرآن پاک کی ان آیات کا ترجمہ آ گیا جن کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''آپ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ زمین کے کنارے بہت وسیع ہیں۔ تم لوگ ان کناروں سے باہر نہیں نکل سکتے اور نہ آسمان کو چھو سکتے ہو۔''

اور واقعی ہم زمین کے کناروں سے نکل کر اپنی حیات قائم نہیں رکھ سکتے۔ میرا دماغ ابھی ایسی ہی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا کہ بجلی چمکی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بادل جو گرجا تو اس کی آواز صورِ اسرافیل سے کم نہ تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری سماعت، گویائی اور بصارت سلب ہو گئی۔ جب قدرت نے ہمارے لرزتے ہوئے جسموں پر رحم کھا کر یہ چیزیں واپس دیں تو مارے خوف کے ہمارا خون خشک ہو گیا۔ ہمارے کیمپ میں ایک بڑا آتشیں گولہ رقص کر رہا تھا۔ وہ ایسے لگتا تھا جیسے کسی دیوتا کی روح جوشِ انتقام میں اپنا شکار تلاش کر رہی ہے۔ ہم سب کی آنکھیں مارے خوف کے پتھرا گئیں۔ شاید قدرت کو ابھی ہمارا جینا منظور تھا اس لیے وہ جہنمی شعلہ اٹھکیلیاں کرتا ہوا ہم سے دُور ہٹنے لگا۔ پھر یک لخت لپک کر اس نے ایک آم کے درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہت بڑا دھماکہ ہوا اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس بوڑھے درخت نے اپنی جان دے کر ہمیں بچا لیا تھا۔ اسلم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا کہ ہمیں اس قبرستان کو اکھاڑنے کی ضرور سزا ملے گی۔

فوجی ہونے کی وجہ سے میں اپنی صحیح پوزیشن ظاہر نہیں کر سکتا، اس لیے مقام، اشخاص، یونٹ اور بارڈر کا ایریا جہاں ہم نے کیمپ کیا ہوا تھا، ان کے نام فرضی سمجھیں مگر واقعات حرف بہ حرف سچے ہیں۔ ان کے نقوش ابھی تک میرے دل و دماغ پر ثبت ہیں۔ میں ایک نڈر سپاہی ہوں۔ یہ میرا ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ دوسرے بھی مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔

بھوت پریت کا میں بچپن سے قائل نہیں ہوں۔ مختلف ڈائجسٹ میں جتنی بھی پراسرار کہانیاں چھپتی ہیں ان کو میں لغو اور بکواس سمجھتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ میرے ان خیالات کی تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ آپ آگے پڑھ کر خود اندازہ کر لیں۔

دسمبر 1971 کی رسوائی کے بعد، معاف کرنا

میں اسے لڑائی کہتے ہوئے شرماتا ہوں کیونکہ یہ مکار سیاستدانوں میں ہوسِ اقتدار کی جنگ تھی۔ پاکستان کو سرنگوں کرنے..... اور فوج کو ذلیل کرنے کی جنگ تھی۔ غداروں کی چالیں کامیاب ہو گئیں۔ قوم کا سر ندامت سے جھک گیا۔ ہر آنکھ پُرنم ہوئی مگر میرا دل و دماغ ان تمام جذبات سے عاری ہے۔ میرا اندازِ فکر آپ سے مختلف ہے کیونکہ مجھے اپنے بازوؤں کی قوت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میرے ہاتھ اپنوں نے باندھے اور غیر نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا اس لیے میں شرمندہ نہیں ہوں بلکہ میرا دل جوشِ انتقام سے جلتا ہے۔ اگر میں کھلے ہاتھ دشمن سے شکست کھا جاتا تو خدا کی قسم میں اس دشمن کو سینے سے لگا لیتا کیونکہ بہادر بہادروں کی قدر کرتے ہیں مگر میرا دشمن بڑا بزدل ہے اس لیے میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ کہتے ہیں اس شکست سے پاکستانی سپاہی کا مورال گر گیا ہے۔ یہ سب آپ کی غلط فہمیاں ہیں۔ میں اب بھی پاکستانی سپاہی ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں اور میری آنکھیں نئے میدانِ کارزار کی متلاشی ہیں۔

ہم دسمبر کے واقعے کے بعد بھی سرحد پر حالتِ جنگ میں تھے۔ دن رات مورچوں میں ڈٹے رہنے کی وجہ سے زندگی کافی بور ہو چکی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے ہائی کمان کے دل میں رحم آیا اور ہماری یونٹ کو جولائی کے ابتدائی ہفتے میں ریسٹ پوزیشن میں لایا گیا۔

جس جگہ ہم نے کیمپ کیا وہ آموں کا ایک دقیانوسی سا باغ تھا۔ ہر درخت اپنی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے اپنی عمر رسیدگی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ جب ہم نے کیمپ ٹھیک کرنے کے لیے کھدائی شروع کی تو زمین سے انسانی ڈھانچے، ہڈیاں اور انسانی کھوپڑیاں نکلنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ قبرستان ہے اور یہاں کئی انسانی نسلیں مدفون ہیں۔ ہم نے ایک مربع میل تک ادھر ادھر زمین کھود کر دیکھا مگر کہیں بھی مٹی انسانی خون سے پاک نہ ملی۔ آخر مجبور ہو کر وہیں کیمپ کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اردگرد کافی دُور تک کہیں بھی ایسے سایہ دار درخت نہیں تھے جہاں ہم جلتے سورج کے نیچے سر چھپا سکیں۔ اس لیے ہم نے نارمل کھدائی کر کے اسی جگہ کیمپ کیا۔ بعض جوان قبرستان کی بے حرمتی سے پریشان تھے۔ ویسے بھی فوج میں ایسی باتوں پر کم دھیان دیا جاتا ہے۔ یہاں ہمارا کام دین و ایمان کے حکم کو بجالانا تھا۔

شرعی مسائل اور فوجی قانون میں جو تضاد ہے وہ مجھے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا۔ جب میں بھرتی ہو کر سنٹر میں گیا تو پہلے دن پیرک میں جوانوں کے ساتھ سونے کا موقع ملا۔ بدقسمتی سے میری چارپائی جہاں لگی ہوئی تھی اس کی پائنتی مغرب کی طرف تھی۔ اگر میں اس پر لیٹوں تو ٹانگیں مغرب کی طرف ہوتیں۔ گھر پر مجھے بتایا گیا تھا کہ مغرب کی طرف ٹانگیں کر کے لیٹنا گناہ ہے اس لیے میں نے چارپائی کو سیدھا کر لیا۔ اتنے میں استاد کمرے میں داخل ہوا۔ جب اس نے چارپائی کی ڈائریکشن بدلی ہوئی دیکھی تو آگ بگولا ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ کس اُلو کی کارستانی ہے جس نے بیرک کا ڈسپلن خراب کر دیا۔ استاد کو عتاب میں دیکھ کر میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا اور جب ڈسپلن خراب ہونے کا سُنا تو میرے اوسان خطا ہو گئے کہ خدا جانے مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ ایک رنگروٹ نے میری طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا میں نے ڈسپلن خراب کیا ہے۔ اشارہ پاتے ہی استاد نے چیل کی طرح جھپٹ کر میرا کان پکڑ لیا اور پوری قوت سے مروڑتے ہوئے کہا ''الو کی دم آج تیرا پہلا دن اور ڈسپلن کا ستیاناس.....'' میں نے تقریباً درد کی شدت

سے چیختے ہوئے کہا ''استاد جی میں نے کوئی ڈسپلن خراب نہیں کیا۔''

''تو یہ چارپائی تمہارے باپ نے اُلٹی کی ہے؟'' استاد نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میری غلطی کیا ہے۔ میں نے روتے ہوئے کہا ''میں نے چارپائی اُلٹی نہیں بلکہ سیدھی کی ہے۔'' جرأت کر کے میں نے احتجاج کیا کہ مغرب کی طرف ٹانگیں کر کے لیٹنا گناہ ہے۔ استاد نے ایک بھیانک قہقہہ لگاتے ہوئے میرے کان کو جھٹکا دیا تو میں فرش پر لڑھکتا چلا گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں استاد کے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا کہ میرا کان استاد کے ہاتھ میں ہے یا کہیں پھینک دیا ہے۔ بچپن میں آپ کے بھی استاد نے کان مروڑے ہوں گے مگر فوجی استاد کا مروڑا بہت سخت ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔ میں زیادہ سزا کا امیدوار تھا۔ مجھے استاد نے نووارد سمجھ کر معاف کیا اور فوجی لہجے میں لیکچر دینے لگا کہ نادان چھوکرے تمہیں نیا سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔ آئندہ یاد رکھنا کہ یہاں فوج میں ڈریسنگ سے مرنا ہے۔ ڈریسنگ سے جینا ہے۔ سول کی بے ترتیبی چھوڑ دو۔ میں نے فرمانبردار شاگرد کی طرح سر جھکا لیا اور آج تک کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میرے سینئر کو صدمہ پہنچے۔ شاید اسی فرمانبرداری کے طفیل میں بھی آج استاد ہوں۔

بات ہو رہی تھی کہ ہم قبرستان میں کھدائی کر رہے تھے۔ کھدائی کے دوران ایک محیرالعقول واقعہ ہوا۔ چند نوجوان ایک مورچہ کھود رہے تھے کہ اچانک ایک جوان کی کدال ایک کھوپڑی سے ٹکرائی۔ وہ مورچہ میری نگرانی میں کھودا جا رہا تھا۔ جب میں نے بڈی کے چیخنے کی آواز سُنی تو پلٹ کر دیکھا تو نعیم ایک کھوپڑی کو کدال سے کھینچ کر زمین سے باہر نکال رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیاہ ناگ جو تقریباً دو فٹ لمبا ہوگا، پھن پھیلائے کھوپڑی سے نمودار ہوا۔ نعیم بیچارے کو اس نے کمر بھی نہ سیدھی کرنے دی اور ڈس لیا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ سب جوانوں نے سانپ سانپ کا شور مچایا مگر سانپ ندارد۔ آپ یقین جانیں یہ تمام واقعہ تقریباً دس سیکنڈ میں وقوع پذیر ہوا اور میں نے ایک سیکنڈ بھی سانپ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں مگر وہ پھر بھی غائب ہو گیا۔ اسے غائب ہوتے یا یوں سمجھیں کہ ہوا میں تحلیل ہوتے صرف میں نے دیکھا تھا۔ نعیم کو ڈس لینے کے بعد وہ فوراً ایک سیاہ لاٹھی میں بدل گیا پھر لاٹھی کا جم شش جہات میں پھیلنے لگا حتیٰ کہ تقریباً دو مربع میل میں اس کا ایک ہالہ سا بن گیا۔ پھر وہ ہالہ بھی لطیف سے لطیف تر ہونے لگا اور پھر عام فضا اور اس میں کوئی فرق نہ رہا۔ یہ سب کچھ تقریباً ایک سیکنڈ میں ہوا۔ میں اس سحر میں اس قدر کھو گیا کہ نعیم کی سامنے اکڑی ہوئی لاش کا بھی احساس نہ رہا۔ آخر کار ایک جوان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''کیا آپ نے کہیں سانپ کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟'' میں محویت سے نکل آیا۔ اردگرد نظر دوڑائی تو تقریباً یونٹ کے تمام جوان سانپ کی تلاش میں سرگرداں تھے اور کچھ نعیم کی لاش کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس مجمعے میں ایک جوان ایسا بھی تھا جو اس منحوس کھوپڑی کو اٹھائے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے جو کچھ دیکھا، اس کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا کیونکہ مجھے اپنی عقل پر خود شک ہونے لگا تھا۔ نعیم کی موت کو قدرتی حادثہ قرار دے کر لاش اس کے ورثاء تک پہنچانے کا بندوبست ہونے لگا اور میں اس واقعے کو دماغ سے نکالنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ دن بھر ہم نعیم کی موت کا غم دل میں چھپائے

مورچے کھودتے رہے مگر شام کو طوفانِ بادوباراں نے ہماری دن بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا۔

میں نے اپنی زندگی میں اتنا سخت طوفان نہیں دیکھا اور وہ آگ کا شعلہ، آپ اسے آسمانی بجلی سمجھتے ہوں گے مگر بعد کے واقعات نے مجھے اسے ایک بدروح سمجھنے پر مجبور کیا۔ ہم نے خدا خدا کر کے رات کاٹی اور جب صبح ہوئی تو اردگرد پانی ہی پانی تھا۔ ہم اس پانی سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی چیزیں تلاش کر رہے تھے کہ ہم نے ایک گڑھے میں ایک انسانی لاش دیکھی۔ جب ہم نے غور سے اس کا معائنہ کیا تو وہ ہمارے یونٹ کے جوان کی لاش تھی مگر میں نے جب اسے غور سے دیکھا تو میری رگوں میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی کیونکہ یہ لاش اسی جوان کی تھی جس نے کل کھوپڑی اُٹھائی ہوئی تھی اور جب میں نے اردگرد کی جگہ کا غور سے مشاہدہ کیا تو وہ منحوس ہڈیوں کا سر وہیں پر پڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دو سوراخ جو کسی زمانے میں آنکھیں ہوتی ہوں گی، مجھے گھور رہے ہیں۔

میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ مجھ پر خوف کی شدت سے کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ اگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو مجھ سے مختلف آپ کا بھی حال نہ ہوتا۔ میں نے اپنی مردانگی کو للکارا۔ یقین جانیے وہ کاسۂ استخواں میرے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ میں نے بمشکل اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے دل کو راضی کیا۔ دل میں کہا کہ ایک نہ ایک دن مرنا تو ہے، پھر کیوں نہ اس سربستہ راز کو فاش کر دوں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے وہ سر کانپتے ہاتھوں سے اُٹھا لیا۔ اس کو ہاتھ میں رکھتے ہی تمام خوف میری رگ و پے سے کافور ہو گیا اور مجھ پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کیفیت میں نسیم سحر کی طرح یہ خیال آیا کہ یہ کھوپڑی کسی حسین لڑکی کی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ شک یقین میں بدلنے لگا حتیٰ کہ میرا یقین اتنا پختہ ہو گیا کہ سچ مچ کی لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتا اور نہ مجھے ضرورت ہے کہ اس کے یاقوتی ہونٹوں، نرگسی آنکھوں اور قدوقامت پر خامہ فرسائی کروں مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کی آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی اور آپ خیال کریں کہ اس وقت دیکھنے والوں کی نظر میں کتنا مضحکہ خیز لگتا ہوں گا۔ لوگ لاش کے گرد ماتم کناں تھے اور مجھ پر خواہش کے دورے پڑ رہے تھے۔ آخر کار میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کھوپڑی کو ایک جگہ لوگوں کی نظروں سے بچا کر دفن کر دیا تا کہ تنہائی میں اس سے لطف اُٹھا سکوں۔ جب میں نے اس کو اپنے سے جدا کیا تو وہ تصوراتی دوشیزہ کا نشہ بھی کافور ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک عالم سے نکل کر دوسرے عالم میں داخل ہو گیا ہوں۔ حقیقی دنیا سے مجھے نفرت سی ہونے لگی جس میں چاروں طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ جب میں نے دوبارہ لاش کو دیکھا تو خوف نے مزید اپنے پنجے میرے دل میں گاڑھ دیئے کہ ایسے ہی ایک دن میری بھی لاش کسی گڑھے میں تیرتی ہو گی۔

ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ سیاہی سانپ کے ڈسنے سے جاں بحق ہوا ہے۔ اس واقعے کو بھی یونٹ نے قدرتی حادثہ سمجھ کر کفن کا انتظام شروع کر دیا مگر میں تھا کہ جیسے میری رگوں سے کوئی خون چوس رہا تھا۔ میں سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ جب مجھ میں قوت برداشت نہ رہی تو خیال آیا کہ مرنا تو ہے ہی، یوں اذیت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے کیوں نہ ایک حسین تصور میں کھو کر سکون سے مروں۔ ایسا حسین تصور مجھے کھوپڑی کے چھونے ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ آخر جب مجھ میں

ضبط کا یارانہ نہ رہا تو میں تقریباً رات کے دو بجے اپنے بستر سے اٹھا اور جہاں وہ کھوپڑی دفن تھی، اس طرف چل پڑا۔ چاند کی اس دن شاید بیس سے اوپر تاریخ تھی کیونکہ جب میں نے مشرق کی طرف دیکھا تو چاند طلوع ہو رہا تھا۔ وہ چاند افق پر پھیلی ہوئی بدلیوں میں ایسا لگ رہا تھا جیسے خون میں نہایا ہوا ہو۔ ہلکی ہلکی ہوا ایسے چل رہی تھی جیسے کسی کے غم میں سسکیاں بھر رہی ہو۔ مجھے ہر شے کسی کے غم میں نوحہ کناں نظر آ رہی تھی۔ میرے بدن میں آگ لگی ہوئی تھی جیسے میری رگوں میں کسی نے آگ بھر دی ہو۔ میں غیر ارادی طور پر اس کھوپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ جب میں اس بوڑھے آم کے درخت کے پاس پہنچا جہاں دن کو میں نے وہ کھوپڑی دفن کی تھی تو وہاں میں نے اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شبیہہ تھی جو مجھے اس کھوپڑی کو چھونے سے نظر آئی تھی مگر اب اس کی آنکھوں میں دعوت گناہ کی بجائے بے پناہ پیار تھا۔ مجھ پر اس کی نظر پڑتے ہی میری تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور مجھ پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ سیاہ لباس میں بہت ہی حسین لگتی تھی اور آنکھیں جیسے جھیل میں کھلے ہوئے دو کنول ہوں، اور ان میں بے پناہ پیار تھا۔ دل نے شدت سے چاہا کہ اسے بانہوں میں سمیٹ لوں میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ آپ یقین جانیں، اسی وقت میری ماں کی صورت میری آنکھوں میں آ گئی اور میں نے یہ الفاظ صحیح سنے کہ ''بیٹا میں نے تمہیں ایسی تربیت تو نہ دی تھی۔'' میرا سر ندامت سے جھک گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے مارے شرم کے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مارے خوف کے میرے جسم سے خون خشک ہو گیا کیونکہ میرے سامنے ایک سیاہ ناگ اپنا پھن پھیلائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید میری زندگی تھی اس لیے میری زبان پر قرآنی آیات کا ذکر آ گیا۔ میں آیت الکرسی اور قرآن پاک کی آخری دو سورتیں تلاوت کرتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ میرے اس ورد سے وہ سانپ وہیں پر ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا ہوش رہا کہ میں واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں۔ تیسرے دن ہسپتال میں میری آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ میں پورے دو دن بیہوش رہا ہوں۔ تقریباً دو ہفتوں کے بعد ہسپتال سے واپس آیا۔ سب سے پہلے ایک عالم دین کے پاس گیا اور ساری حقیقت سنائی۔ اس نے مجھے تعویذ دیا اور کہا ''بیٹا جہاں چاہو چلے جاؤ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

آج مجھے ان باتوں پر یقین ہے جن کو میں وہم میں بھی نہ لایا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب میں نے اپنی یونٹ کا معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہاں سے پوزیشن بدل کر دوسری جگہ چلی گئی ہے کیونکہ میرے بعد ایک ہی نوعیت کی دو موتیں اور واقع ہوئیں تو ڈاکٹر نے کہا کہ یہاں سے پوزیشن تبدیل کر لیں کیونکہ اس قبرستان میں زہریلے سانپوں کی بہتات ہے مگر سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ جب میں دوبارہ اس جگہ کو دیکھنے کے لیے گیا جہاں میں موت سے دوچار ہوا تھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اسی درخت کے پاس وہ عورت بیٹھی تھی جس پر بجلی گری تھی اور جتنی موتیں واقع ہوئیں سب کی لاشیں اس درخت کے نیچے ملیں۔

یونٹ والے ان سب حادثات کو عام نوعیت کے خیال کرتے ہیں، اور میں بھی ان تمام حالات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود خاموش ہوں کہ اگر ان کا میں نے کسی سے ذکر کیا تو وہ مجھے پاگل نہ کہنے لگیں۔

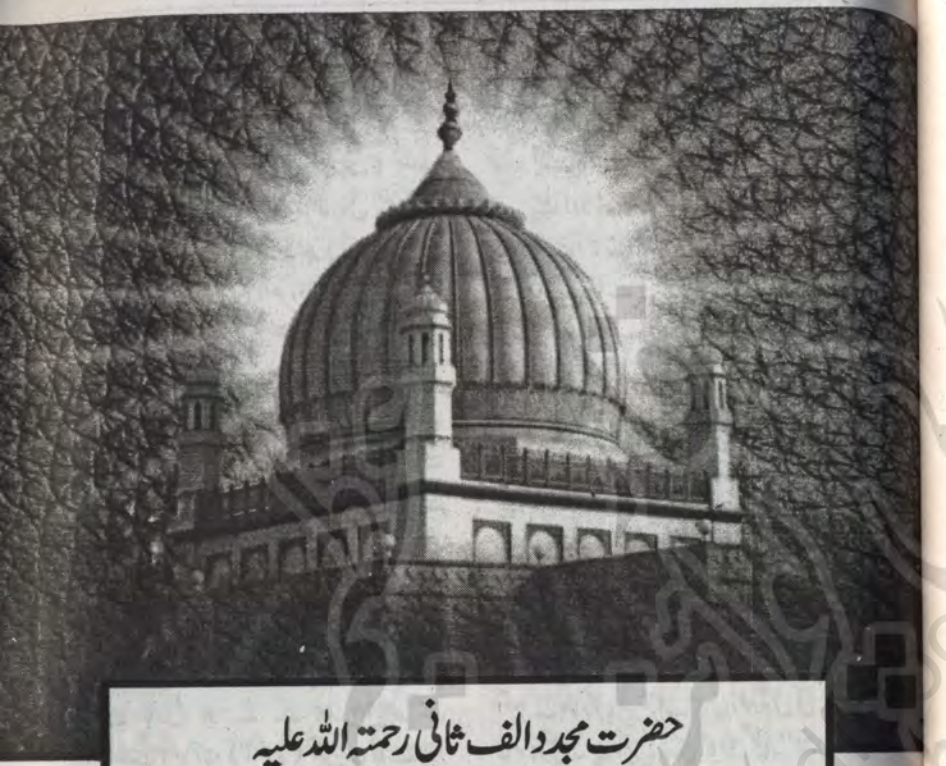

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی اصلاحی اور تجدیدی تحریک

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

حضرت مجدد کی اصلاحی کوششوں کا آغاز اکبر بادشاہ کے عہد حکومت سے ہوا اور جہانگیر بادشاہ کے عہد حکومت میں یہ کوششیں بار آور ہوئیں۔ اسی عہد میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ نے اکبر کے ایک قومی نظریہ کے خلاف دو قومی نظریہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ کفر و اسلام دو علیحدہ حقیقتیں ہیں جو کسی طرح یکجا نہیں ہو سکتیں!

برصغیر پاک و ہند میں بہت سے مفکرین و مجدد دین ہوئے جنہوں نے دین کی سربلندی اور اشاعت کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انہی میں شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانی بھی ہیں جن کی علمی اور روحانی فضیلت کو پاک و ہند کے اکثر علماء و صوفیہ نے سراہا ہے اور اپنی تصانیف میں جا بجا آپ کی کتابوں سے حوالے دیے ہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کے عہد مبارک میں سیالکوٹ کے ایک جلیل القدر عالم مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حضرت مجدد کے نام ایک مکتوب میں اس لقب سے نوازا پھر

یہ لقب زبان زد خاص و عام ہو گیا، حتیٰ کہ آپ کے نام نامی پر غالب آ گیا۔

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کا سلسلہ نسب ۲۹ واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ حضرت مجدد کے چودھویں جدّ سلطان شہاب الدین المعروف فرخ شاہ کابلی والی کابل تھے۔ پانچویں جدّ حضرت امام رفیع الدین شیخ جلال الدین بخاری کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور سہرند (سرہند) آباد کیا۔ اسی شہر میں ۹۷۱ھ میں حضرت مجدد کی ولادت ہوئی۔ حضرت مجدد کے والد کا اسم گرامی شیخ عبدالاحد تھا۔ حضرت شیخ عبدالاحد جلیل القدر عالم و عارف تھے۔

حضرت مجدد نے بیشتر علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔ اسارتِ قلعہ گوالیار کے زمانے (۱۰۲۸ھ/۱۰۲۹ھ) میں قرآن کریم حفظ کیا۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ۹۹۸ھ میں دارالسلطنت اکبر آباد (آگرہ) تشریف لائے اور یہاں دربار اکبری کی دو اہم شخصیتوں یعنی ابوالفضل اور فیضی کے ساتھ صحبتیں رہیں لیکن بعد میں ان دونوں بھائیوں کی بے راہروی کی وجہ سے حضرت مجدد نے کنارا کشی اختیار کر لی۔ حضرت مجدد اپنے والد ماجد شیخ عبدالاحد کے ہمراہ اکبر آباد سے واپس سرہند گئے۔ راستے میں تھانیسر کے شیخ سلطان کی لڑکی سے حضرت مجدد کا عقد ہو گیا۔ شیخ سلطان، اکبر بادشاہ کے مقربین میں تھے۔ اس طرح اہل خانہ کا شاہی دربار سے ایک گونہ تعلق ہو گیا اور تبلیغ و ارشاد کی ایک نئی راہ کھل گئی۔

حضرت مجدد کی اصلاحی کوششوں کا آغاز اکبر بادشاہ کے عہد حکومت ہے ہوا اور جہانگیر بادشاہ کے عہد حکومت میں یہ کوششیں بار آور ہوئیں۔ اسی عہد میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کی اصلاحی کوششوں کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تاریخی پس منظر پیش کر دیا جائے تاکہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

پہلے دور میں اکبر ایک مخلص مسلمان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ دوسرے دور میں فتح پور سیکری میں عبادت خانے کی تعمیر ہوتی ہے، جہاں علمائے اسلام مباحثِ علمیہ میں مصروف نظر آتے ہیں، رفتہ رفتہ یہاں عیسائی پادریوں اور اربابِ عقل کا عمل دخل ہو جاتا ہے اور بات بگڑنے لگتی ہے۔ دوسرا دور تیسرے دور کا نقطۂ آغاز تھا تیسرے دور میں دین الٰہی کا آغاز ہوا اور وہ کچھ ہوا جو نا گفتنی ہے، ہر وہ کام کیا جانے لگا جو اسلام کے سراسر منافی ہے مثلاً کلمہ طیبہ میں اکبر خلیفۃ اللہ پڑھا جانے لگا۔ گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی گئی۔ خنزیر اور کتوں کا احترام ہونے لگا۔ شراب اور جواء عام ہو گیا۔ اکبر نے علماء کو بالجبر شراب پلائی، عورتوں کی بے حجابی عام ہو گئی۔ پردہ پر پابندی لگا دی گئی۔ ''زمین بوس'' کے نام سے سجدہ کا آغاز کیا گیا۔ عالم و عامی سب بادشاہ کے آگے سجدہ ریز ہونے لگے، بعض مساجد ڈھا دی گئیں اور مدارس عربیہ مسمار کر دیے گئے، داڑھیاں منڈوا دی گئیں اور شعائرِ اسلام کا برسرِ عام مذاق اُڑایا جانے لگا اس ساری خرابی میں بعض علمائے دین کی باہمی چپقلش، دنیا سے محبت مختلف ادیان کے علماء کی اکبر سے ملاقات، اکبر کی جہالت و بے علمی، ہندو عورتوں کی حرم شاہی میں شمولیت اور ہندو سیاست کا بڑا دخل ہے۔

عہد شاہجہانی کے ایک اطالوی سیاح نکولس مینوکی نے دین الٰہی کی اختراعات کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر نے سکندرہ میں ایک باغ کے اندر اپنا مقبرہ بنوایا تھا۔ باغ کے دروازے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور

حضرت مریم کی تصاویر تھیں۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت میں ان کو ختم کروایا اور سفیدی پھروادی۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے جب اورنگ زیب شیواجی سے برسرِ پیکار تھا تو باغی اس مقبرے میں گھس آئے، تمام طلائی سامان اور جواہرات لوٹ لئے۔ قبر کھود کر اکبر کی ہڈیاں نکالیں اور ان کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حضرت مجدد نے مندرجہ ذیل تین مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کی۔ (ا) اسلامی حکومت کا قیام، (ب) ہندوؤں سے عدم مفاہمت، (ج) اسلامی ہند کی تعمیر۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے ان مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل شعبوں میں بھرپور جدوجہد کی اور اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ (ا) شریعت و طریقت، (ب) سیاست و حکومت، (ج) معاشرت و معیشت

عوام و خواص شریعت سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ آپ نے اپنے علمی مکالمات اور مکتوبات کے ذریعہ آشنائے شریعت کیا۔ بیشتر صوفیہ طریقت کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر گمراہ ہو رہے تھے آپ نے ان کو طریقت کا واقف کار بنایا۔ سیاست و حکومت میں حضرت مجدد نے جو اہم کارنامہ انجام دیا وہ اکبر کے ایک قومی نظریہ کے خلاف دوقومی نظریہ کا اعلان تھا۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اکبر نے دین الٰہی کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی، اس دین کا مقصد یہی تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کو ملا کر ایک نئی قوم تیار کی جائے، جہاں گیر کی تخت نشینی کے بعد دین الٰہی اپنی موت مر گیا بہرکیف اس الحاد و ارتداد کے خلاف جو زوردار آواز اٹھائی گئی وہ حضرت مجدد الف ثانی کی تھی۔

حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے اکبر کے ایک قومی نظریہ کے خلاف دوقومی نظریہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ کفر و اسلام دو علیحدہ حقیقتیں ہیں جو کسی طرح یکجا نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلے میں آپ نے بہت سے مکتوبات تحریر فرمائے آپ کی کوششیں دورِ جہانگیری میں بار آور ہوئیں اور جہانگیر نے اُمورِ مذہب و سیاست میں مشورہ کے لئے علماء کا ایک کمیشن مقرر کیا۔

اس کے بعد دورِ شاہجہانی اور پھر دورِ عالمگیری میں حضرت مجدد کی مساعی نے اپنا رنگ دکھایا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے دورِ عالم گیری کو حضرت مجدد کی مساعی کا نقطۂ عروج قرار دیا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔

چودھویں صدی ہجری میں امام احمد رضا خاں بریلوی اور ڈاکٹر محمد اقبال نے حضرت مجدد کے دو قومی نظریہ کے احیاء کے لئے سخت جدوجہد کی۔ اس صدی میں دوسرے علماء نے بھی کوششیں کیں مگر ان کی کوششیں مصلحتوں کا شکار ہو کر ایسے نشیب و فراز سے گزریں کہ مؤرخ کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کوششیں خالص اسلام کے لئے تھیں یا مطلق آزادی کے لئے، بہرکیف گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد ہی وہ بطل جلیل نظر آتے ہیں جنھوں نے اسلام اور نظامِ مصطفےٰ کا نعرہ لگا کر خوابیدہ قوم کو بیدار کیا اور ایک نئی روح پھونک دی۔ ڈاکٹر حفیظ ملک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: فی الحقیقت آنے والی نسل کو شیخ احمد نے بے حد متاثر کیا۔ ان کا نعرہ تھا، ''چلو چلو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلو''! مذہبی اور سیاسی حیثیتوں سے یہ نعرہ نہایت ہی دُور رس نتائج کا حامل ہوا۔ ان کی تعلیمات نے معاصر فکر مسلم کو بنیادی طور پر متاثر کیا اور ہندوستان میں مسلم حکومت کو لادینی بنانے کی مخالفت کی۔

ہندوستانی مسلم معاشرے اور معیشت کی اصلاح کے لئے بھی حضرت مجدد نے بھرپور کوشش

کی۔ حضرت مجدد اپنی اسارت کے تینوں ادوار میں منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں، یعنی نظر بندی (۱۰۲۷ھ، ۱۰۲۸ھ) جبکہ آپ ایک سال قلعہ گوالیار میں قید رہے۔ دور پابندی (۱۰۳۳ھ تا ۱۰۳۴ھ) جب آپ تقریباً پانچ سال جہانگیر کے لشکر میں رہے۔ دورِ زباں بندی (۱۰۳۳ھ تا ۱۰۳۴ھ) جب آپ تقریباً چھ ماہ اپنی خانقاہ (سرہند شریف) میں خلوت گزیں رہے اور آخر اسی خلوت گزینی میں ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو وصال فرمایا۔

حضرت مجدد نے اسلام کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔ ایک عزیمت پسندی کی ایسی شاندار مثالیں پیش کی جس سے مُردہ دل زندہ ہوگئے اور ایک عظیم انقلاب آگیا۔ بادشاہ کے حضور سجدہ تعظیمی (زمین بوس) موقوف کر دیا گیا، گائے کی قربانی عام ہوگئی اور سب سے پہلے خود جہانگیر نے قلعہ کانگڑا میں حضرت مجدد کی موجودگی میں گائے ذبح کرائی۔ شراب پر پابندی لگا دی گئی اور بے شمار اصلاحات ہوئیں۔

حضرت مجدد کے عہد مبارک سے لے کر آج تک بے شمار علماء وصوفیہ نے آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن دور جدید کے قارئین کے لیے عقیدت مندوں کا خراجِ عقیدت پیش کرنا زیادہ وزن نہیں رکھتا، اس لئے یہاں صرف ان حضرات کے تاثرات پیش کئے جاتے ہیں جنہوں نے حضرت مجدد کو تاریخ کے آئینے میں دیکھا ہے، جو عقیدت مند وارادت مند نہیں بلکہ مورخ ومحقق ہیں۔

(۱) مشہور مورخ ومحقق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں۔

جہانگیر کے دور حکومت میں شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی آگے آئے، آپ کی مسلسل کوششوں سے تحریک احیائے دین کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس انقلاب وتبدیلی کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جو کوششیں کی گئیں وہ اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درباروں کی بدلتی فضا میں مطالعہ کی جاسکتی ہیں اکبر بادشاہ آزاد خیالی اور الحاد کا نقطۂ عروج تھا، جہانگیر کی تخت نشینی سے اس آزاد خیالی کا زوال شروع ہوتا ہے۔ شاہجہان ایک پارسا مسلمان تھا اور دربار میں کسی قسم کی مذہبی ڈھیل برداشت نہیں کرتا تھا۔ (ترجمہ انگریزی)

(۲) ڈاکٹر محمد یٰسین مغل سیاست پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''دور جہانگیری کی تاریخ لکھتے وقت اگر مغل سیاست پر حضرت مجدد کے اثرات کا کوئی ذکر نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ تاریخ ہی نامکمل رہے۔ (ترجمہ انگریزی) (۳) ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مغل سیاست وحکومت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں: بلاشبہ یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ دور اکبری سے لے کر دور عالمگیری تک حکومت کی مذہبی پالیسیوں میں جو نشیب وفراز آتے رہے وہ بڑی حد تک حضرت مجدد اور آپ کی تعلیمات ہی کی وجہ سے آئے۔ (ترجمہ انگریزی) (۴) ڈاکٹر حفیظ ملک، ڈاکٹر اقبال پر حضرت مجدد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ شیخ (احمد سرہندی) کی عظمت اور جہانگیر بادشاہ کے سامنے سجدہ تعظیمی سے آپ کے انکار کو ڈاکٹر اقبال نے بہت سراہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے آپ نے جو خدمات انجام دیں اُن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے آپ کو ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کا روحانی نگہبان و پاسبان قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جو خطرات اکبر بادشاہ کی مذہبی اور سیاسی بدعات و اختراعات میں پوشیدہ تھے اللہ نے اس سے آپ کو بروقت آگاہ اور خبردار کر دیا۔ (ترجمہ انگریزی)

کھیت میں لاش

نواز خان

کھیت میں لاش

نواز خان

کوئی ایماندار اور باضمیر پولیس انسپکٹر کسی مجرم کو شاباش نہیں دیتا مگر نہ جانے اس مجرم میں ایسی کون سی بات تھی کہ انسپکٹر نواز جیسا پولیس آفیسر بھی اسے شاباش دینے پر مجبور ہو گیا تھا.....!

مظلوم کا ہاتھ ایک نہ ایک دن ظالم کی شہ رگ تک ضرور پہنچتا ہے!

یہ کیس بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوا۔ بعض اوقات بات کوئی بھی نہیں ہوتی اور لوگ بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ میرے تھانے والے گاؤں میں ایک لڑکی بالی تھی۔ بڑی چلتی پھرتی اور تیز طرار۔ گاؤں کے کئی لڑکوں سے اس کا ''سچا پیار'' چل رہا تھا۔ ایک روز صبح سویرے تھانے میں اطلاع پہنچی کہ بلال شاہ اس لڑکی کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بلال شاہ سے مجھے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ بال بچے دار آدمی تھا اور دوسروں کی پرہیزگاری کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں ابھی حیرت میں ڈوبا سوچ ہی رہا تھا کہ گاؤں کے آٹھ دس آدمی غصّے میں تپے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں گاؤں کے نمبردار کا بیٹا بھی تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی اعلان کیا کہ بلال شاہ نے شریفے کی لڑکی سے بُرا بھلا کیا ہے اور بھاگ گیا ہے۔ اس کی چیخیں سُن کر مولا داد اور اس کا بھائی جوی کے کھیت میں پہنچے تو بلال شاہ انہیں دیکھ کر فرار ہو گیا۔ بالی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے اُٹھا کر گاؤں لایا گیا۔

''بالی اور بلال شاہ'' میرا سر چکرانے لگا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ بلال شاہ کی تو اپنی لڑکی بالی کے لگ بھگ تھی۔ میں نے پوچھا ''لڑکی نے کیا بیان دیا ہے؟''

نمبردار کا بیٹا بولا ''وہ تو جی ابھی تک بے ہوش ہے۔ پتہ نہیں بچتی بھی ہے کہ نہیں۔'' وہ سارے کے سارے کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ اگر بلال شاہ نے کچھ نہیں کیا تو وہ بھاگا کیوں؟

میں نے اسی وقت کرسی چھوڑی اور لوگوں کے ساتھ شریفے کے گھر کی طرف چل نکلا۔ شریفہ ایک

لمبا تڑنگا ہندو تھا اور چند ہی برس پہلے مسلمان ہوا تھا۔ مسلمان بھی کیا ہوا تھا بس نام مسلمانوں والا رکھ لیا تھا۔ پیشہ کھیتوں میں مزدوری تھا۔ ہم اس کے گھر پہنچے تو لڑکی ہوش میں آ چکی تھی۔ ان کے گھر رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ عورتیں بلال شاہ کے اگلے پچھلوں کو خاص زنانہ قسم کی گالیاں دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کا غصّہ کچھ اور تیز ہو گیا۔ لڑکی کی ماں چھاتی پر دوہتڑ مار کر بولی۔

''انصاپھ کرنا تھانیدار جی، اب انصاپھ کرنا۔ اب تیری منصپھی کا امتحان ہے۔ ہائے میری لڑکی کہیں کی نہ رہی۔''

میں نے دل میں سوچا ''کہیں کی تو وہ پہلے بھی نہیں تھی۔ پہلے کون سا کام اس نے نہیں کیا۔''

لڑکی سامنے ہی چارپائی پر لیٹی تھی۔ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئی تھی۔ ایک عورت اسے پیالے سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صحن میں تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں، بچے، مرد سب موجود تھے۔ سب کے چہروں پر مصنوعی افسوس اور آنکھوں میں اصلی دلچسپی تھی۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر ان کو باہر نکال دیا اور حوالدار سے کہا کہ صحن کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دے۔ لڑکی ڈری ڈری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا ابھی پھر چیخنے لگے گی۔ میں نے زیادتی کا شکار ہونے والی بہت عورتوں کے چہرے دیکھے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہے۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا لڑکی؟''

اس نے سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ تھرانے لگے۔ اس کی ماں چھاتی کوٹ کر بولی ''چپ کیوں ہے مرن جوگی۔ بولتی کیوں نہیں۔ بتا دے سب کچھ جو بیتا ہے تجھ پر۔''

لڑکی نے پہلے حیرانی سے ماں کو دیکھا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی ''تھانیدار جی ادھر کھیت میں ہا..... ہاتھ..... ہاتھ ہے۔''

''کس کا ہاتھ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ ہکلا کر بولی ''پتہ نہیں جی کوئی لاش پڑی ہے ادھر آپ خود جا کر دیکھ لیں۔ اللہ دی قسمے میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ لڑکی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ وہی کچھ کہہ رہی ہے جو دیکھ کر آئی ہے۔

میں نے زور دے کر پوچھا ''تم نے خود دیکھی ہے لاش؟''

وہ بولی ''نہیں جی۔ میں نے صرف ہاتھ دیکھا ہے۔ باقی سب کچھ مٹی میں تھا۔''

میں نے کہا ''بلال شاہ کا کیا معاملہ ہے؟''

''کون بلال شاہ۔ بلال شاہ..... تو وہاں موجود نہیں تھا۔''

بالی کی ماں چلّا کر بولی ''ہائے ہائے لڑکی کیا اُلٹی سیدھی بک رہی ہے۔ وہ مویا مشٹنڈا تیرے ساتھ.....''

''تم چپ رہو۔'' میں نے ڈانٹ کر بڑھیا کی بات کاٹی اور بالی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ موقع پر چلے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

''نہیں تھانیدار جی! میں نہیں جاؤں گی۔ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گی۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ بابے شفیع کے کھیت میں دوسرے بنے کے ساتھ۔ آپ کو خود ہی نظر آ جائے گا سب کچھ۔''

میں نے اسی وقت حوالدار کو ساتھ لیا۔ گاؤں والے ایک جلوس کی طرح ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ گاؤں سے نکل کر ایک فرلانگ کے فاصلے پر بابے

شفیع کا کھیت آ گیا۔ وہاں جوی لہرا رہی تھی۔ جوی کا بودا کافی اونچا ہوتا ہے۔ ہم کھیت میں داخل ہوئے۔ نمبردار کے لڑکے نے ایک مقام کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ بالی یہاں بے ہوش پڑی تھی۔ وہاں مجھے ایک دو ٹوٹی چوڑیاں بھی نظر آئیں۔ لوگوں نے اشارے سے بتایا کہ بلال شاہ اس طرف سے ہو کر بھاگا تھا۔ کچی زمین پر ابھی تک بلال شاہ کے پاؤں کے نشان موجود تھے۔ میں اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ ہم کوئی پندرہ بیس گز آگے دوسرے بنے پر پہنچے۔ بالی نے اس جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ جلد ہی مجھے وہ منظر نظر آ گیا جسے دیکھ کر بالی بے ہوش ہوئی تھی۔ واقعی خوفناک منظر تھا۔ زمین کے اندر سے ایک مردانہ ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ کلائی اور ہاتھ کے بال مٹی میں سرخ ہو رہے تھے۔ جس نے بھی یہ منظر دیکھا سن ہو کر رہ گیا۔ میں نے لوگوں کو کھیت سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دو سنتریوں نے حوالدار کے ساتھ مل کر بڑی احتیاط سے لاش پر سے مٹی ہٹانی شروع کی۔ یہ کام دس منٹ میں مکمل ہوا۔ اب لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی بُو ہوا کے ساتھ چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ یہ ایک تیس بتیس سالہ صحت مند جوان تھا۔ جسم زیادہ لمبا نہیں تھا مگر گٹھا ہوا تھا۔ پیلی شلوار قمیص اور بغیر بازو کا سرمئی سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ کالے رنگ کی گرگابی تھی۔ یہ سب کچھ کھیت کی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ متوفی کے سر پر بائیں جانب دو زخم تھے۔ ایک زخم جو کنپٹی کے پاس تھا کافی سنگین تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی لاٹھی یا کند آلے سے زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ متوفی کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی تھی۔ لاش کی حالت سے ظاہر تھا کہ اسے دفنائے ہوئے 48 گھنٹے سے اوپر ہو چکے ہیں۔ ایک رات پہلے تیز بارش ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ لاش کا ہاتھ مٹی میں سے نکل آیا تھا۔ اب صورتحال پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لڑکی صبح سویرے کھیت کے اس حصے میں آئی تھی۔ لاش کا ہاتھ دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ شومئی قسمت بلال شاہ بھی کہیں پاس ہی موجود تھا۔ وہ چیخیں سن کر لڑکی کی طرف بھاگا۔ لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ جس وقت وہ لڑکی پر جھکا ہوا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، گاؤں والوں نے دیکھ لیا۔ یہیں سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ انہوں نے بلال شاہ پر شک کیا اور بلال شاہ اس شک کو محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا..... اور خیر سے اب تک بھاگا ہوا تھا۔ مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی اور رونا بھی۔ ہنسی بلال شاہ کی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری پر آ رہی تھی اور رونا اس کی بیوقوفی پر۔

میں نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد لاش اُٹھوائی اور تھانے لے آیا۔ پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ ایک شخص نے متوفی کو پہچان لیا۔ وہ بولا

"یہ راہوالی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام صوفی جمیل ہے۔ شام گڑھ میں کپڑے کی دکان کرتا ہے۔ فوراً ہی چند آدمی رضاکارانہ طور پر راہوالی روانہ ہو گئے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ متوفی کے ورثاء کو لے آئے۔ ان میں تین عورتیں اور چار پانچ مرد تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا اور چیخ مار کر غش کھا گئی۔ دوسری عورتیں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

.....

صوفی جمیل راہوالی کے ایک معزز شخص صادق ارائیں کا بیٹا تھا۔ نمازی، پرہیزگار تھا۔ صوفی اس کا نام نہیں تھا لیکن مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کھیتی باڑی کے علاوہ نزدیکی قصبے میں کپڑے کی دکان بھی کرتا تھا۔ دکان اس کے گھر سے کوئی سات آٹھ میل کی دُوری

پر تھی۔ وہ ہفتے میں دو تین بار وہاں کا چکر لگاتا تھا۔ تین روز پہلے وہ منہ اندھیرے گھوڑی پر سوار دکان پر جانے کے لیے روانہ ہوا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے باوجود واپس نہیں آیا تو اس کا باپ دکان پر گیا۔ دکان کے ملازم لڑکے نے اسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ صوفی تو ادھر پہنچا ہی نہیں۔ باپ بے حد پریشان ہوا۔ بیٹے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ رات کو اس امید پر گھر لوٹا کہ شاید وہ آ چکا ہو مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ دو دن گھر والوں نے سخت پریشانی میں گزارے۔ اس دوران ایک قریبی گاؤں کے کھیتوں سے صوفی کی گھوڑی بھی آوارہ گھومتی ہوئی مل گئی..... گھر میں کل ہی سے رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ آج گھر والوں نے اس کا مرا ہوا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ صوفی کے والد نے بتایا کہ صوفی نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ ایک شادی بچپن میں ہو گئی تھی جبکہ دوسری اس نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ پہلی بیوی اس سے دو سال بڑی تھی جبکہ دوسری دس سال چھوٹی تھی۔ دوسری بیوی بھی ساتھ آئی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس سے سوال جواب کیے۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال ہی ہو گی۔ خاصی خوبصورت تھی۔ رونے دھونے سے چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلی بیوی کے مقابلے میں اسے شوہر کا زیادہ غم ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ ابھی نئی نویلی تھی۔ شادی کو فقط آٹھ دس مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس کا نام عطیہ تھا۔ میں نے کہا۔

''بی بی! تجھے کسی پر شک ہے؟''

اس نے انکار میں جواب دیا لیکن اس کے اندر سے ظاہر تھا کہ یہ جواب آخری نہیں ہے۔ اگر میں زور دوں تو وہ کسی نہ کسی پر شک کا اظہار کر سکتی ہے۔ میں نے کہا ''دیکھ بی بی! تُو مجھے شکل سے سمجھدار لگتی ہے۔ میں نے تیرے شوہر کے قاتل کو ڈھونڈنا ہے اس لیے ہر بات کا جواب ٹھیک ٹھیک دینا۔ گول مول جواب دینے سے کبھی کبھی بندہ خود بھی پھنس جاتا ہے۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے کہا ''تیرے سُسر نے بتایا ہے کہ متوفی کی دوسری شادی اپنی مرضی کی تھی۔ تُو نے اسے پسند کیا تھا یا اس نے تجھے؟''

میری اس بات کے جواب میں عطیہ نے جو کچھ کہا اور اس کے کہے سے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ یہ شادی عطیہ کی پسند کا نتیجہ تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ کپڑا خریدنے کے لیے صوفی جمیل کی دکان پر جاتی تھی۔ صوفی کے اخلاق اور بول چال نے اسے بڑا متاثر کیا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ صوفی کی پہلی بیوی سے بچے تھے اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے عطیہ سے شادی کی حامی بھر لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ چوری چھپے مل کر غیر اخلاقی اور غیر شرعی کام کریں۔ شادی کے بعد عطیہ کے اپنی سوکن سے تعلقات سوکنوں جیسے ہی تھے۔ گھر میں اکثر لڑائی جھگڑا ہو جاتا تھا اور کبھی کبھار نوبت مار کٹائی تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ مار کٹائی زیادہ تر پہلی بیوی کے حصے میں ہی آتی تھی۔ میں نے عطیہ سے پوچھا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قتل میں اس کی سوکن کا ہاتھ ہو۔ وہ پہلے تو خاموش رہی پھر آنسو بہاتی ہوئی بولی ''رسول بی بی کے بھائی ان کو اکثر دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ چند روز پہلے انہوں نے گالی گلوچ بھی کی تھی۔''

عطیہ کے بعد میں نے اس کی سوکن رسول بی بی سے بات چیت کی۔ وہ چونتیس پینتیس سال عمر کی تھی۔ اس کے چہرے پر مظلومیت اور آنکھوں میں آنے والے دنوں کا خوف تھا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو جس کی عمر ڈھائی سال سے زیادہ نہیں تھی، گود میں اُٹھائے ہوئے تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی دیہاتن عورت تھی۔ اس نے وہی باتیں کیں

جو اس کے دل میں تھیں۔ اس نے کہا کہ یہ عطیہ ڈائن بن کر میرے شوہر کو کھا گئی ہے۔ اس نے میرے شوہر پر تعویذ کر رکھے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دونوں عورتوں کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صوفی کے قتل میں اس کی دوسری شادی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ سوکنوں والا جھگڑا ان کے گھر میں ضرور تھا اور یہ بھی درست تھا کہ رسول بی بی کے بھائی متوفی سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے لیکن یہ معاملات اتنے بگڑے نہیں تھے کہ قتل تک نوبت آ جاتی..... اس سے پہلے آپ میرے ایک کیس ''آخری بیوی'' میں اس طرح کے حالات پڑھ چکے ہیں تاہم یہ حالات بالکل مختلف نظر آ رہے تھے..... میں نے متوفی کے والد سے بھی سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ صوفی کا بہت سے لوگوں سے لین دین تھا مگر کوئی ایسا جھگڑا نہیں تھا کہ اتنا بڑا اندھیر ہو جاتا۔ وہ بڑا ملنسار اور میل جول والا شخص تھا۔ اس کے دوست زیادہ اور دشمن کم تھے اور جو تھے وہ بھی اس کی دینداری اور ایمانداری کو مانتے تھے۔

میں نے لاش پوسٹمارٹم کے لیے شہر بھجوا دی اور متوفی کے گھر والوں کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد میں نے رسول بی بی کے بھائیوں کو بلا کر ان سے بات چیت کی۔ جس شخص نے لاش دریافت کی تھی اسے بھی تفتیش میں بٹھایا۔ اس کے علاوہ کھیت کے مالک بابے شفیع سے بھی سوال جواب ہوئے مگر کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

اسی روز شام کو ایک اجنبی شخص بلال شاہ کا رقعہ لے کر تھانے پہنچا۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ بلال شاہ ''موقعہ واردات'' سے بھاگ کر کوئی بیس میل دُور ہوشیار پور جا پہنچا تھا۔ یہ محبت نامہ اس نے وہیں سے لکھا تھا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا تھا کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی کو سانپ وغیرہ نے ڈس لیا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر لڑکی زندہ ہے تو اس سے پوچھا جائے۔ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گی.....''

اس کے علاوہ اس نے ایک رقعہ اپنی بیوی کے نام بھی لکھا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ اس کی نیلی شلوار میں ناڑا ڈال کر ایک گرم چادر کے ساتھ حامل رقعہ ہذا کے ہاتھ بھیج دے۔ اسے ابھی واپس آنے میں ایک دو دن لگ جائیں گے۔

وہ بہت ڈرا ہوا نظر آتا تھا۔ میں اس کی حالت کا تصور کر کے مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ صبح کے وقت وہ ایک اونچی سی دھوتی پہن کر کھیتوں میں جاتا تھا۔ اسی دھوتی کے ساتھ اسے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور وہ بھاگا بھی ایسا تھا کہ سیدھا ہوشیار پور جا پہنچا تھا۔ میں نے پیغام لانے والے کو ایک جوابی رقعہ لکھ کر دیا جس میں بلال شاہ کو اطلاع دی کہ خیر سے مطلع صاف ہو گیا ہے۔ اب وہ گھر واپس آ جائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ میں نے لڑکی کے بیہوش ہونے کی وجہ بتائی اور لاش کی برآمدگی کا ذکر بھی کر دیا تا کہ اسے کچھ تسلی ہو۔ میں نے اپنی گرم چادر اور شلوار قمیص، پیغام لانے والے کو دے دی اور کھانا وغیرہ کھلا کر اور کچھ روپے دے کر اسے واپس بھیج دیا۔

.....

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ متوفی کی موت سر کے زخموں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کنپٹی پر آنے والا زخم جان لیوا تھا۔ متوفی کے جسم پر خراشوں کے نشان تھے اور ایک گھٹنے پر بھی گہری چوٹ تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل اور مقتول کے درمیان جدوجہد ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق قتل پیر کی شب بارہ اور آٹھ بجے کے درمیان ہوا تھا۔ پولیس سرجن نے ''رائے'' کے خانے میں خیال

ظاہر کیا تھا کہ سر کے زخموں کے رُخ اور انداز سے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ضارب نے آلۂ قتل بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ شخص بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہو۔

مکمل رپورٹ پڑھنے کے فوراً بعد میں راہوالی گاؤں روانہ ہوگیا۔ راہوالی میں اس وقت تک مقتول صوفی جمیل کا کفن دفن ہو چکا تھا۔ گھر والوں کے دماغ بھی کچھ پُرسکون تھے۔ میں نے ان سے دوبارہ پوچھ گچھ شروع کی۔ عطیہ نے بتایا کہ اس کے شوہر نے جس دن دکان پر جانا ہوتا تھا وہ صبح بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ سورج چڑھے وہ قصبے سے ہو کر واپس بھی آ جاتا تھا۔

اس قصبے کا نام شام گڑھ تھا۔ راہوالی سے شام گڑھ کوئی سات میل کی دُوری پر تھا۔ گھوڑی پر یہ دو گھنٹے کی راہ تھی۔ راستہ صاف ستھرا تھا۔ اس راستے سے ایک دوسرا راستہ ہمارے گاؤں کی طرف نکلتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے پیر کی اس رات کو مقتول کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اسی راستے پر ہوا تھا۔ وہ اپنی دکان کی طرف جانے کی بجائے ہمارے گاؤں کی طرف مڑ گیا تھا اور کوئی دو میل فاصلہ طے کرنے کے بعد جوی کے اس کھیت تک پہنچا تھا۔ کیا وہ خود وہاں پہنچا تھا یا اسے لایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ہمارے گاؤں کی طرف آیا ہو۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا تھا اور نہ اس کا کسی سے تعلق واسطہ تھا۔ شاید قتل کرنے والا یا کرنے والے اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور وہ جان بچانے کے لیے اس طرف نکل آیا تھا لیکن وہ کون تھے؟ کون ایسا شخص تھا جو اس کے قتل پر آمادہ ہو سکتا تھا؟ کوئی زمین کا تنازع، پیسے کا لین دین، عورت کا معاملہ کچھ بھی واضح طور پر سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میرے پوچھنے پر مقتول کی بیوی عطیہ نے بتایا تھا کہ صوفی کبھی کبھار پوری پانچوں نمازیں پڑھنے لگتا تھا اور کبھی نہیں بھی پڑھتا تھا لیکن ان دنوں صبح کی نماز وہ بڑی باقاعدگی سے پڑھ رہا تھا اور کسی صورت قضا نہیں کرتا تھا۔ میں نے عطیہ سے پوچھا ''اس روز صوفی کتنے بجے گھر سے نکلا تھا، ذرا سوچ کر ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔''

وہ اپنی کلائی کی نئی نویلی سنہری گھڑی دیکھ کر بولی ''میرا خیال ہے جی کہ اس وقت چار بجے تھے۔''

میں نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ صبح کی نماز کے لیے کہاں رُکا ہوگا؟''

وہ بولی ''مجھے کچھ پتہ نہیں جی۔ پر وہ صبح کی نماز کے لیے رُکے ضرور ہوں گے۔''

میں نے متوفی کے باپ سے کہا ''آپ بتائیں بزرگوار، اگر وہ سوا چار بجے یہاں سے نکلا ہو تو صبح کی نماز باجماعت پڑھنے کے لیے کہاں رُکا ہوگا۔''

صوفی کے باپ کا چہرہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا ''تھانیدار جی! راستے میں کچھ نہیں تو دس پندرہ گاؤں تو پڑتے ہوں گے۔ تقریباً ہر گاؤں میں مسجد بھی ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''پھر بھی کوئی اندازہ لگائیں۔''

وہ دل ہی دل میں نماز کے وقت کا حساب کتاب لگا کر بولا ''ہو سکتا ہے ماچھی پورہ یا سادھوکی میں رُکا ہو۔'' اس کے ساتھ ہی بوڑھے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ شاید بیٹے کی کوئی بات یاد آ گئی تھی۔

میں نے گھر والوں سے کچھ اور پوچھ گچھ کی، پھر اپنے اے ایس آئی کے ساتھ ماچھی پورہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ماچھی پورہ کا فاصلہ وہاں سے چار میل تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ماچھی پورہ پہنچے۔ مسجد کے امام صاحب سے ملے۔ ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی مگر وہ صوفی جمیل کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ اس کے بعد ہم سادھوکی گئے۔ سادھوکی کی

ساری آبادی مسلمانوں کی تھی۔ مسجد بھی کافی بڑی تھی۔ مسجد کے امام صاحب سے ملے۔ انہوں نے فوراً ہمارے مطلب کی بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جمیل کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے سرمئی سویٹر اور لال مفلر کا خاص طور پر ذکر کیا۔ انہوں نے کہا ''یہ وہی جوان ہے نا جس کی شام گڑھ میں کپڑے کی ہٹی ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دے دیا۔ وہ بولے ''دو ہفتے میں ایک دو بار ہماری مسجد میں صبح کی نماز پڑھا کرتا ہے۔ وہ گھوڑی مسجد کے باہر باندھ دیتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ بائیں طرف والے کیکر کے ساتھ باندھا کرے۔ بڑا نیک جوان ہے پر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟''

میں نے کہا ''میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ پچھلے پیر اس نے یہاں نماز پڑھی تھی؟ میرا مطلب ہے تقریباً سات آٹھ دن پہلے۔''

مولوی صاحب سر کھجاتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگے۔ پھر بولے ''میرا خیال ہے وہ پیر ہی تھا..... ہاں پیر ہی تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ اس دن ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑی سامنے تندور والی کے چھپیر تلے باندھی تھی..... بوندا باندی ہو رہی تھی نا اس دن؟''

میرے حوالدار نے تصدیق کی کہ اس صبح دیر تک ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔ اب یہ بات طے ہوگئی کہ اپنے قتل کی صبح صوفی جمیل اس مسجد تک پہنچا تھا۔ وہ راستہ جو ہمارے گاؤں کی طرف نکلتا تھا اس مسجد سے کوئی چار فرلانگ کی دُوری پر تھا۔ اس کا مطلب تھا صوفی جمیل کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ اس گاؤں میں پیش آیا یا اگلے چار پانچ فرلانگ کے راستے پر۔

میں نے امام صاحب سے کہا ''محترم! بات یہ ہے کہ صوفی جمیل پیر کی رات قتل ہوگیا ہے اور اس کی لاش یہاں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر پائی گئی ہے۔''

امام صاحب نے حیران ہو کر کہا ''اچھا وہ لاش جو نالے پار کے کھیتوں میں ملی ہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ امام صاحب یہ جان کر ششدر تھے کہ یہ لاش صوفی جمیل کی تھی۔ کچھ دیر اس ناگہانی موت پر بات ہوتی رہی۔ امام صاحب اور گاؤں کے دوسرے ''بڑے'' حیران تھے کہ یہ کام کیسے ہوا۔ میں نے امام صاحب سے پوچھا ''اس رات گاؤں میں کوئی واقعہ ہوا ہو؟ میرا مطلب ہے کوئی چوری چکاری کوئی جھگڑا.....؟''

امام صاحب سوالیہ نظروں سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کے ذہن میں ایسی بات نہیں آئی۔ ایک شخص نے عام سے لہجے میں کہا ''بس چوہدری تلقین مرا تھا اس دن، پیر کی صبح مرا تھا اور منگل کی شام قل ہوئے تھے اس کے۔''

اس شخص کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ گاؤں والے اپنے اپنے ذہنوں پر زور دے رہے تھے پھر ان کا اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ ''چوہدری تلقین'' اسی دن مرا تھا۔

''کیا ہوا تھا اسے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں پتر جی۔ تم غلط سمجھے ہو۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ وہ نشئی تھا۔ صبح سویرے چھپڑ کے کنڈے بیٹھا پیشاب کر رہا تھا کہ اندر جھوک کھا گیا۔ ٹھنڈا پانی تھا اکڑ کر مر گیا۔ صبح دیکھا تو لاش تیر رہی تھی۔''

امام صاحب دبی دبی آواز میں بات کر رہے تھے جیسے ڈر ہو کہ مسجد سے باہر کوئی سُن نہ لے۔

میں نے پوچھا ''یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟''

ایک نمازی بولا ''یہی نماز کا وقت تھا جی۔''

میں نے کہا ''امام صاحب! میں اس معاملے میں کسی طرح کی ڈھیل رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے چوہدری تلقین اور اس کی موت کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔''

جواب میں امام صاحب اور دوسرے نمازیوں نے مل جل کر جو معلومات بہم پہنچائیں ان کا خلاصہ یہ ہے ''چوہدری تلقین اچھا شخص نہیں تھا۔ ہر جوان عورت پر بُری نظر ڈالتا تھا حالانکہ گھر میں تین عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ نشہ پانی بھی کرتا تھا۔ کسی غریب کمزور کی عزت اس کے ہاتھ سے محفوظ نہیں تھی۔ چوہدری تلقین کے چار بھائی اور تھے۔ تلقین سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بڑا بھائی کرم داد بہت شریف آدمی تھا۔ لوگ اس سے خوش تھے مگر اپنے بھائی کے خلاف وہ بھی کوئی بات نہیں سنتا تھا اور یہی چاروں بڑے بھائیوں کی کمزوری تھی۔ وہ تلقین کو روکتے ٹوکتے تو شاید ہوں مگر کسی غریب کی بہن بیٹی کے لیے وہ آپس میں لڑائی کا خطرہ مول نہیں لیتے تھے۔ گاؤں والے چوہدری تلقین سے بہت تنگ تھے۔ شاید ان کی بددعائیں ہی اسے لے ڈوبی تھیں۔''

مجھے یہ معاملہ پراسرار محسوس ہونے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چوہدری کرم داد سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ چوہدری تلقین کے بڑے بھائی کرم داد کو میں جانتا تھا۔ واقعی وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ میں تین چار بار اس سے مل چکا تھا۔ وہ خاصا بارعب شخص بھی تھا۔ مسجد سے اُٹھ کر ہم سیدھے کرم داد کی حویلی میں جا پہنچے۔ کرم داد نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ حویلی کے احاطے میں ہی ہمارے لیے موڑھے رکھوا دیئے اور چائے وغیرہ کا انتظام کیا۔ میں نے کرم داد اور اس کے بھائیوں کو وہ ساری باتیں بتائیں جو مسجد میں امام صاحب سے کہہ چکا تھا۔ چوہدری حیران ہو رہا تھا کہ میں یہ ساری باتیں اسے کیوں بتا رہا ہوں۔ انہیں چوہدری تلقین کی موت کے بارے کسی طرح کا کوئی شک نہیں تھا۔

میں نے پوچھا ''چوہدری! تیرے بھائی کی موت کا واقعہ کتنے بجے ہوا تھا؟''

اس نے کہا ''یہی کوئی ساڑھے چار پانچ کا ویلا تھا۔ کافی اندھیرا تھا ابھی۔''

میں نے کہا ''اور میرا خیال ہے کہ صوفی جمیل کو بھی قریب قریب اسی وقت مارا گیا ہے۔''

وہ سب حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ کرم داد بولا ''تھانیدار! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''چوہدری کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے بھائی کی موت اور صوفی جمیل کے قتل میں کوئی تعلق ہو۔''

وہ سارے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کرم داد نے مری مری آواز میں کہا ''تعلق کیا ہونا ہے جی۔ بس اس کی آئی ہوئی تھی۔ بیمار رہتا تھا۔ شراب اس کی دوائی بن چکی تھی۔ کچھ دن پہلے بھی صبح پیشاب کرنے نکلا تھا تو حویلی کے دروازے میں گر گیا تھا۔''

میں نے کہا ''آپ نے لاش کو غور سے دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی نشان وغیرہ تو نہیں تھا؟''

چوہدری نے انکار میں سر ہلا دیا مگر امام صاحب جو پاس ہی بیٹھے تھے اچانک کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ میری نظروں سے ان کا یہ انداز چھپا نہیں رہا۔ مجھے شک ہوا کہ ان کا جواب چوہدری کے جواب سے مختلف تھا۔ یہ بات میں نے ذہن میں رکھ لی اور چوہدریوں سے مزید سوال جواب کرتا رہا۔ اس کے

بعد میں نے حویلی سے باہر جا کر موقع دیکھا۔ وہ جوہڑ یا چھپڑ جس میں چوہدری تلقین گرا تھا حویلی کے باہری دروازے سے کوئی سو گز دُور تھا۔ کناروں پر اونچی گھاس تھی۔ خمار زدہ شخص کنارہ ڈھونڈنے کی کوشش میں جوہڑ میں گر سکتا تھا تاہم سوچنے کی بات تھی کہ جو شخص سو گز چل کر جوہڑ پر آ سکتا ہے وہ اتنا مدہوش تھا کہ پانی میں گرنے کے بعد باہر نکلنے کی کوشش بھی نہ کر سکا جبکہ جوہڑ کے کناروں کے پاس زیادہ گہرا پانی بھی نہیں تھا۔ میں نے چوہدری کرم داد سے پوچھا کہ کیا وہ لوگ مجھے چوہدری تلقین کے وہ کپڑے دکھا سکتے ہیں جو اس نے پہنے ہوئے تھے۔ چوہدری نے کہا کہ ہمارے رواج کے مطابق مُردے کے کپڑے جلا دیئے جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میں سادھوکی سے واپس آ گیا۔ بہرحال میری تفتیش کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ چوہدری اپنے بھائی کی موت کے بارے میں شک میں پڑ گئے تھے۔

.....

تھانے واپس آیا تو پتہ چلا کہ بلال شاہ اپنی ''جلاوطنی'' کے بعد واپس آ چکا ہے۔ گاؤں پہنچ کر اس نے گاؤں والوں سے خوب خوب لڑائی کی تھی۔ خاص طور پر نمبردار کے لڑکے سے کافی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ میں تھانے پہنچا تو وہ منہ سوجھائے میرے ہی کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی تیوری کچھ اور چڑھ گئی۔ سب کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ دراصل اب وہ اپنے کئے پر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اصولاً اسے موقع سے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ بھاگ کر وہ خوامخواہ گندہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اب سارا معاملہ صاف ہو چکا تھا پھر بھی اس کی شرمندگی نہیں جا رہی تھی۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات تھی۔ بہرحال میں نے سمجھا بجھا کر اسے رام کر لیا اور حوصلہ افزائی کے لیے فوراً ہی ایک کام بھی اس کے سپرد کر دیا۔ میں نے کہا کہ وہ اس وقت سادھوکی چلا جائے اور مسجد کے امام صاحب کو خاموشی کے ساتھ یہاں لے آئے۔

بلال شاہ گیا اور مغرب سے کچھ پہلے امام صاحب کو گاؤں لے آیا۔ امام صاحب نے کہا کہ وہ خود ہی یہاں آنے کا سوچ رہے تھے کیونکہ انہوں نے ایک ضروری بات کرنی تھی۔

میں نے کہا ''مولوی صاحب! مجھے بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے کہا ''آہو پتر جی! اس وقت چوہدری پاس تھے۔ بات میرے منہ میں آتے آتے رہ گئی۔''

میں نے کہا ''تو اب فرما دیجئے۔''

انہوں نے کہا ''پتر جی! میں نے چوہدری تلقین کی میت کو غسل دیا تھا۔ مجھے اس کے جسم پر ایک دو جگہ کچھ نشان سے نظر آئے تھے۔ اس وقت تو میں نے زیادہ غور نہیں کیا پر آج دوپہر کو جب تم نے چوہدریوں سے اس بارے میں بات کی تو مجھے وہ نشان یاد آ گئے۔ ایک نشان تو اس کی ناف سے ذرا اوپر پسلیوں کے پاس تھا۔ گہرا نیل سا تھا۔ دوسرا نشان اس کی گردن پر تھا مگر سامنے کی طرف نہیں پچھلی طرف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے گردن کی دائیں طرف انگوٹھا تھا اور دوسری طرف چاروں انگلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید لاش کو چھپڑ سے نکالتے وقت یہ نشان پڑ گیا ہے مگر اب سوچ رہا ہوں، لاش تو موت کے ڈیڑھ گھنٹے بعد نکالی گئی تھی، اس وقت نشان کیسے پڑ گیا۔''

امام صاحب کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں۔ یہ باتیں میرے شبہ کی تصدیق بھی کر رہی تھیں۔ میں نے کہا ''مولوی صاحب! ذرا سوچ کر ٹھیک ٹھیک بتایئے کہ گردن پر انگلیوں کا نشان کس

طرف تھا اور انگوٹھے کا کس طرف؟''

مولوی صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے دے چکے تھے یعنی..... جہاں تک انہیں یاد پڑ رہا تھا انگوٹھے کا نشان دائیں طرف اور انگلیوں کا بائیں طرف تھا۔

امام صاحب کی بات سے پتہ چلتا تھا کہ متوفی کی گردن پر بائیں ہاتھ کا نشان تھا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تلقین کی موت حادثہ نہیں قتل ہے اور صوفی کے قتل سے اس کا گہرا تعلق ہے..... میں نے امام صاحب سے کہا کہ وہ جا کر چوہدریوں کو بھی یہ نشانوں والی بات بتا دیں تاکہ انہیں خوامخواہ بدگمانی نہ ہو کہ ان سے کچھ چھپایا جا رہا ہے پھر میں نے انہیں شکریہ کے ساتھ واپس بھیج دیا اور خود کوشش شروع کر دی کہ چوہدری تلقین اور صوفی جمیل کے درمیان کسی تعلق کا پتہ چل سکے۔ علاقے کے ایک دو باخبر افراد کو بلایا۔ اس کے علاوہ صوفی کے چند دوستوں اور اس کے والد صادق ارائیں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ صادق ارائیں 'سادھوکی' کے چوہدریوں کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے بیٹے کا 'سادھوکی' کے چوہدریوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ صوفی کے چاروں دوستوں سے بھی ایسے کسی تعلق کا پتہ نہیں چلا۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ صوفی جمیل نے چوہدری تلقین کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہو اور قاتل اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ ان سے جان بچا کر بھاگا ہو اور انہوں نے اسے پکڑ کر ہلاک کر دیا ہو۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی نہ کسی سراغ تک پہنچ جاؤں گا۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی گاؤں میں موجود دو افراد پراسرار طریقے سے مرے تھے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کی موت میں کوئی تعلق نہ ہو۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ 'سادھوکی' کے چوہدری تھانے پہنچ گئے۔ بڑے بھائی کرم داد کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور ان کا ایک منشی رام لال بھی تھا۔ وہ سارے بڑے گم صم اور پریشان تھے۔ میں ان کی پریشانی کی وجہ سمجھ رہا تھا اور مجھے یہ بھی پتہ تھا وہ کیا کہنے والے ہیں۔ کرم داد نے کہا۔

''تھانیدار! تم نے ہمیں بھی شبے میں ڈال دیا ہے اور تمہاری بات ہے بھی ٹھیک، اب مولوی قدیر نے بھی بتایا ہے کہ اس نے تلقین کے پنڈے پر کچھ نشان وغیرہ دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ یہ منشی رام لال بھی ایک بات بتا رہا ہے۔'' پھر چوہدری نے رام لال سے کہا کہ وہ خود ہی بات بتائے۔

رام لال دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے کہا ''تھانیدار جی! چوہدری صاحب کی لاش پہلے میں نے ہی دیکھی تھی۔ اس وقت کافی روشنی ہو چکی تھی۔ چوہدری صاحب کے دیہانت سے ایک دن پہلے شام کے وقت میری عینک کا ایک چھوٹا سا پیچ چھپڑ کے پاس کہیں گر گیا تھا۔ میں صبح صبح حویلی سے نکل کر وہ پیچ ڈھونڈنے لگا۔ اس وقت بڑی باریک سی پھوار پڑ رہی تھی۔ مجھے دو تین جگہ گھوڑے کے سموں کے نشان نظر آئے۔ یہ نشان بالکل تازہ تھے۔ میں نے اس وقت سوچا بھی کہ یہ صبح ہی صبح چھپڑ پر کون آیا ہے۔ پھر میرا دھیان پانی کی طرف چلا گیا اور چوہدری صاحب کی لاش دیکھ کر میں سب کچھ بھول بھال گیا.....''

منشی رام لال کی اطلاع ایک خاص طرف اشارہ کر رہی تھی۔ صوفی جمیل گھوڑی پر سوار تھا اور یہ عین ممکن تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر وہ جوہڑ کی طرف آیا ہو۔

میں نے چوہدری کرم داد سے کہا ''چوہدری! میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا بھائی

اپنی موت نہیں مرا۔ اسے مارا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مارنے والے نے بڑی صفائی سے کام کیا ہے اور کوئی شہادت نہیں چھوڑی۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ اس کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ وہ سب پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا نام لیں۔ چوہدری تلقین ایسا شخص تھا جسے کوئی بھی قتل کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں کتنی بددعائیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں مگر کچھ بھی تھا جرم جرم تھا اور قاتل یا قاتلوں کا قانون کی گرفت میں آنا ضروری تھا۔ ان کے گرفت میں آنے سے ہی صوفی جمیل کی موت کا معمہ حل ہو سکتا تھا۔ میں نے صاف لہجے میں کہا۔

''چوہدری کرم داد! مجھے یقین ہے کہ تمہارے بھائی کو ڈبو کر مارا گیا ہے۔ اس کی گردن پر انگلیوں کے نشان یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی گردن دب کر پانی میں غوطے دیئے گئے ہیں۔''

اپنے بھائی کی اذیت ناک موت کا تصور کر کے چوہدریوں کے چہرے مرجھانے لگے۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ میں نے پوچھا۔

''پچھلے دنوں اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا؟'' کرم داد نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہا ہے..... چوہدری سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ مزید گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو چوہدری تلقین کے گرد ہی گھومتی رہی۔ تلقین کے ایک بھائی کا خیال تھا کہ اس کی قبر کھلوا کر پوسٹ مارٹم کروایا جائے جبکہ دوسرے بھائی ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صوفی جمیل کے والد سے بھی ملے اور اس سے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے رہے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس پر شک کریں اور کس پر نہ کریں۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ کسی پر پرچہ کرانا چاہتے ہیں تو کرا دیں مگر انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ اچانک میں نے ایک بات نوٹ کی اور بُری طرح چونک گیا۔ چوہدری کرم داد کا بڑا بیٹا جس کا نام سراج احمد تھا بائیں ہاتھ کا استعمال کرتا تھا۔ وہ مجھے چہرے سے بھی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے دائیں کان پر ایک لمبی سی خراش تھی اور کھرنڈ آیا ہوا تھا، جیسے چند روز پہلے چہرہ کسی دیوار یا زمین سے رگڑ کھا گیا ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدری تلقین کی قبر کھلوانے کی بات ہوئی تھی تو سراج نے ہی زیادہ مخالفت کی تھی اور اس سے پہلے جب میں نے کرم داد سے متوفی تلقین کے کپڑے مانگے تھے تو سراج نے ہی بتایا تھا کہ انہیں آگ لگائی جا چکی ہے۔ مجھے سراج پر کچھ شک سا ہونے لگا۔ مجھے ان لوگوں کے اندرونی معاملات کا زیادہ علم نہیں تھا لیکن قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ قتل چچا بھتیجے کی کسی اندرونی دشمنی کا نتیجہ ہو۔ میں نے باتوں باتوں میں چھوٹے چوہدری سراج سے چند سوال پوچھے جن کے اس نے بظاہر تسلی بخش جواب دیئے۔ میرا شک اس پر مدھم پڑنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر چوہدری کرم داد سے کہا کہ اگر وہ کسی پر پرچہ کرانا چاہتے ہیں تو کرا دیں مگر وہ ایک روز کی مہلت چاہتے تھے۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تینوں بڑے چوہدری اندر سے بھرے ہوئے ہیں اور یہاں سے نکلتے ہی سیدھا اس شخص کی طرف جائیں گے جس پر انہیں سب سے زیادہ شک ہوگا لہٰذا جونہی مجھ سے اجازت لے کر وہ تھانے سے باہر نکلے میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کر دیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور اس کام کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے اپنی ذاتی سائیکل نکالی اور بڑی ہوشیاری سے چوہدریوں کے تانگے کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اس کانسٹیبل نے اپنی رپورٹ مجھے اگلے روز صبح

سویرے پہنچائی۔ وہ ساری رات اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ چوہدری کرم داد کا تانگہ پہلے حویلی پہنچا۔ حویلی میں کرم داد کوئی دو گھنٹے تک رہا پھر وہ اپنے تانگے پر سوار ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس کے دو بھائی اور دو کارندے بھی ساتھ تھے۔ گاؤں سے نکل کر یہ لوگ کچے راستے پر آئے اور ماچھی پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے اور سردی کی وجہ سے پورا علاقہ سنسان نظر آ رہا تھا۔ تانگہ ماچھی پورہ پہنچا اور سیدھا چوہدری رحیم شاہ کے گھر جا کر رُکا۔ ماچھی پورہ کا چوہدری رحیم شاہ باہر آیا اور گلے مل کر کرم داد سے ملا۔ پھر وہ سارے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دو بکلوں والے بندے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ کانسٹیبل اپنی جگہ چھپا کھڑا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہی بکلوں والے بندے ایک نوجوان کو ساتھ لے کر حویلی میں داخل ہو گئے۔ نوجوان کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ اس موقع پر میرے کانسٹیبل نے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ حویلی کے اندر گھسنے کی وہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ حویلی سے باہر رہ کر کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اتنے میں قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اچانک حویلی کے اندر سے شور سنائی دیا اور پھر دو تین آدمی کسی کو پیٹتے ہوئے باہر نکلے۔ دراصل مار کھانے والا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ حویلی سے باہر نکلتا مارنے والے اسے پھر کھینچ کر اندر لے گئے۔ یہ وہی نوجوان تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک بوڑھی عورت روتی ہوئی حویلی کے دروازے پر پہنچی، اس کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ وہ تینوں اندر چلے گئے۔ کافی دیر اندر رہنے کے بعد وہ باہر نکلے تو ایک مرد نے اپنی کمر پر اسی نوجوان کو اُٹھا رکھا تھا جو تھوڑی دیر پہلے مار سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ کانسٹیبل نے ہوشیاری سے ان کا پیچھا کیا اور گھر دیکھ لیا۔ وہ ماچھی پورہ کی لوہاروں والی گلی میں تیسرا یا چوتھا مکان تھا۔

میں نے اس روز شام تک انتظار کیا مگر چوہدری کرم داد اور اس کے بھائیوں میں سے کوئی بھی تھانے نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا وہ اپنے بھائی کے قاتل سے خود نپٹنا چاہ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ جس کسی پر بھی شبہ کر رہے تھے اس کا نام تھانے میں بتانا نہیں چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا اس طرح ان کا کوئی اپنا راز فاش ہو جاتا۔

اسی رات میں خود ماچھی پورہ پہنچ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ اوپر سے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ میرے ساتھ وہی کانسٹیبل تھا جس نے کل رات سارا ماجرا دیکھا تھا۔ ہم کوئی دس بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ پورا گاؤں سویا پڑا تھا۔ ٹھنڈی یخ ہوا میں آوارہ کتے بھی کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک بڑے مکان کے دروازے پر پہنچ کر میرا کانسٹیبل رُک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی لاٹھی سے دستک دی۔ چوتھی پانچویں دستک پر دروازے کی دوسری جانب لالٹین کی روشنی نظر آئی اور کسی مرد نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا کون ہے؟''

میں نے کہا ''میں تھانیدار ہوں۔ نواز خاں۔ دروازہ کھولو۔''

غالباً وہ میری آواز پہچانتا تھا۔ بغیر حیل و حجت کے دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ کانسٹیبل نے فوراً کہا ''جناب، کل یہی زخمی منڈے کو کمر پر لاد کر لایا تھا۔''

وہ سخت گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا ''حوصلہ رکھ بھائی تیری مدد کے لیے آئے ہیں۔ تجھے ڈرانے کے لیے نہیں.....''

وہ چونک کر بولا ''آیئے.....آیئے جناب دھن ہمارے بھاگ کہ آپ نے قدم رکھا ہے۔''

صحن سے گزار کر وہ ہمیں ایک کشادہ کمرے میں لے آیا۔ ساتھ والے کمرے سے عورتوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سامنے ہی کچے برآمدے میں چھپروں تلے آٹھ دس بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور ان کے گوبر کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دو اور آدمی بھی تھے جو کچی نیند جاگے تھے اندر آ گئے اور ادب سے مصافحہ کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان تینوں میں آگو یعنی سیانا وہی شخص تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام سردار محمد بتایا۔ باقی دونوں میں سے ایک اس کا بہنوئی تھا دوسرا بھائی تھا۔ میں نے سردار محمد سے پوچھا ''وہ لڑکا کہاں ہے جسے کل چوہدریوں نے مارا ہے؟''

سردار محمد آنکھوں پر صافہ رکھ کر رونے لگا۔ بولا ''وہ اُٹھنے کے قابل ہی کہاں ہے جی۔ مار مار کر اس کی ہڈیاں کھوچلی کر دی ہیں ظالموں نے۔''

میں نے کہا ''تم لڑکے کے کیا لگتے ہو؟''

وہ بولا ''ہم دونوں ماموں ہیں اس کے۔ یہ اس کا باپ ہے۔''

میں نے کہا ''تم نے رپورٹ کیوں نہیں کرائی؟''

وہ بولا ''جی ہماری طاقت نہیں ہے۔''

کتنی سیدھی سادی بات کی تھی اس نے۔ دُور دراز دیہات میں ''طاقت'' کے بغیر کون رپورٹ درج کرا سکتا ہے۔ وہاں رپورٹ درج کرانے کا مطلب اعلان جنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے کہا ''بات کیا ہوئی تھی؟''

وہ بولا ''جناب! آپ پوچھ رہے ہیں ہم آپ کی رعایا ہیں بتانے سے انکار نہیں کر سکتے مگر اس کے بعد ہمارا والی وارث کون بنے گا؟ پچھلا تھانیدار.....''

میں نے کہا ''گھبراؤ نہیں اور پچھلے تھانیدار کی باتیں بھی چھوڑو، ہر ایک نے اپنی قبر میں جانا ہے۔''

وہ حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ غالباً سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے جو ماں بہن کی گالیوں کی بجائے قبر حشر کی باتیں کر رہا ہے۔ آنسو پونچھ کر وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب! ہم بے قصور مارے جا رہے ہیں۔ آج کے دور میں کمزور ہونا بھی جرم ہے۔ چوہدری کرم داد کے بھائی نے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے اور اس کی موت کے بعد اب رہی سہی کسر کرم داد خود پوری کر رہا ہے۔ کل میرے بھتیجے حسین محمد کو انہوں نے اتنا مارا ہے کہ کوئی کسی کالے چور کو کیا مارے گا۔ ہم روتے پیٹتے وہاں نہ جاتے تو شاید اسے جان سے ہی مار ڈالتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے چوہدری تلقین کو پانی میں ڈبو کر مارا ہے۔ میں مسجد میں جا کر قرآن اُٹھا سکتا ہوں کہ پچھلے دو ہفتے سے وہ بیچارہ گھر سے ہی نہیں نکلا۔ جب سے تلقین کے بندوں سے ہاتھا پائی ہوئی ہے اس کی ماں نے اسے گھر میں قید رکھا ہے۔''

میں نے کہا ''سردار محمد! اس طرح کوئی بات میرے پلے نہیں پڑے گی۔ مجھے شروع سے بتاؤ کہ یہ کیا واقعہ ہے اور کب شروع ہوا۔''

سردار محمد نے اپنے بہنوئی یعنی حسین محمد کے باپ سے کہا کہ وہ اپنی زبانی سب کچھ بتائے۔ حسین محمد کا باپ بالکل سیدھا سادہ سکہ بند دیہاتی زمیندار تھا۔ اس نے بڑی سادگی سے کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی کافی پرانی بات ہے۔ میرا چھوٹا بھائی خان محمد اپنے بیٹے کے لیے میری بیٹی کا رشتہ مانگتا تھا۔ دراصل اس کی نظر اس چار ایکڑ زمین پر تھی جو میری بیٹی کے حصے آنی تھی۔ لڑکا اس کا کچھ کرتا شرتا نہیں تھا بس پکی سڑک پر سائیکلوں کی دکان ہے

اس کی۔ آٹھ دس ٹوٹی بھجی سائیکلیں ہیں جنہیں کرائے پر چلاتا شلاتا ہے۔ میں یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پر وہ کہتا تھا کہ ہمارا باپ مرتے ہوئے یہ رشتہ جوڑ گیا ہے۔ آخر میں نے صاف انکار کر دیا۔ خان محمد اور اس کے بیٹے نے یہ بات دل میں رکھی اور موقع کی اڈیک میں رہے۔ اصل میں خان محمد کا اُٹھنا بیٹھنا چوہدری تلقین کے ساتھ تھا۔ اسی نے خان محمد کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ تم زبردستی یہ رشتہ کر لو۔ دو ماہ پہلے 'سادھوکی' میں ایک شادی تھی۔ میری بیٹی بھی وہاں گئی ہوئی تھی۔ خان محمد بھی وہاں آ گیا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے اپنے گھر لے گیا۔ اسی وقت مولوی بلا کر اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ میری دھی کا نکاح پڑھوا دیا۔ ہمیں دوسرے روز پتہ چلا کہ ہماری لڑکی کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ ہم وہاں گئے تو چوہدری تلقین کے آدمی ڈانگیں سوٹے لیے کھڑے تھے۔ خان محمد نے کہا کہ اس نے کُڑی شڑی کوئی نہیں دینی۔ اس کی شادی ہو گئی ہے، وہ اب ادھر ہی رہے گی۔ ہماری لڑائی شروع ہو گئی۔ پانچ چھ بندوں کے سر پاٹے۔ چوہدری تلقین نے رائفل نکالی اور کہا کہ ہم بھاگ جائیں ورنہ وہ ایک ایک کو گولی مار دے گا۔ ہم واپس آ گئے۔ کوئی دس پندرہ دن بعد حسین محمد کے خون نے جوش مارا اور وہ آٹھ دس بندے لے کر بہن کو چھڑانے کے لیے چلا گیا مگر چوہدری تلقین کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اس نے گولی چلا دی۔ دو بندے پھٹل ہوئے۔ حسین محمد کو بھی چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد ہم نے حسین محمد کو گھر سے ہی نہیں نکلنے دیا..... کل رات ہمارے چوہدری رحیم شاہ کے دو بندے آئے اور حسین سے کہنے لگے کہ اسے چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔ ہماری بلا کو پتہ تھا کہ وہاں تلقین کے بھائی بھی آئے ہوں گے۔ حسین چلا گیا تو کچھ دیر بعد چوہدری رحیم شاہ کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے آ کر بتایا کہ حویلی میں تلقین کے بھائی بھی آئے ہوئے ہیں اور وہ سب مل کر حسین محمد کو مار رہے ہیں۔''

حسین محمد کے باپ نے سب کچھ بتا دیا تو میں نے حسین محمد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حسین کے ماموں نے دوسرے کمرے میں جا کر عورتوں کو کسی ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا اور ہمیں حسین کے پاس لے گیا۔ حسین محمد کھدر کی رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ پاس رکھی ایک لالٹین جل رہی تھی اور تپائی پر کچھ حکیمی دوائیاں پڑی تھیں۔ حسین ایک بیس بائیس سالہ خوش شکل نوجوان تھا مگر اس وقت چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ بائیں آنکھ نیلی ہو کر سوجی ہوئی تھی۔ ماتھے پر بھی پٹی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے بات چیت شروع کی۔ اس نے قسمیں کھائیں کہ چوہدری تلقین کی موت سے اس کا کوئی تعلق نہیں..... لیکن اس کی ایک بات مجھے شبے میں ڈال گئی۔ وہ کہنے لگا۔

''تھانیدار صاحب! آپ تصدیق کرا سکتے ہیں کہ جس رات چوہدری تلقین مرا میں یہاں سے اٹھارہ میل دُور اپنی پھوپھی کے گاؤں میں تھا.....''

تھوڑی دیر پہلے حسین کے ماموں اور باپ نے کہا تھا کہ جب سے چوہدری تلقین وغیرہ سے جھگڑا ہوا ہے حسین کو اس کی ماں نے گھر سے ہی نہیں نکلنے دیا اور اب لڑکا خود کہہ رہا تھا کہ وہ واردات کے وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں چونکہ اچانک یہاں آیا تھا، اس لیے لڑکے اور لڑکے کے ماموں کے بیان آپس میں نہیں مل رہے تھے۔ میں نے حسین سے اس کی پھوپھی کے گاؤں کا اتہ پتہ پوچھا اور کچھ دیگر سوال کیے۔ اس دوران میں نے حسین سے اس کی بہن کے بارے میں بھی بات چیت کی۔ وہ رونے لگا اور بولا ''ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے جی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں ہم۔''

میں نے حسین کے ماموں سے کہا کہ وہ لوگ صبح تھانے آ کر پرچہ درج کرائیں۔ میں تفتیش کرتا ہوں اور اگر ان کا دعویٰ درست نکلا تو میں لڑکی کو برآمد کرالوں گا..... اتنے میں ایک عورت باتیں سن رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا وہ حسین کی ماں تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بس تھانیدار جی! اب اس بات کو یہیں رہنے دیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب جتنی مٹی اُڑے گی ہمارے ہی سر میں پڑے گی۔ اس بدنصیب کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب یہی دعا ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش رہے۔'' پھر اس نے اپنے بھائیوں اور شوہر کو مخاطب کر کے کہا ''میں تمہارے آگے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب اس بات کو اور نہ بڑھاؤ۔ بیٹی تو گئی ہی ہے اب میرے پتر کی جان کے لیے بھی کوئی سیاپا نہ ڈال دینا.....''

حسین نے آنکھوں آنکھوں میں ماں کو جھڑک کر اشارہ کیا کہ وہ باہر چلی جائے۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ حسین کے باپ نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ حسین کی آنکھوں میں غصے کی لالی آ گئی ہے۔ پتہ نہیں ماں کو روتے دیکھ کر ایسا ہوا تھا یا اسے ماں کی باتوں سے اختلاف تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ پرچہ درج کرانا نہیں چاہتے۔ جب تک پرچہ درج نہ ہوتا میں کارروائی کیسے کر سکتا تھا۔

میں حسین کے پاس سے اُٹھ کر جانے ہی والا تھا جب ایک چیز نے مجھے پکڑ کر بٹھا دیا۔ حسین نے تپائی پر رکھا ہوا ایک گلاس اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی ''کھبو'' ہے یعنی بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔

.....

دوپہر کا وقت تھا۔ میں تھانے میں بیٹھا دو پارٹیوں میں راضی نامہ کرا رہا تھا مگر میرا دماغ وہیں صوفی جمیل کے قتل کیس میں اُلجھا ہوا تھا۔ رہ رہ کر حسین محمد کا چہرہ ذہن میں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا چہرہ بھی تھا اور وہ تھا کرم داد کے بیٹے سراج کا۔ اس وقت یہی دونوں چہرے زیادہ مشکوک تھے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ یہ دونوں افراد کھبو بھی تھے، جسمانی لحاظ سے وہ دونوں صحت مند بھی تھے اور اتنے طاقتور ضرور تھے کہ چوہدری تلقین جیسے نشئی کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کر سکتے۔ خاص طور پر سراج کے لیے تو ایسا کرنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ یہاں میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ سراج حالانکہ کرم داد کا بیٹا تھا لیکن یہ نہ سمجھیں کہ وہ کوئی نوجوان شخص تھا۔ اس کی عمر کم از کم اڑتیس سال تھی۔ کرم داد کی اپنی عمر تقریباً ستر برس تھی..... میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح چچا بھتیجے یعنی تلقین اور سراج کے کسی اندرونی معاملے کی ٹوہ لگ سکے مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اسی دوران بلال شاہ نے ایک بڑا اہم کام انجام دیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ہوشیار پور سے واپسی کے بعد وہ بڑا شرمندہ شرمندہ پھرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اپنی شرمندگی دُور کرنے کے لیے وہ کسی طرح نمبر بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ 'سادھوکی' میں مقیم تھا۔ سادھوکی میں میں نے اسے امام صاحب کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، امام صاحب کے گھر میں ہی اس نے اپنی ایک چاچی ڈھونڈ لی تھی۔ کہتا تو یہی تھا کہ وہ میری رشتے کی چاچی ہے۔ بہرحال نہیں بھی تھی تو اس کے لیے ایک آدھ چاچی بنا لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جب وہ کسی کو چاچی بنانے پر آ جاتا تھا تو پھر اس کی جان چاچی بن کر ہی چھوٹتی تھی۔ اس دفعہ اس نے امام صاحب کی ایک سالی کو چاچی بنایا تھا۔ یہ ایک علیحدہ قصہ ہے جس کا اس کیس سے تعلق نہیں،

میں آپ کو بلال شاہ کی رپورٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس نے مقامی لوگوں میں گھل مل کر دو بڑی اہم باتیں معلوم کی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس نے ایک کاشتکار کا کھوج لگایا تھا جس نے پیر کی صبح صوفی تلقین کو اپنی گھوڑی پر سوار ہمارے گاؤں کی طرف مڑتے دیکھا تھا۔ اس کاشت کار کا نام لیٹین تھا اور اس کا کھیت راستے کے عین اوپر تھا۔ لیٹین کو بلال شاہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ اس نے جو بیان درج کرایا وہ یہ ہے۔

''میرا نام لیٹین ولد نذیر علی ہے۔ میرا کھیت نمبرداروں کے ٹیوب ویل کے سامنے کچے راستے کے اوپر ہے۔ پیر مورخہ بیس دسمبر کی صبح منہ اندھیرے میں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ میں نے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سُنی۔ دیکھا تو ایک گھوڑے والا تھا۔ وہ گھوڑے کو شمالے کے کھیت کے اندر سے بھگاتا ہوا بائیں طرف والے راستے پر مڑ گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک اور بھاگتے گھوڑے کی آواز آئی۔ یہ گھوڑا سیدھا میرے کھیت کے اندر سے چلا آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے والے کو للکارا مگر وہ میری بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے سیدھا نکل گیا۔ وہ پاس سے گزرا تو میں نے اس کی سفید گھوڑی پہچان لی۔ وہ راہوالی کا صوفی جمیل تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھی صبح کے وقت میرے کھیت کے سامنے سے گزرا کرتا تھا..... میں سمجھ گیا کہ وہ آگے جانے والے گھڑسوار کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں چلا وہ دونوں کدھر گئے۔ تیسرے دن خبر ملی کہ نالے پار کے گاؤں سے کوئی لاش ملی ہے۔ اس وقت میرے دماغ میں بالکل نہیں آیا کہ یہ صوفی جمیل کی لاش ہوگی۔ صرف دو دن پہلے مجھے پتہ چلا ہے کہ اس رات صوفی جمیل قتل ہوا تھا۔''

اس بیان کی آخری سطریں درست نہیں تھیں کیونکہ لیٹین نامی یہ شخص تیسرے روز ہی صوفی جمیل کے قتل سے باخبر ہو گیا تھا مگر پولیس تفتیش اور گواہوں وغیرہ کے خوف سے اس نے تھانے آ کر بیان دینے کی کوشش نہیں کی تھی..... اب یہ بلال شاہ کی حکمت عملی تھی کہ اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیٹین نامی اس شخص کا بیان بہت اہم تھا۔ اب تک ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ اگر صوفی جمیل، چوہدری تلقین والے واقعے کی وجہ سے قتل ہوا ہے تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اس نے چوہدری تلقین کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہوگا، بعد میں قاتلوں نے گواہی ختم کرنے کے لیے اسے بھی مار ڈالا ہوگا مگر اس بیان سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ قاتل صرف ایک تھا، اور قاتل نے صوفی کا پیچھا نہیں کیا تھا بلکہ صوفی اس کے پیچھے گیا تھا۔

لیٹین کے بیان کے علاوہ جو دوسرا کھوج بلال شاہ نے لگایا وہ خاصا اہم تھا۔ اس نے پتہ کیا تھا کہ اپنی موت سے تین روز پہلے، صبح سویرے حویلی کے سامنے چوہدری تلقین نے ایک نوجوان کو مارا پیٹا تھا۔ یہ نوجوان لڑکا چنگڑوں کے قبیلے کا تھا۔ صبح چوہدری تلقین پیشاب کرنے کے لیے حویلی کے دروازے سے نکلا تو یہ لڑکا حویلی کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ چوہدری تلقین نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تُو چوری کرنے کی نیت سے پھر رہا ہے۔ چوہدری کی آواز سن کر اس کے تین چار کارندے بھی آ گئے۔ انہوں نے چانن نامی اس لڑکے کو خوب مارا اور کپڑے وغیرہ پھاڑ دیئے۔ یہ لڑکا اکثر گاؤں میں نظر آتا رہتا تھا مگر جب سے چوہدری قتل ہوا ہے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اب معلوم نہیں وہ مار پیٹ کی وجہ سے غائب ہوا ہے یا کوئی اور معاملہ ہے۔

یہ معاملہ توجہ طلب تھا۔ بلال شاہ کے بیان کے

مطابق جنگڑوں کی وہ بستی 'سادھوکی' گاؤں سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے اسی وقت اپنے ایس آئی کو چار سپاہیوں کے ساتھ بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ لڑکے کو لے آئیں..... کافی انتظار کرنا پڑا۔ ایس آئی تقریباً چار گھنٹے بعد واپس آیا۔ لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ ایس آئی نے بتایا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے لڑکے کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ لاپرواہی سے بیٹھ گیا اور ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کافی اجڈ سا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر تمیز سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میرے لہجے سے اس نے بڑا معمولی اثر قبول کیا۔ اس کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی۔ جسم مضبوط تھا۔ پنڈلیوں تک لمبی قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ ایک کان میں سونے یا پیتل کی مرکی تھی۔

میں نے پوچھا ''تمہارا نام؟''

''چانن..... نخی بادشاہ۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''وہی جو ہمارے پیو دادا کا کام ہے۔ کوڑا اکٹھا کرتے ہیں نخی بادشاہ اور کیا کرنا ہے؟''

میں نے اس جواب کی وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ وہ کوڑے کے ڈھیروں میں سے کام کی چیزیں اکٹھی کرتے ہیں۔ بعد میں اپنے سردار کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ اس سردار کو وہ لوگ ''بھاٹیا'' کہتے تھے۔ غالباً سادھوکی میں بھی چانن کا آنا جانا اسی 'کاروبار' کے سلسلے میں تھا۔

میں نے پوچھا ''تم بھاگے کیوں؟''

وہ بولا ''نخی بادشاہ! میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بڑی سے بڑی قسم لے لیں مجھ سے۔ میں مسلمان ہوں۔ مسجد میں لے جائیں مجھ کو۔''

میں نے کہا ''چوہدری تلقین سے تیری کیا بات ہوئی تھی؟'' پہلے تو وہ بالکل انجان بن گیا پھر سمجھ گیا کہ ہم جانتے ہیں اور چھپانا فضول ہے۔ اس نے اپنے انداز میں ساری بات بتا دی اور کہا کہ وہ کبھی کبھی صبح سویرے ہی کام پر نکل جاتا ہے۔ سویرے سویرے کوڑے سے اچھی چیزیں مل جاتی ہیں۔ اس روز بھی وہ جھولا ڈالے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ چوہدری بادشاہ نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم چوری کی نیت سے ہو.....

میں نے چانن کی ہتھکڑیاں کھلوا دیں اور ادھر ادھر کے تفتیشی سوال کرنے لگا۔ میں نے پوچھا ''تمہارے پاس گھوڑا کہاں سے آیا ہے؟''

''کک..... کون سا گھوڑا؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''سنا ہے تمہارے پاس گھوڑا بھی ہے؟''

''کون سا گھوڑا جی۔ کہیں آپ میرے ابے کے کھوتے کو تو گھوڑا نہیں کہہ رہے؟''

میں نے کہا ''اچھا جاؤ وہ سامنے میز سے میری چھڑی اُٹھا کر لاؤ۔'' میرا خیال تھا چھڑی کے نام پر وہ گھبرا جائے گا مگر اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے چھڑی لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ عام لوگوں کی طرح داہنا ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔

میں نے کوئی ایک گھنٹے تک اس سے مغزماری کی۔ حکمت اختیار کی۔ ڈرایا دھمکایا بھی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آخر میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی لیکن یہ بتا دیا کہ وہ زیرِتفتیش ہے۔ مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا اور جب بھی میں سنتری بھیجوں اسے فوراً آنا ہوگا۔ بھاگنے کے جرمانے کے طور پر میں نے اس سے پورے تھانے کی صفائی کروائی تاکہ اسے کچھ نصیحت ہو۔

.....

دس پندرہ دن مزید گزر گئے۔ تفتیش کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ قتل ہوئے ہیں اور دونوں قتل ایک ہی آدمی نے کئے ہیں مگر وہ آدمی کون ہے؟ کرم داد کا بڑا بیٹا سراج احمد؟ زبردستی بیاہے جانے والی لڑکی کا بھائی حسین محمد؟ اکھڑ مزاج چانن..... یا کوئی اور؟ میں نے ابھی تک کوئی گرفتاری نہیں کی تھی اور ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے یہ کیس داخل دفتر ہونے والا ہے لیکن صورتحال اس کے برعکس تھی۔ میں نے تینوں مشکوک افراد سراج، حسین اور چانن پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو افراد زیر مشاہدہ تھے۔

بلال شاہ ابھی تک 'سادھوکی' میں اپنی 'چاچی' کے گھر میں تھا۔ چاچی پر اس نے کوئی ایسا جادو کر رکھا تھا کہ وہ اسے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ تو بلال شاہ کے بال بچوں کو بھی اپنے پاس بلانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر جب اسے بلال شاہ کے بچوں کی تعداد کا پتہ چلا تو جذبات تھوڑے سے سرد ہو گئے تھے۔ میں نے بلال شاہ کے ذمے کام لگایا کہ وہ سادھوکی میں چوہدری سراج اور ماچھی پورہ میں حسین محمد کی حرکات وسکنات پر نظر رکھے۔ سادھوکی اور ماچھی پورہ کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا اور بلال شاہ چاچی کے گھر کی روٹی ہضم کرنے کے لیے دو تین چکر بخوشی لگا سکتا تھا۔

چنگڑ چانن بھی مشکوک افراد کی فہرست میں تھا۔ تفتیش کے دوران اس نے میرے سوالوں کے جواب بڑے اعتماد سے دیئے تھے۔ ویسے بھی وہ کھبو نہیں تھا مگر اس پر میرا شک کم نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا ہمارا یہ اندازہ غلط ہوتا کہ قاتل ایک ہی شخص ہے۔ اس صورت میں واردات کے وقت چانن کا کوئی کھبو ساتھی بھی اس کا شریک ہوسکتا تھا..... اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہمارا یہ مفروضہ ہی صحیح نہ نکلے کہ قتل کرنے والا کھبو ہے۔ اندھیرے کا پردہ چاک ہونے تک کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا اور تفتیش کرنے والے کو بارہا ایسی گھمن گھیریوں سے گزرنا پڑتا ہے..... میں نے چانن کی نگرانی کے لیے ایک خاص مخبر کا انتظام کیا۔ یہ شخص ضلع جالندھر کا ایک اصلی چنگڑ تھا اور پولیس کے لیے کام کرتا رہتا تھا (ایسے قبیلوں میں مخبری کرنے والا بڑی مشکل سے ہی ملا کرتا ہے)۔ اس کا نام دلبر تھا۔ میں نے دلبر کو تمام ضروری ہدایات کے ساتھ سادھوکی کے نواح میں چنگڑوں کی اس بستی میں بھیج دیا۔ اس نے سردار سے مل کر کسی نہ کسی طرح بستی میں رہنے کا انتظام کرلیا۔

.....تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ دوسرے کیسوں کے ساتھ ساتھ اس کیس کی تفتیش بھی جاری رہی۔ میرے تھانے کے دو قبرستانوں میں دو قبریں بن چکی تھیں۔ ایک قبر ایک شریف، دین دار شخص صوفی جمیل کی تھی اور دوسری ایک بدنام چوہدری تلقین کی۔ پیر کی اس ابر آلود رات کو ان قبروں کے لیے مُردوں کا انتظام کرنے والا شخص کون تھا؟ اس کا کھوج لگانا میری ذمہ داری تھی۔ بلال شاہ وقتاً فوقتاً مجھ سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر چوہدری کرم داد کی طرف سے حسین محمد پر کوئی زیادتی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دے۔ حسین محمد کی دکھیاری ماں کے آنسو مجھے نہیں بھولے تھے۔ اگر اس کا بیٹا مجرم بھی تھا تو کسی چوہدری کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اسے خود سزا دے۔ میں نے یہی بات کرم داد کے کانوں سے بھی اچھی طرح گزار دی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ حسین محمد کی بہن سے اس کے سُسرال میں بُرا سلوک نہیں ہونا چاہیے..... میرا دوسرا مخبر دلبر بھی رات کے اندھیرے میں رازداری سے آکر اپنی خیر خبر دے جاتا تھا۔ میں نے مشکوک افراد کو مکمل طور پر ڈھیل دے رکھی تھی اور ان کی

طرف سے بالکل لاتعلق ہوگیا تھا۔ تاہم ایک روز میرے نہ چاہنے کے باوجود چانن چنگڑ سے میری ملاقات ہوگئی۔ میرا اے ایس آئی کتے لڑانے کے الزام میں چند لڑکوں کو پکڑ کر لایا۔ ان میں چانن بھی تھا۔ شرطوں کے سارے پیسے بھی اس کے پاس تھے۔ اصولی طور پر پرچہ اس کے خلاف ہونا چاہیے تھا مگر میں نے دوسرے دو لڑکوں پر پرچہ کر دیا اور چانن کو باقی ساتھیوں سمیت جانے کی اجازت دے دی۔ اس سنگین کیس میں چھوٹ جانے پر چانن خوش خوش واپس چلا گیا۔

اس واقعے کے صرف 24 گھنٹے بعد میرا مخبر دلبر چنگڑوں کی بستی سے ایک اہم خبر لے کر آیا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ دلبر ایک کمبل کی بکل مارے میرے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کل کسی وقت میری چانن سے ملاقات ہوئی تھی؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا اور تفصیل سے مجھے خبر سنانے لگا۔

اس نے کہا ''نواز صاحب! کل رات میں چانن اور ایک لڑکی دُلاری کی بات چیت سننے میں کامیاب رہا ہوں۔'' (دلبر اس سے پہلے مجھے بتا چکا تھا کہ چانن کی قبیلے ہی کی ایک لڑکی پھولاں سے شادی ہو رہی ہے۔ دُلاری کے بارے بعد ازاں پتہ چلا کہ وہ پھولاں کی گہری سہیلی ہے) دلبر نے کہا ''کل رات کوئی آٹھ بجے میں نے چانن کو بستی سے نکل کر ایک طرف جاتے دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کماد کے کھیتوں میں پہنچا۔ یہاں وہ لڑکی دُلاری بھی آگئی۔ دونوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ساری آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ دُلاری اپنی سہیلی پھولاں کا کوئی پیغام لے کر آئی ہوئی تھی۔

اس نے چانن سے کہا ''پھولاں تیرے لیے بڑی پریشان تھی۔ جب تک تُو تھانے سے واپس نہیں آ گیا وہ روتی ہی رہی۔ کیوں تُو نے ایسا کام کیا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے وہ تھانیدار پہلے ہی تیری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔''

جواب میں چانن ہنسنے لگا۔ اس نے آپ کے لیے بڑے غلط سلط لفظ استعمال کئے اور کہنے لگا ''وہ تھانیدار اتنے جوگا نہیں کہ چانن پر ہاتھ ڈال سکے۔ ایسے تھانیداروں کے تو میں سری پائے پکا کر کھا جاؤں۔''

پھولاں کی سہیلی بولی ''اس نے تجھ سے پہلے والی بات تو نہیں کی۔''

چانن بولا ''اتنا دماغ نہیں ہے اس کا اور وہ کرتا بھی تو میں نے کون سا کچھ بتانا تھا۔ لوہے کے صندوق جیسا ہے اپنا سینہ، جو اس میں بند ہوگیا..... ہوگیا۔''

دُلاری نے کہا ''دیکھ چانن! پھولاں نے تجھے اپنی قسم دی ہے کہ اب سارے دھندے چھوڑ دے پلس ایک بار جس کا گھر دیکھ لے اسے اتنی جلدی نہیں بھولتی۔ یہ نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔''

چانن بولا ''اپنی سہیلی سے کہہ کہ جگرا ذرا بڑا رکھے۔ اسے چانن سے نباہ کرنا ہے کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے نہیں۔'' ..... اس کے بعد وہ دونوں شادی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے اور پھر چلے گئے۔''

دلبر چنگڑ کی رپورٹ اس کیس کی اہم ترین رپورٹ تھی۔ اس نے چانن اور دُلاری کی گفتگو کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ چنگڑوں کی اس جھونپڑا بستی میں کوئی زبردست کھچڑی پکی ہوئی ہے حالانکہ دلبر کو بستی میں رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا اور وہ خاصا ہوشیار بھی تھا مگر اسے بستی کے اندرونی معاملات کی زیادہ خبر نہیں ہونے دی گئی تھی۔ یہ چنگڑ لوگ رازداری کے معاملے میں اپنے سگے باپ پر بھی

اعتبار نہیں کرتے اور جو بستی کی بات باہر پہنچاتا ہے اسے سردار کی طرف سے سخت سزا دی جاتی ہے۔

مجرم کی گرفتاری میں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب براہ راست قدم اٹھانا چاہیے۔ دلبر کی رپورٹ کے مطابق چانن کی گرفتاری ضروری ہو گئی تھی مگر میں نے چانن کی بجائے پہلے دُلاری پر ہاتھ ڈالا۔ اسے تھانے پہنچانے کا کام دلبر نے ایک اے ایس آئی کے ساتھ مل کر کیا۔ اسے معلوم تھا دُلاری اپنے کار کے لیے کس طرف جاتی ہے (کوڑے سے اشیاء اکٹھی کرنے کو وہ لوگ 'کار' کہتے تھے)۔ وہ اپنے کار پر نکلی تو دلبر اور اے ایس آئی سادہ لباس میں اس کے پیچھے تھے۔ جونہی وہ کار کرتے کرتے اپنی دو ساتھیوں سے علیحدہ ہوئی انہوں نے اسے پکڑ لیا اور سیدھا تھانے لے آئے..... تھانے پہنچ کر دُلاری کا خوف سے بُرا حال ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ بڑے بھرپور جسم کی لڑکی تھی۔ اپنی میلی کچٹ کھلی کھلی قمیص کے اندر اس نے جوبن کا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ یہی خزانہ کسی امیر عورت کے حصے میں آیا ہوتا تو اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے۔ مجھے اس بیچاری کی حالت پر ترس آ رہا تھا مگر اپنے فرض سے مجبور تھا۔ میں نے اسے تھانیداری انداز میں مار پیٹ کی دھمکی دی تو وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ میں نے دلبر کو اس کے سامنے کر دیا اور کہا۔

''دیکھ لڑکی! یہ پولیس کا آدمی ہے۔ کل اس نے تیری اور چانن کی ساری بات سُن لی ہے۔ اب تم لوگوں کی کوئی بات راز نہیں رہی۔ اپنی جان بچانے کا تیرے پاس ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنی زبان سے ساری باتوں کا اقرار کر لے۔'' وہ رونے لگی اور اپنے بھائیے یعنی سردار کو پکارنے لگی۔ میں نے کہا ''بھائیے کی جان کو مت رو۔ اسے بھی تیرے سامنے ہی چھتر پڑیں گے۔''

آدھ پون گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے دُلاری کو زبان کھولنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے رُک رُک کر اور آنسو بہا بہا کر جو کہانی سنائی وہ میں مختصر آپ کو بتا دیتا ہوں۔ اس کہانی سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ خانہ بدوش قبیلوں کی اندرونی دنیا ہماری دنیا سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ ہماری بستیوں کے پاس رہتے ہوئے بھی وہ درحقیقت ہم سے کتنی دُور ہوتے ہیں۔

''پھولاں ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ ان کا قبیلہ پانچ چھ سال سے سادھوکی کے نواح میں رہ رہا تھا۔ دو سال پہلے کی بات ہے چوہدری تلقین کے ایک دودھ پیتے بچے کو دستوں کی شکایت ہو گئی۔ کسی حکیم نے کہا کہ اسے صرف بکری کا دودھ پلایا جائے۔ اتفاق سے گاؤں میں ایک بھی دودھ والی بکری نہیں تھی۔ بکری کی تلاش میں چوہدری کے آدمی چنگڑوں کی بستی تک پہنچ گئے۔ یہاں پھولاں کے باپ کے پاس دودھ والی بکری تھی۔ پھولاں کا چھوٹا بھائی روز دودھ لے کر حویلی آنے لگا۔ ایک روز سخت بارش ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ پھولاں کو لے لیا۔ بہن بھائی بھیگے ہوئے حویلی میں پہنچے جہاں ڈیوڑھی میں چوہدری تلقین شراب کے نشے میں دھت بیٹھا تھا۔ پھولاں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ دونوں بہن بھائی دودھ دے کر واپس جانے لگے تو اس نے لڑکے کو دودھ کے پیسے دینے کے لیے دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ وہ ریزگاری لے آئے۔ لڑکا چلا گیا تو وہ کتا بن کر پھولاں پر جھپٹ پڑا اور ڈیوڑھی کے ساتھ ایک تاریک کمرے میں اس کی عزت کا دامن تار تار کر دیا۔ پھولاں عزت لٹا کر واپس چلی گئی۔ یہ بات کب تک چھپی رہتی۔ پوری بستی میں مشہور ہو گئی۔ لٹیرا کوئی عام شخص ہوتا تو جھونپڑا بستی والے اس کے ٹکڑے کر دیتے مگر وہ تھا چوہدری تلقین جس کی پشت پناہی اس کے چار بھائی بھی کرتے تھے۔ اس پر

ہاتھ ڈالنے کا مطلب پانچ چوہدریوں سے ٹکر لینا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جھونپڑا بستی والے اپنا ڈیرہ اُٹھا کر ایک اور گاؤں کے نواح میں چلے گئے۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلے مگر پھولاں کے دل کا زخم وقت کے مرہم سے مندمل نہ ہو سکا۔ وہ اپنی بستی کی سب سے دلکش لڑکی تھی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے کہا کہ وہ چوہدری تلقین کو قتل کر دے۔ اس کا منگیتر اب بھی اس پر فدا تھا مگر اسے حاصل کرنے کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے چوہدری تلقین کو قتل کرنے سے انکار کیا تو پھولاں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ اس نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ اپنا آپ اس مرد کے حوالے کرے گی جو تلقین کو قتل کرے گا ورنہ ساری عمر ایسے ہی بیٹھی رہے گی۔ اس بستی میں اس کا ایک خاموش عاشق بھی تھا۔ اس کا نام چانن تھا وہ پھولاں سے تین چار سال چھوٹا تھا مگر عشق ذات پات، عمر اور خاندان کے فرق کو کب دیکھتا ہے۔ چانن نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ پھولاں کے سر سے چوہدری تلقین کی گالی ضرور اُتارے گا۔ وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ یہ ایک لمبی روئیداد ہے کہ وہ اس موقع تک کیسے پہنچا۔ بالآخر اس نے چوہدری تلقین کو جالیا اور پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔

دُلاری اس قتل کی تمام تفصیلات جانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ پیر کی اس رات کو چانن چوہدری تلقین کی گھات میں بیٹھا تھا۔ وہ پیشاب کرنے کے لیے جوہڑ کے کنارے بیٹھا تو اس نے اسے اندر دھکا دے دیا اور بعد میں ڈبو کر مار ڈالا۔ دُلاری نے یہ بھی بتایا کہ چانن نے اس واردات کے لیے ایک قریبی گاؤں سے گھوڑا چرایا تھا۔ میں نے دُلاری سے پوچھا ''چانن نے اور کچھ نہیں بتایا؟ میرا مطلب ہے چوہدری تلقین کو مارنے کے بعد وہ کہاں گیا؟''

دُلاری نے کہا ''اس کے بعد اس نے کھولا ہوا گھوڑا واپس چھوڑا اور بستی میں آ گیا۔''

میں سمجھ گیا کہ چانن کے دوسرے قتل کے بارے میں دُلاری کو بھی علم نہیں۔ دُلاری بُری طرح رو رہی تھی۔ ہچکیوں سے اس کا سینہ ایسے دہل رہا تھا جیسے سمندر میں طوفان مچل رہا ہو۔ وہ چانن کا انجام اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''چانن اور پھولاں کی شادی کب ہو رہی ہے۔''

دُلاری نے جواب دیا کہ ان کا بندھن تو ہو چکا ہے بس سہاگ رات گزارنی باقی ہے۔ سہاگ رات کے لیے اس نے کوئی عجیب سا لفظ استعمال کیا تھا جو میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔ ان لوگوں کے کچھ اپنے ہی رسم و رواج تھے۔

میں نے پوچھا ''کب ہے ان کی سہاگ رات۔''

وہ روتے ہوئے بولی ''کل۔'' پھر اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''تھانیدار صیب! وہ ایک دوسرے سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بنا مر جائیں گے۔ بڑا انتظار کیا ہے انہوں نے اس ویلے کا۔ ان کو معاف کر دیں۔''

مجھے اس لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے رو رہی تھی اور بڑے درد سے رو رہی تھی۔

میں نے کہا ''تُو اس کا فکر کیوں کر رہی ہے۔ وہ تو بڑا شیش ناگ ہے اسے مجھ جیسا تھانیدار بھلا کہاں پکڑ سکتا ہے، کل یہی کہا تھا نا اس نے؟''

وہ کوئی جواب نہ دے سکی اور مسلسل روتی رہی۔

میں کچھ دیر گہری سوچ میں رہا..... آخر میں نے کہا ''دُلاری! صرف ایک صورت میں وہ اپنی سہاگ رات منا سکتے ہیں۔ تُو کل تک اپنی زبان بند رکھ۔

میرے آدمی ہر وقت تمہاری بستی کے پاس موجود ہیں۔ اگر تُو نے زبان کھولی اور چانن نے بھاگنے کی کوشش کی تو فوراً پکڑا جائے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسی جگہ گولی کھا کر مر جائے۔ ہاں اگر تُو کسی کو کچھ نہ بتائے اور جیسے آئی ہے ویسے ہی واپس چلی جائے تو میں چانن کو کل تک کی مہلت دے سکتا ہوں..... جو بات یہاں ہو رہی ہے وہ صرف تیرے اور میرے درمیان رہنی چاہیے۔"

دُلاری نے کراہ کر کہا "تھانیدار صیب! کیا چانن کی جان بچ نہیں سکتی؟"

میں نے کہا "اس کا پتہ مجھے نہیں عدالت کو ہے۔ میں جو ڈھیل دے رہا ہوں یہ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ بہرحال اگر تُو چپ رہ سکتی ہے تو بتا ورنہ میں اپنا کام پورا کروں۔"

وہ میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ رضامندی بھی نظر آرہی تھی۔

.....

.....اور پھر چانن کی سہاگ رات گزر گئی۔ وہ بھی پیر کی رات تھی جب چانن نے نہایت سفاکی سے دو قتل کئے تھے اور یہ بھی پیر کی رات تھی۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے اپنا گھوڑا درختوں کے ایک جھنڈ میں روکا۔ یہاں میرا سب انسپکٹر ست نام سنگھ اپنے عملے کے ساتھ موجود تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چنگڑوں کی بستی نظر آرہی تھی۔ ان کے کتے بھونک رہے تھے اور مرغے بانگیں دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر سب انسپکٹر کے پاس کھڑا صورتحال دریافت کرتا رہا۔ جب گھڑی نے ٹھیک ساڑھے پانچ بجائے تو میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور عملے کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا۔ ہمارا منجر دلبر جاگ رہا تھا۔ اس نے دُور ہی سے چانن کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر دیا۔ جھونپڑے سے باہر ایک بانس سے لالٹین لٹک رہی تھی اور کچھ جھنڈیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ ایک بولی کتا بھی زنجیر سے بندھا غرا رہا تھا۔ میں نے جا کر جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسری تیسری دستک پر چانن باہر نکلا۔ اس نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ یکا یک اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ مجھے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ جونہی وہ بھاگا میں نے بھاگ کر اسے عقب سے زور دار دھکا دیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں کئی قلابازیاں کھا گیا۔ میرے سب انسپکٹر اور حوالدار نے لپک کر اسے چھاپ لیا۔ وہ انہیں بڑی زبردست قسم کی گالیاں دینے لگا اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں جھونپڑے کے دروازے سے وہ لڑکی بھی چیختی ہوئی برآمد ہوگئی جو اس سارے واقعے کا مرکزی کردار تھی یعنی پھولاں۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر وہ واقعی خوبصورت تھی۔ اس نے چولی گھاگرا پہن رکھا تھا۔ ایکا ایکی ساری بستی جاگ اُٹھی اور اس شور میں چانن کی بکواس دب کر رہ گئی۔

چانن کو تھانے لایا گیا۔ اگلے دن اس کا ریمانڈ مل گیا۔ دو تین روز میں اس نے سب کچھ بک دیا۔ چوہدری تلقین کے قتل کے بارے میں تو میں دُلاری کی زبانی سن ہی چکا تھا۔ صوفی جمیل کے بارے میں چانن نے بتایا کہ جب وہ تلقین کو ٹھکانے لگانے کے بعد پانی سے نکل رہا تھا، سفید گھوڑی والے (جمیل) نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا 'اوئے کون ہے؟' چانن دوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بھاگ نکلا۔ جمیل نے بھی گھوڑے کی کاٹھی سنبھالی اور اس

مرحبا شربت فولاد

SINCE 1975

خون کی کمی اور عام کمزوری کے لئے ایک عمدہ ٹانک

اچھی صحت کے لیے معدنی اجزاء نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اور بدن کو ان کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے اہم معدنی اجزاء کی طرح فولاد (آئرن) ایک ناگزیر ضرورت کا حامل عنصر ہے۔ جس پر صالح خون اور توانا بدن کا دارومدار ہے۔ فولاد کا معدنی جز خون بناتا اور صاف کرتا ہے۔ اس کی روزانہ ضرورت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرد کو روزانہ 28 ملی گرام، عورت کو 30 ملی گرام، حاملہ عورت کو 38 ملی گرام اور بچے کو 26 سے 40 ملی گرام تک فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خون کے سرخ ذرات مخصوص پروٹین اور فولاد سے بنتے ہیں۔ اور سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بدن کی پرورش اور انسانی زندگی کے لئے فولاد ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کا روزانہ خوراک میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔

فولاد بیماریوں کے خلاف مزاحمت کرتا اور توانائی کی نشوونما کرتا ہے۔ لہٰذا فولاد کا روزانہ حصول ہی صحت کا ضامن ہے انسانی صحت اور زندگی کی ان ضرورتوں کے پیش نظر **مرحبا** لیبارٹریز نے نباتاتی اجزاء پر مشتمل شربت فولاد بنایا ہے جو بدن میں فولاد کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ اُن تمام اعضاء کو صحت مند اور فعال بناتا ہے جو فولاد کے معدنی اجزاء کو ذخیرہ کرتے اور انہیں جزو بدن بناتے ہیں۔

بدن میں فولاد کی کمی کی وجوہات اور علامات

فولاد کا بدن سے اخراج بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً انفیکشن، ادویات اور کیمیکلز کا زیادہ استعمال، خون کے زیادہ بہنے، اندرونی اعضاء کے متاثر ہونے، اسقاط حمل، حیض میں زیادہ خون آنے، بار بار حمل ٹھہرنے، زیادہ عرصہ تک بچے کو دودھ پلانے، گرمیوں میں بے تحاشا پسینہ بہنے سے فولاد کی کمی ہو جاتی ہے۔ فولاد کی کمی کے باعث تھوڑی سی محنت مشقت پر سانس پھول جانا، چہرے کا رنگ زرد ہونا، جنسی کمزوری غالب آجانا، چڑچڑے پن کا شکار ہو جانا، ڈیپریشن کا عود آنا، بیماریوں کے خلاف مزاحمت میں کمی ہو جانا، نڈھال اور بے سکون رہنا ایسی علامات پائی جاتی ہیں۔

مرحبا شربت فولاد کی خصوصیات

- جگر معدہ اور اعصابی نظام کو درست کرتا ہے۔
- چہرے کی چھائیاں اور زردی کو ختم کر کے چہرے پر شادابی لاتا ہے۔
- جسم میں توانائی اور چستی بڑھاتا ہے۔
- بھوک بڑھاتا اور ہاضمہ کا عمل تیز کرتا ہے۔
- جوڑوں کے درد رفع کرتا ہے اور دل کی دھڑکن اعتدال پر لاتا ہے۔
- وضع حمل کے دوران خواتین کو جسمانی کمزوریوں سے بچاتا ہے۔

مرحبا لیبارٹریز 142-مین انڈسٹریل اسٹیٹ کوٹ لکھپت لاہور۔ پاکستان
فون نمبر: 5118679-5156068 E-mail: info@marhaba.com.pk

میرے آدمی ہر وقت تمہاری بستی کے پاس موجود ہیں۔ اگر تُو نے زبان کھولی اور چانن نے بھاگنے کی کوشش کی تو فوراً پکڑا جائے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسی جگہ گولی کھا کر مر جائے۔ ہاں اگر تُو کسی کو کچھ نہ بتائے اور جیسے آئی ہے ویسے ہی واپس چلی جائے تو میں چانن کو کل تک کی مہلت دے سکتا ہوں.....

جو بات یہاں ہو رہی ہے وہ صرف تیرے اور میرے درمیان رہنی چاہیے۔''

دُلاری نے کراہ کر کہا ''تھانیدار صیب! کیا چانن کی جان بچ نہیں سکتی؟''

میں نے کہا ''اس کا پتہ مجھے نہیں عدالت کو ہے۔ میں جو ڈھیل دے رہا ہوں یہ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ بہرحال اگر تُو چپ رہ سکتی ہے تو بتا ورنہ میں اپنا کام پورا کروں۔''

وہ میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ رضامندی بھی نظر آرہی تھی۔

.....

.....اور پھر چانن کی سہاگ رات گزر گئی۔ وہ بھی پیر کی رات تھی جب چانن نے نہایت سفاکی سے دو قتل کئے تھے اور یہ بھی پیر کی رات تھی۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے اپنا گھوڑا درختوں کے ایک جھنڈ میں روکا۔ یہاں میرا سب انسپکٹر ست نام سنگھ اپنے عملے کے ساتھ موجود تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چنگڑوں کی بستی نظر آرہی تھی۔ ان کے کتے بھونک رہے تھے اور مرغے بانگیں دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر سب انسپکٹر کے پاس کھڑا صورتحال دریافت کرتا رہا۔ جب گھڑی نے ٹھیک ساڑھے پانچ بجائے تو میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور عملے کے ساتھ بستی کی طرف بڑھا۔ ہمارا مخبر دلبر جاگ رہا تھا۔ اس نے دُور ہی سے چانن کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر دیا۔ جھونپڑے سے باہر ایک بانس سے لالٹین لٹک رہی تھی اور کچھ جھنڈیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ ایک بولی کتا بھی زنجیر سے بندھا غرا رہا تھا۔ میں نے جا کر جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسری تیسری دستک پر چانن باہر نکلا۔ اس نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ یکا یک اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ مجھے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ جونہی وہ بھاگا میں نے بھاگ کر اسے عقب سے زوردار دھکا دیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں کئی قلابازیاں کھا گیا۔ میرے سب انسپکٹر اور حوالدار نے لپک کر اسے چھاپ لیا۔ وہ انہیں بڑی زبردست قسم کی گالیاں دینے لگا اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں جھونپڑے کے دروازے سے وہ لڑکی بھی چیختی ہوئی برآمد ہوگئی جو اس سارے واقعے کا مرکزی کردار تھی یعنی پھولاں۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر وہ واقعی خوبصورت تھی۔ اس نے چولی گھاگرا پہن رکھا تھا۔ ایکا ایکی ساری بستی جاگ اُٹھی اور اس شور میں چانن کی بکواس دب کر رہ گئی۔

چانن کو تھانے لایا گیا۔ اگلے دن اس کا ریمانڈ مل گیا۔ دو تین روز میں اس نے سب کچھ بک دیا۔ چوہدری تلقین کے قتل کے بارے میں تو میں دُلاری کی زبانی سن ہی چکا تھا۔ صوفی جمیل کے بارے میں چانن نے بتایا کہ جب وہ تلقین کو ٹھکانے لگانے کے بعد پانی سے نکل رہا تھا، سفید گھوڑی والے (جمیل) نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا 'اوئے کون ہے؟' چانن دوڑ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بھاگ نکلا۔ جمیل نے بھی گھوڑے کی باگیں سنبھالی اور اس

کے پیچھے آیا۔ دونوں میں کافی دوڑ ہوئی۔ چانن نے بہت پیچھا چھڑانا چاہا مگر موت صوفی جمیل کو پیچھے لئے چلی آرہی تھی۔ چانن ہمارے گاؤں کی طرف مڑ گیا تو صوفی جمیل نے بھی گھوڑی اس طرف ڈال دی۔ آخر جوی کے اس کھیت میں پہنچ کر چانن کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ صوفی جمیل نے گھوڑی سے چھلانگ لگا کر اسے چھاپ لیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔ صوفی جمیل بھی کافی تگڑا تھا مگر چانن کے پاس ایک کلہاڑی بھی تھی۔ لڑتے بھڑتے اس نے یہ کلہاڑی اُلٹی طرف سے صوفی کے سر پر دے ماری۔ صوفی ذرا سا ڈگمگایا تو چانن نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک اور ضرب سر پر لگائی۔ صوفی جمیل کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح کھیت میں ڈھیر ہو گیا۔ چانن سخت گھبرایا ہوا تھا کیونکہ دن چڑھنے والا تھا۔ اسے قریب ہی ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آیا۔ اس نے اپنی کلہاڑی سے اس گڑھے کو تھوڑا سا کشادہ اور گہرا کیا اور صوفی کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کی لاش کو گڑھے میں رکھ کر مٹھی ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے چُرایا ہوا گھوڑا واپس چھوڑا اور اپنی بستی میں پہنچ گیا۔

چانن کے تفصیلی بیان سے ساری کڑیاں مل گئی تھیں لیکن ایک بات مجھے ابھی تک اُلجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ والا چکر ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دیگر شہادتوں سے اشارہ ملتا تھا کہ قاتل اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے جبکہ چانن دایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب گرفتاری کے تیسرے یا چوتھے دن ملزم چانن کو دائیں کندھے میں شدید درد ہوا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے یہ کندھا اُتر گیا تھا اور ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ میں نے اس بارے میں مزید پوچھا تو انکشاف ہوا کہ یہ کندھا اس وقت اُترا تھا جب اپنے قتل سے صرف تین روز پہلے چوہدری تلقین نے چوری کے غلط شبہ میں اس کی پٹائی کروائی تھی۔ اس کا مطلب تھا تین روز بعد جب چانن نے چوہدری کو قتل کیا اس وقت بھی اس کا دایاں بازو ٹھیک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس نے کھبو نہ ہونے کے باوجود بایاں ہاتھ استعمال کرنا تھا۔ پولیس سرجن نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا اور میرا قیافہ بھی درست تھا۔

چوہدری سراج اور حسین محمد پر میرا شبہ غلط ثابت ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بے قصور تھے۔ صوفی جمیل کی پہلی بیوی کے بھائیوں کا بھی اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جہاں تک صوفی جمیل کا تعلق ہے مجھے اس کی موت پر افسوس تھا۔ اس نے اپنی طرف سے ایک اچھا کام کرنے کی کوشش کی لیکن بے موت مارا گیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ بندے کے کرم اس کے سامنے ضرور آتے ہیں۔ شاید صوفی جمیل کے سامنے بھی اس کا کوئی ایسا ہی کرم آ گیا تھا۔ تفتیش کے دوران مجھے معلوم ہوا تھا کہ صوفی جمیل فطرتاً ایک سخت مزاج شخص تھا اور پہلی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک بہت خراب تھا۔ کیا معلوم اپنے ہی کسی معصوم بچے کی آہ اسے لے ڈوبی ہو۔ چانن نے اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صرف اس سے پیچھا چھڑانا چاہا تھا مگر ضرب ایسی کاری لگی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا.....

چوہدری تلقین کے قتل میں تو کوئی اُلجھن والی بات ہی نہیں تھی۔ اس کو کسی کے ہاتھوں مرنا ہی تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو چانن کو اس قتل پر شاباش دیتا..... بلکہ میں نے اسے 'شاباش' دی بھی تھی۔ یہ شاباش زبانی کلامی نہیں تھی۔ اسے اپنی محبوبہ کے ساتھ رات گزارنے کی مہلت دے کر میں نے اپنی 'خاموش شاباش' کو عملی جامہ پہنایا تھا..... چانن کو دوہرے قتل کے الزام میں سزائے موت ہوئی۔

.....❁.....❁.....

حکمتِ عملی

محمد سلیم اختر

جولی نے صحیح کہا تھا۔ سیلون کے باہر بالوں کا ڈھیر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا اور جولی ہر شام کسی نہ کسی نوجوان کے ساتھ رقص کرتی نظر آتی تھی۔ لڑکوں کے سروں سے جھالر جیسے بالوں کی لٹیں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ لڑکوں کو دیکھ کر یہ احساس ہونے لگا کہ انہیں گروہ در گروہ کسی جیل سے رہا کیا گیا ہے۔

ایک تیز طرار حسینہ کا قصہ جسے لڑکوں کے لمبے بالوں سے نفرت تھی

اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی پھر بھی اس ہیئر سیلون کا مالک ضعیف ہونے کے باوجود میری گردن پر بڑی مہارت سے مشین چلا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی چل رہی تھی..... ''میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں پندرہ سال کی عمر سے یہ کام کر رہا ہوں۔ اس پوری مدت میں اتنے لمبے بالوں والے لڑکے اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھے تھے لیکن اب یہ وبا عام ہو گئی ہے اور اس نے ہمارے کام پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا ہے۔'' وہ اُسترا تیز کرنے لگا۔

''خوبصورت مناظر اور حسین تصویروں سے یہ دکان خاصی پرکشش بن سکتی ہے۔''..... میں نے اس قدیم طرز کے بنے ہوئے سیلون میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو آرائش کے جدید لوازمات کا کبھی خیال نہیں آیا؟''

ضعیف حجام کا منہ نفرت سے سکڑ گیا۔ ''نہیں میں ایک روایت پرست اور قدامت پسند آدمی ہوں۔ میں تبدیل نہیں ہوسکتا لیکن میرے ذہن میں ایک طریقہ ہے۔ میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔ پھر آئندہ تین ہفتوں میں تم دیکھ لوگے کہ قصبے کے لمبے لمبے بالوں والے تمام لڑکے ایک قطار میں یہاں بال کٹوانے کے لیے لائن میں لگے ہوں گے۔''

میں نے اس سے وہ طریقہ دریافت کیا مگر اس نے بتانے سے انکار کردیا۔

.....

چار ہفتوں بعد میں معمول کے مطابق پھر بال کٹوانے کے لیے اسی سیلون میں داخل ہوا تو میں دنگ رہ گیا..... سیلون لمبے لمبے بالوں والے لڑکوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب یہاں وہاں منتشر بیٹھے تھے اور ان میں سے کوئی کسی سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

میں نے حجام کی طرف دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہاں ضعیف حجام موجود نہیں تھا۔ اس کے فرائض ایک نازک اندام اور خوبصورت لڑکی انجام دے رہی تھی۔ بلاشبہ وہ خوبصورتی میں یکتا تھی اور حسیناؤں میں منتخب ہونے والی لڑکیوں میں شامل ہونے کے قابل تھی۔

''اب دوسرا نوجوان آ جائے۔''..... لڑکی پرکشش انداز میں مسکرائی اور تولیہ جھٹک کر کسی دوسرے کی گردن کے گرد لپیٹنے کے لیے تیار ہوگئی۔

میں نے لڑکوں کی جانب دیکھا۔ سب جھینپے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے مگر کوئی بھی بال کٹوانے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ بعض لڑکے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

''ٹام! اب تمہاری باری ہے۔'' لڑکی نے ایک لڑکے سے کہا۔ لڑکے کے بال بہت لمبے تھے۔

''مجھے کوئی عجلت نہیں ہے کسی اور کو بلا لو۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

لڑکی مشین ہاتھ میں لیے مستعد کھڑی تھی۔

''آخر میرا وقت کیوں ضائع کیا جارہا ہے؟''

ایک لڑکا اُٹھا اور شرماتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں اپنے بال آدھے انچ کے قریب کم کراؤں گا اس سے زیادہ نہیں۔''

''چلو اسی طرح وزن کچھ کم ہو جائے گا۔'' لڑکی کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی کھنک دار ہنسی نے سب کو چونکا کر اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

پھر تیسرا لڑکا کرسی پر بیٹھا۔ اس نے اپنے ماتھے پر جھولتی ہوئی لٹ دبالی۔

''یہ حصہ نہ چھونا۔'' اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

لڑکی اس کے عقب میں گھومتی ہوئی بال کاٹنے میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران وہ بہت دلچسپ باتیں بھی کر رہی تھی..... ''سنو جیک!'' اس نے لڑکے کے سر پر قینچی نچاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ایک فالتو ربن موجود ہے۔ مناسب سمجھو تو لیتے جانا۔''

وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک لڑکے کو شرمندہ کرتی رہی لیکن کسی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ جو لڑکے آدھا آدھا انچ بال کٹوا چکے تھے وہ اب بھی سیلون میں جمے بیٹھے تھے۔ غالباً انہیں باہر نکلنے میں تذبذب ہو رہا تھا۔

''اب تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' لڑکی نے کہا..... ''اگر اور بال کٹوانے کا ارادہ ہے تو معاوضہ دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔''

.....

پھر میری باری آئی..... میں کرسی پر بیٹھا۔ اسی وقت ایک نوجوان کی سرگوشی اُبھری..... وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا..... ''آج رات رائل کلب میں رقص کا پروگرام ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟''

لڑکی کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ میں نے اپنے سر پر قینچی کی آواز ختم ہوتے سنی اور پھر لڑکی کی آواز نے کانوں میں رس گھولا۔

''میں لمبے بالوں والے کسی لڑکے کے ساتھ گھومنا پسند نہیں کرتی اور تم سب لمبے بال رکھتے ہو۔''

لڑکے خاموش رہے۔ چند لمحوں بعد لڑکی نے قینچی چلاتے ہوئے کہا..... ''اچھا..... ایک بات سنو..... میں کسی ایسے لڑکے کے ساتھ رقص میں جانا قبول کرلوں گی جو گدی اور کنپٹیوں کے بال کٹوانے پر سب سے پہلے آمادہ ہو جائے۔''

مجھے ان لڑکوں کی حالت پر بے حد افسوس ہوا..... وہ باری باری سیلون سے باہر نکل گئے۔ شاید انہوں نے یہ سوچ کر لڑکی کی پیشکش رد کردی تھی کہ محض چند لمحوں کی رفاقت کے لیے وہ اپنے شاندار بال کیوں ضائع کریں؟ ظاہر ہے کندھوں تک پھیلے ہوئے بال ایک آدھ مہینے میں نہیں پلے ہوں گے۔

''ہیئر کریم بھی لگا دوں جناب؟'' لڑکی نے سوال کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ آئینے میں میرا عکس دیکھ کر مسکرانے لگی..... ''میں نے اپنے دادا سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا کاروبار ترقی کی راہ پر ڈال کر دم لوں گی۔''

''اوہ..... تو تم ضعیف حجام کی پوتی ہو؟''

''ہاں..... میرا نام جولی ہے۔ کیا آپ مجھ سے شرط لگاتے ہیں؟ چند ہفتوں بعد اس قصبے میں کسی لڑکے کے سر پر لمبے بال نہیں ملیں گے۔''

.....

جولی نے صحیح کہا تھا۔ سیلون کے باہر بالوں کا ڈھیر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا اور جولی ہر شام کسی نہ کسی نوجوان کے ساتھ رقص کرتی نظر آتی تھی۔ لڑکوں کے سروں سے جھالر جیسے بالوں کی لٹیں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ لڑکوں کو دیکھ کر یہ احساس ہونے لگا کہ انہیں گروہ در گروہ کسی جیل سے رہا کیا گیا ہے۔

لڑکوں کے بال اب خاصے چھوٹے ہو گئے تھے پھر بھی سیلون میں ان کی آمد و رفت برقرار تھی۔ ضعیف حجام بے حد مسرور تھا۔ وہ اب خوشحال ہو گیا تھا۔ اب اس کے سیلون میں کئی تبدیلیاں بھی ہوگئی تھیں اور پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں نظر آنے لگی تھیں۔

میں کچھ عرصے بعد معمول کے مطابق بال کٹوانے گیا۔ باہر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔

''نئی انتظامیہ..... نیا ماحول.....'' میں نے ذرا حیرت سے نئے مالک سے دریافت کیا ''ضعیف حجام کہاں گیا.....؟''

''وہ سبکدوش ہو گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور اس کی پوتی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آج تین بجے شادی کر رہی ہے۔''

میں نے واپسی میں گرجا کے باہر لڑکوں کا ایک جم غفیر دیکھا..... میں بھی رُک گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون خوش قسمت ہے جو جولی جیسی حسین اور طرار لڑکی کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنا رہا ہے؟ مجھے یقین تھا کہ دولہا ان ہی لڑکوں میں سے کوئی ہوگا جو اس سے مستقل حجامت بنواتے تھے۔

.....

شادی کے بعد جولی گرجا سے باہر آئی..... وہ آج ہمیشہ سے زیادہ حسین اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے نوجوان کی

طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور فوٹو کھنچوانے کے لیے ایک دلکش زاویے سے کھڑی ہوگئی..... میری نگاہ دولہا پر پڑی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نوجوان کے بال اس قدر لمبے تھے کہ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکے کے اتنے لمبے بال نہیں دیکھے تھے۔ بھوری چمکدار لٹیں کندھوں سے نیچے تک جھول رہی تھیں۔ وہ بار بار انہیں سنوار رہا تھا۔ میں بازو پھیلائے آگے بڑھا..... اور ان دونوں کو مبارکباد دی..... پھر میں نے جولی سے کہا ''تم تو کہتی تھیں کہ تم کسی لمبے بالوں والے لڑکے کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتی؟ آج تمہارا وہ اصول کہاں گیا؟''

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے ستائشی نگاہوں سے اپنے دولہا کو دیکھا..... اور بولی ''وہ تو صرف ایک کاروباری حکمت عملی تھی۔ میں اپنے دادا کا کاروبار چمکانا چاہتی تھی لیکن میں کسی ایسے مرد سے کیسے شادی کرسکتی تھی جو میری ہر بات آسانی سے مان لیتا ہو؟..... وہ سب بھیڑوں کی مانند تھے۔ میرے ساتھ صرف ایک شام گزارنے کے لیے وہ گنجے تک ہو سکتے تھے۔'' اس نے اپنے دولہا کا ہاتھ تھام کر فخر سے کہا..... ''ایرک ان سب سے بہتر ہے۔ اس نے آخر تک میری بات نہیں مانی تھی۔ بہرحال اب ممکن ہے کہ یہ اپنی دلہن سے مختلف نظر آنے کے لیے مردوں کی طرح حجامت بنوانے پر آمادہ ہو جائے۔''

.....❁.....

حاصل مطالعہ

شادی ایک بے زبان مہمان کی طرح ہے۔ جو اجنبی مسرتیں، خوشگوار حیرتیں اور نامحسوس تمنّوعات اپنے ساتھ لاتی ہے۔ آدمی خوشی خوشی اسے گلے لگاتا ہے۔ اپنے آپ پر نہال ہو ہو جاتا ہے۔ اپنی قسمت پر اتراتا ہے اور اپنے حالات کے غیر متوقع تغیرات پر بوکھلا بوکھلا جاتا ہے۔ مگر جو نتیجہ بے زبان مہمان کی آمد کا ہوتا ہے وہی انجام شادی کا ہوتا ہے۔ مہمان شروع شروع میں ضرور بے زبان ہوتا ہے۔ لیکن اگر دو چار دن رہے تو بدزبان ہو جاتا ہے۔ شادی کے نتائج بھی کم وبیش اسی ترتیب سے وارد ہونا شروع ہوتے ہیں۔

پہلے پہل کچھ عرصہ ایک دوسرے کی معلومات پر قیاس آرائی ہوتی ہے۔ ایک طرف سے مصرع طرح اٹھتا ہے دوسری طرف سے گرہ لگانے میں چوک نہیں کی جاتی۔ پھر بیت بازی کا سا منظر سامنے آتا ہے اور آخر کار پورا گھر یا جماعت اس فی البدیہہ مشاعرے میں شریک ہو جاتا ہے اور محلّے کے سامعین کو موضوعِ گفتگو بدلنے ہی کا موقع نہیں ملتا۔ بلکہ منجمد سناٹے میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ نئی نئی شادی کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ گھر میں اُترنے والی بھی آخر ایک عورت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے گھرانے کی وارداتیں اور کہانیاں بھی ساتھ لاتی ہے۔

میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شادی کی پہلی سات راتوں میں انسان جو علم اپنی بیوی سے حاصل کرتا ہے۔ وہ شاید زندگی بھر کسی انسائیکلوپیڈیا سے بھی اخذ نہیں کرسکتا۔ (خانہ آبادی۔ طارق بشیر۔)

(مرسلہ: محمد فرید راجپوت۔ ڈسکہ)

.....☆☆☆.....

الرجی

حکیم راحت نسیم سوہدروی

الرجی کے مریض بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سبھی ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اسے نازک مزاجی کہہ کر ٹال دیتے ہیں مگر یہ ایک مرض ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور اس کے معمولات کو متاثر کرتا ہے۔

جن چیزوں کو جدید تحقیقات سے موسوم کیا جاتا ہے ان میں سے ایک الرجی (ALLERGY) ہے۔ الرجی ایک ایلوپیتھی اصطلاح ہے جس کا اردو ترجمہ زور حسی کیا جا سکتا ہے۔ الرجی کسی فرد کی کسی خاص چیز سے حساسیت ہے یعنی بعض لوگوں کو بعض چیزیں ناموافق ہوتی ہیں اور ان کے استعمال سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے حالانکہ دیگر افراد کے لیے وہ کسی نقصان کا باعث نہیں ہوتیں اور ان چیزوں میں بھی کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ یہی چیزیں دوسرے افراد کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انڈہ ہے جو غذائیت سے بھرپور اور اکثر لوگوں کے لیے مفید ہے مگر بعض لوگوں کو انڈہ کھانے سے دمہ کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس طرح تپ کا ہی جو زرگل سے حساسیت کے سبب ہو جاتا ہے اس کی مثال ہے۔ مزید ایگزیما، جسم پر دھپڑ، نزلہ، زکام، چھینکیں، سوجن و دیگر بہت سی شکایات الرجی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ الرجی جسم کے کسی بھی حصے پر اثرانداز ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب کو ایئر کنڈیشنر سے الرجی ہے۔ وہ گھر سے باہر صحت مند چلتے ہیں مگر دفتر پہنچتے ہی ایئر کنڈیشنر کا ماحول ان کو نزلہ زکام

میں گھیر لیتا ہے اور ناک سے پانی بہتا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جو سڑک پر آنے سے گردوغبار کے باعث چھینکوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے ناک سے پانی آنے لگتا ہے۔

الرجی کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ ہم اکثر اوقات بعض ناپسندیدہ باتیں سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس سے جسم میں اشتعال پیدا ہوتا ہے لیکن ہم اس ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ اس سے جسم میں گھٹن اور انتقامی جذبہ اُبھرتا ہے اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اس سے جسم میں ہسٹامین (HISTAMINE) نامی کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو الرجی میں شدت کا باعث بنتا ہے اور آہستہ آہستہ ایسے لوگ اس قدر زود حس ہو جاتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات الرجی کا باعث بن جاتی ہے۔ الرجی کو خلاف مزاج کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے جس طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شے میرے موافق نہیں۔ یہی ناموافقت الرجی ہے۔ الرجی کی اصطلاح نے وبا کی سی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کا موقع بہ موقع استعمال ماڈرن ہونے کا مظہر بن گیا ہے۔ کسی قسم کی تکلیف ہوئی فوراً کہہ دیا الرجی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ الرجی الرجن یعنی حساسیت پیدا کرنے والی اشیاء کا ردعمل ہوتی ہے۔ الرجن ایسی اشیاء کو کہا جاتا ہے جن سے کوئی شخص حساس ہوتا ہے۔ عام الرجن میں مختلف اشیاء زرگل، حشرات الارض یعنی کیڑوں مکوڑوں کا کاٹنا یا جلد پر ملا جانا، ان کے بال، بعض اشیاء کا استعمال یا ان کی خوشبو، گردوغبار کی دھونس، کیمیائی اجزاء، بعض دھاتیں اور بعض غذائیں جن میں انڈہ، مچھلی، گوبھی، پالک اور آلو شامل ہیں سب سے زیادہ عام الرجن مکانات کی گرد جو چادروں، پردوں، قالینوں میں ہوتی ہے اس سے حساس فرد کو چھینکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی، فضائی آلودگی بھی عام الرجن ہے۔ کچھ لوگوں کو گرمی اور ٹھنڈک سے الرجی ہوتی ہے۔ جب ان کا ہاتھ ٹھنڈے یا گرم پانی میں جاتا ہے تو سوج جاتا ہے۔ الرجی ایک یا ایک سے زیادہ اشیاء سے ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ مختلف رنگوں سے الرجک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی ملکہ الزبتھ سرخ رنگ سے الرجک تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تقریب میں انہیں جانا ہوتا وہاں اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ کوئی چیز سرخ نہ ہو یہاں تک کہ گلاب کی سرخ پتیاں تک نچھاور نہ کی جائیں۔ 1960 میں جب وہ پاکستان کے دورے پر آئیں تو جن راستوں سے ان کو گزرنا تھا ان راستوں سے سرخ عمارتوں کا رنگ تبدیل کر دیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ گلاب کی پتیاں نچھاور نہ کریں۔

الرجی سے ہمارا واسطہ مختلف ذرائع مثلاً غذا، سانس اور جلد کے ذریعے ہوتا ہے۔ الرجی کی علامات عام طور پر ان حصوں پر ظاہر ہوتی ہیں جو مرض سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں مثلاً زرگل کا زیادہ اثر..... ناک، آنکھ اور سانس کی نالی پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء سے الرجی کی صورت میں ہونٹ سوج جاتے ہیں۔ معدہ خراب ہوتا ہے اور جسم پر دھبے بن جاتے ہیں۔ دھاتی اشیاء سے الرجی کی صورت جلد متاثر ہوتی ہے اور چکنے پڑ جاتے ہیں۔ اگر غذا میں الرجن شامل ہو جائے تو دمہ یا ایگزیما وغیرہ ہو جاتا ہے۔ الرجی کی ایک صورت دھاتی زیورات ہیں۔ ایسی صورت میں جلد پر چھالے پڑ جاتے ہیں اور خارش ہوتی ہے۔ آنکھوں میں الرجی کی صورت میں، آنکھوں کے سفیدے میں خارش اور جلن ہوتی ہے اور پانی بہتا ہے۔

الرجی کے مریض بچوں سے لے کر بوڑھوں تک

سبھی ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اسے نازک مزاجی کہہ کر ٹال دیتے ہیں مگر یہ ایک مرض ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور اس کے معمولات کو متاثر کرتا ہے۔ الرجی کے شکار لوگوں کو الرجک کہتے ہیں۔

اسباب

اس کا جواب ہنوز نہیں مل سکا کہ بعض لوگوں کو بعض اشیاء سے الرجی کیوں ہوتی ہے تاہم اس حوالے سے جسم کا دفاعی نظام خاص کردار ادا کرتا ہے۔ یہ دفاعی نظام ضد اجسام (Anti Body) پیدا کرتا ہے اور بیرونی اجزاء سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف افراد میں وجوہ مختلف ہوتی ہیں۔

علاج

انٹی الرجی (Anti Allergy) ادویہ وقتی سکون دیتی ہیں لیکن یہ علاج نہیں بلکہ مرض سے سکون کی تدابیر ہیں۔ اصل حل یہ ہے کہ الرجن حساسیہ سے بچا جائے۔ اگر الرجی ہو جائے تو غذا کا تجزیہ کیا جائے، غذا میں حساسیت کے لیے معروف اشیاء ایک ایک کر کے ترک کر دیں اس طرح اندازہ ہو جائے گا کہ کس چیز سے الرجی ہے۔

الرجی کا مرض آئے روز بڑھ رہا ہے اور اس کی بڑی وجہ نقص تغذیہ، فضائی آلودگی، ذہنی دباؤ کے باعث جسم کے مدافعتی نظام کا کمزور ہونا ہے۔ جسم کے مدافعتی نظام یعنی قوت حیات (VITAL FORCE) کو مضبوط کرنا اور صحیح تدابیر اسی وقت ممکن ہے جب الرجک کی الرجن کا صحیح اندازہ ہو جائے نیز اس امر کی کوشش کی جائے کہ جسم کے ان اعضاء (معدہ وجگر) کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے جو کسی چیز کو صحیح قبول نہیں کرتے اور الرجی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اشیاء میں کوئی نقص نہیں ہوتا بلکہ جسم میں ایسا کوئی نقص ہوتا ہے جس سے الرجی ہوتی ہے۔

ظالم

عدالت میں ایک شوہر بیساکھیوں کی مدد سے پہنچا، سر پر بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں نیز ایک بازو پر پلستر تھا۔ بیوی نے جج سے کہا۔ ''اس ظالم نے مجھے گھونسہ مارا تھا اور گالیاں بھی دی تھیں۔ مجھے انصاف چاہئے۔'' جج بولا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ اس ٹوٹے پھوٹے حواس باختہ زخمی شخص نے آپ پر ظلم کیا؟''

''آپ نہیں جانتے جناب والا! بیوی نے کہا۔ ''یہ سنگدل اس وقت ٹوٹا پھوٹا اور حواس باختہ ہرگز نہ تھا۔ جب اس نے مجھے گھونسہ مارا تھا۔''

حاضر جواب

ایک ماں نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کرنے آئے ہیں'' بچے نے تھوڑی دیر سوچا پھر پوچھا ''امی جان! دوسرے یہاں کس لئے آئے ہیں؟''

تجربہ

بالی وڈ کی ایک اداکارہ نے جو تیسری شادی کر رہی تھی، اپنے نئے شوہر سے کہا۔ تمہیں تو بازو پکڑنا بھی نہیں آتا، صحیح طریقے سے پکڑو۔ شوہر بولا۔ ''ڈیئر! صحیح تو پکڑا ہے۔'' اداکارہ غصے سے بولی ''تمہارا تجربہ زیادہ ہے یا میرا؟''

ردعمل

گھر کے ملازم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں خاتون خانہ کو اطلاع دی۔ ''صاحب دروازے کے پاس بے ہوش پڑے ہیں، ان کے ایک ہاتھ میں کاغذ ہے اور دوسرے میں ایک بڑا سا پیکٹ۔'' خاتون خانہ یہ کہتی ہوئی باہر کو لپکیں۔ ''آہا، میری نئی ساڑھیاں آ گئیں۔''

☆☆☆

زود پشیمان

ذکیہ امتیاز

تین دن بعد لندن سے رجسٹری موصول ہوئی۔ میں نے خوشی خوشی لفافہ کھولا۔ مگر اسے پڑھ کر میری چیخ نکل گئی...... وہ میرا طلاق نامہ تھا۔ حسن نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ اس نے لکھا تھا ''میں کسی فرسودہ خیالات اور پرانے ڈھکوسلوں کی پابند لڑکی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔''

ایک لڑکی کی کہانی جو خود کو بہت ماڈرن اور جدت پسند خیال کرتی تھی

موسم شام ہی سے بے حد خوشگوار تھا۔ گرم تپتی ہوئی ہوا ٹھنڈے جھونکوں میں تبدیل ہوگئی۔ چاند کی روشنی نے ماحول کو منور کر دیا تھا۔ ہر شے چاند کی چاندنی میں روپہلی نظر آ رہی تھی۔ رات کی رانی اور بیلے کے سفید پھول خاموشی سے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے۔ ان کی ڈالیاں ایک دوسرے کو چوم رہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو نے ماحول کو حسین اور مسحور کن بنا دیا تھا۔ میرے گھر کا صحن کسی شہزادی کے حسین خوابوں کی طرح خوبصورت اور دلکش ہوگیا تھا۔ گھر کے کاموں

سے فارغ ہو کر میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مغرب کے بعد آنا ان کا معمول تھا لیکن آج تو 9 بج جانے کے باوجود ان کا پتہ نہ تھا۔ موسم حُسن سے بھرپور تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے بغیر موسم کا حُسن بالکل پھیکا پڑ گیا ہو۔ دل نہ جانے کیوں اُداس اُداس سا تھا۔ بیلے اور رات کی رانی کی جانب جب نظر اُٹھتی تو اُداسی اور بڑھ جاتی۔ چاند اور اس کی پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ کر اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہو۔ میری نگاہیں دروازے پر اور کان دستک پر لگے ہوئے تھے۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس دروازے کو چوما جس پر ان کے قدم پڑھنے والے تھے۔ وہ اتنے ہی پیارے ہیں لیکن...... آج سے پانچ سال پہلے...... اُف میرے خدا! جب میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتی ہوں تو دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اک گرمی سی محسوس ہوتی ہے اور پیشانی پر ندامت کے قطرے چمکنے لگتے ہیں۔ میر نے ٹھیک ہی کہا تھا

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

....

ان دنوں میں سال دوم آرٹس کی طالبہ تھی۔ کلاس میں ایک نئے لڑکے کا اضافہ ہوا۔ شاید مجھے اس کی شخصیت سے دلچسپی نہ تھی لیکن ایک روز اردو کے پروفیسر جگر اور اس کی شاعری کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے کہنے لگے ''جگر بازاری شاعر تھا۔''

''سر'' پیچھے سے آواز آئی۔

''فرمایئے؟......''

''جگر بازاری کیوں تھا؟''

'' اس لیے کہ اس کے اشعار میں سستا پن ہے؟'' پروفیسر صاحب نے عینک کے گول گول شیشوں سے جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

''سستا پن تو ہر اردو شاعر کے ہاں پایا جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ اب اردو شاعری پر پروفیسر اور اس سٹوڈنٹ کے درمیان طویل بحث شروع ہو چکی تھی۔ پوری کلاس حیرت سے اس لڑکے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ بالآخر پروفیسر نے جھلا کر کہا ''آپ تشریف رکھیں مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت قابل ہیں۔''

پیریڈ ختم ہوا تو میں اس کی طرف بڑھی۔ ''آپ نے حال ہی میں ایڈمیشن لیا ہے؟''

''جی نہیں میں آج ہی آیا ہوں...... دراصل مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا۔''

''اوہ! آپ کا بڑا نقصان ہوا'' میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''آپ نقصان کہہ سکتی ہیں لیکن میرے نزدیک

برتر از اندیشۂ سُودِ و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

''میرے پاس تمام نوٹس ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو......''

پھر ذرا رُک کر اس نے کہا ''آپ کا اسم گرامی؟''

''مجھے راضیہ کہتے ہیں۔'' میں نے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے احسن کہتے ہیں۔''

کچھ ہی دنوں میں پتہ چلا کہ میرے اور اس کے مشاغل میں بڑا فرق ہے۔ اس نے میرے ساتھ کبھی کوئی پارٹی اٹینڈ کی تھی اور نہ ہی کوئی پکچر دیکھی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ضرور ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ رجعت پسندی اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مجھے غالب

پسند تھا اور اقبال بھی۔ اسے بھی غالب اور اقبال پسند تھے۔ جگر بھی ہم دونوں کا پسندیدہ شاعر تھا۔ میں جوش کو بھی پسند کرتی تھی جبکہ وہ احسان دانش کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جوش صاحب کے پاس کوئی نظریۂ حیات نہیں، وہ الفاظ کے بازیگر تو ہیں لیکن جادوگر نہیں..... جبکہ احسان دانش کے ہاں زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ ایک دردمند دل بھی دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔''

آہستہ آہستہ اس نے ناصح کی حیثیت اختیار کر لی۔ میرے تراشیدہ بال، چست لباس اور بڑھتی ہوئی آزادی پر اعتراض ہونے لگا تو مجھے اس سے چڑ سی ہو گئی۔ میں تو اسے ترقی پسند سمجھتی تھی مگر یہ تو اس کے بالکل برعکس نکلا۔ میں نے سوچا وہ کسی معمولی فیملی سے تعلق رکھتا ہو گا۔ میں ایک بڑے آدمی کی بیٹی ہوں۔ انگلش میڈیم میں پڑھتی آئی ہوں۔ اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہوں۔ کہاں میں..... کہاں وہ..... ایک دن میں نے اس سے کہہ ہی دیا ''احسن صاحب! آپ کے اندر وقت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ عادات بھی بدلتی ہیں۔ اگر آپ تبدیل نہیں ہو سکتے تو دوسروں کو تو منع مت کیجئے۔''

''معاف کیجئے مجھے آپ کے نظریے سے بالکل اتفاق نہیں۔ وقت انسان اور قدریں تبدیل ہوتی نہیں کی جاتی ہیں۔''

''نکتہ ذرا باریک ہے۔ وضاحت فرما دیجئے۔'' میں نے طنزاً کہا۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر کہنے لگا ''اس وقت سورج نصف النہار پر ہے..... یہ اپنا فاصلہ آدھا طے کر چکا ہے۔ اسے آپ دوپہر کہتی ہیں..... یہ سورج کل بھی ایسا ہی تھا، برسوں اور ایک ہفتے پہلے بھی..... ایک ہی ہفتہ نہیں ایک ماہ ایک سال اور چودہ سو سال پہلے بھی..... اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ صدیوں پہلے جس طرح یہ اپنا سفر طے کرتا تھا اسی طرح آج بھی کر رہا ہے اور کل بھی کرے گا..... وقت ہمیشہ یکساں رہتا ہے، سورج ہمیشہ مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا آیا ہے۔ یہ انسان ہے جس نے منٹوں گھنٹوں مہینوں اور سالوں میں اس وقت کو تبدیل کیا ہے۔''

''جناب آپ کی طرح میرا بھیجا تو ہے نہیں؟'' میں نے بور ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا بتایئے آپ نے بال کیوں کٹوائے ہیں؟ اونچی ہیل کی سینڈل اور چست لباس کیوں پہنا ہے؟''

''یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا..... ہر انسان چاہتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی بات موجود ہو جس سے وہ لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب پھیرنے میں کامیاب ہو جائے یعنی اس کی انفرادیت اور اس کی مقبولیت کا سبب بن جائے۔ اب دیکھو کالج میں چند لڑکیاں ہیں جن کے بال کٹے ہوئے ہیں اور وہ سب میں نمایاں نظر آتی ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ انفرادیت کی خاطر ایسا کرتی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''لیکن یہ انفرادیت اس طرح بھی تو قائم رہ سکتی ہے کہ آپ گاؤن پہننا شروع کر دیں یا..... یا پھر آپ اپنا مطالعہ اتنا وسیع اور گہرا کر لیں کہ آپ ہر موضوع پر بڑی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور.....''

''اجی آپ کو ان دقیانوسی باتوں کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے؟'' میں نے اُٹھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''میری باتوں سے اگر آپ کو یا آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔'' اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ میرے قدم رُک گئے۔ میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں نیند کا خمار۔ جانے کون سا جذبہ تھا جس کے تحت میرے دل نے وقتی طور پر اس کی عظمت کا اعتراف کر لیا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکل گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اعتراف شکست قبول کر لوں۔ اس کے بعد سے کالج میں ہم دونوں اجنبی بن گئے۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ روحی، حسن، ناصر اور میں خالی پیریڈ میں کالج کے لان میں اکٹھے ہو جاتے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ وہ کلاس میں بیٹھا رہتا..... جب وہ کلاس سے نکل کر کہیں جاتا تو ہمارے قہقہے اس کا تعاقب کرتے رہتے۔ ''ملّا ہے بیچارہ۔'' ناصر طنز کرتا۔

''جانے بیچارے کو کیا غم ہے؟'' روحی اتنے زور سے کہتی کہ وہ سُن لے۔

پھر ہم سب ہنس پڑتے۔ میری ہنسی کچھ پھیکی پھیکی ہوتی۔ میں اس کا اس طرح کا مذاق اُڑانا پسند نہ کرتی۔ ایک روز میں اور حسن کالج کے لان میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے ایک جگہ فائل، قلم اور کتابیں پڑی دیکھیں۔ فائل پر احسن کا نام تحریر تھا۔ میں نے فائل کھولی۔ پہلے صفحے پر تحریر تھا ''دل صرف دل ہوتا ہے، نہ سونے کا نہ چاندی کا، شیشے کی طرح نازک اور پانی کے بلبلے کی طرح حساس، جو ہلکی سی ٹھیس لگنے سے پاش پاش ہو جاتا ہے، اس آبگینے کی حفاظت ہر انسان پر لازم ہے۔'' میں نے فائل بند کر دی اور حسن کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

ہمارا خاندان روشن خیال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حسن کے ساتھ بڑھتی دوستی پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ حسن کلاس کا ایک سمارٹ لڑکا تھا۔ ہنس مکھ اور شوخ۔ اس کے والد ایک بڑے تاجر تھے۔ ہم نے بالکل کسی ہیرو ہیروئن کی طرح ایک ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی تھی۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ شیرازی کسی بینک میں افسر تھا اور قبول صورت جوان تھا لیکن میں نے والدہ کو انکار کر دیا۔ حسن کے علاوہ میں کسی اور سے شادی پر راضی نہ تھی۔ میرے انکار پر گھر میں قیامت برپا ہو گئی لیکن میری ضد کے آگے کسی کی نہ چلی اور آخر ایک دن میرے والدین نے مجھے اپنے گھر سے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

''میں کتنا خوش قسمت ہوں راضیہ جو تم مجھے مل گئیں۔'' حسن کا لہجہ جذباتی تھی۔ زندگی مسرت و شادمانی کا نام ہے۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔ اسی وقت ذہن کے گوشے میں جانے احسن کہاں سے آ ٹپکا جس نے جگر کا یہ شعر سنایا تھا۔

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

اور ایک بار کہا تھا کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بچھونا ہے۔

کتنا فرق تھا احسن اور حسن میں۔ ہماری شادی کو ابھی تین ماہ ہوئے تھے کہ حسن نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی۔ وہ بلند حوصلہ نوجوان تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا اور میری بھی یہی تمنا تھی کہ حسن کسی بلند مقام پر پہنچ جائے جہاں زندگی کی ہر آسائش ہو، سکون ہو اور پھر میں اور حسن ہوں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے حسن کو UK جانے کی اجازت دے دی۔ حسن کے

جانے کے دن قریب آ رہے تھے اور میری افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب جہاز تیار کھڑا تھا اور کچھ دیر بعد اس نے زمین چھوڑ دی۔ میں بڑی حسرت سے اوپر اٹھتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا دل بھی نکل کر اُڑ جائے گا۔ جہاز جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہوا میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی پھر نہ جانے کیوں میں نے آنچل میں اپنا منہ چھپا لیا۔ کچھ عرصہ تک حسن کے خطوط باقاعدگی سے آتے رہے۔ حسن کا ہر خط مجھے نئی فرحت بخشتا اور جینے کا حوصلہ عطا کرتا۔ کچھ عرصے کے بعد خط آنے کم ہو گئے اور اس کے بعد یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ طویل عرصے بعد حسن کا ایک خط موصول ہوا جس میں امتحان کی مصروفیت کا تذکرہ تھا۔ حسن نے میرے آنے کے لیے بھی لکھا تھا۔ میں نے خط پا کر تیاری شروع کر دی اور پھر میں بھی ایک دن جہاز میں بیٹھ کر اپنے حسن کی جانب روانہ ہو گئی۔

لندن کی زندگی کراچی کی زندگی سے یکسر مختلف تھی۔ میں جو اپنے آپ کو بہت ایڈوانس خیال کرتی تھی خود کو بہت کمتر محسوس کرنے لگی۔ حسن ایک مختصر سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ صرف ایک کمرے کا فلیٹ جس کے ایک کونے میں ایک بک شیلف تھا اور ساتھ ایک ٹیبل پڑی تھی۔ اس کے ساتھ چار کرسیاں اور دوسرے کونے میں ایک میٹرس پڑا تھا۔ ایک وسیع و عریض مکان چھوڑنے کے بعد مجھے یہ فلیٹ ایک قید خانے سے کم نہ لگتا۔ حسن رات گئے واپس آتا اور خاموشی سے سو جاتا۔ چند روز گزرنے کے بعد میں نے اس سے شکایت کی تو کہنے لگا ''راضیہ یقیناً تنہائی سے تم گھبرا جاتی ہو گی خیر کل سے میں سیدھا گھر آؤں گا کلب نہیں جایا کروں گا۔ دوسری شام جب حسن گھر آیا تو اس کے ساتھ چار دوست اور تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ مجھے خوشی ہوئی جب حسن نے میرا تعارف ان الفاظ سے کروایا کہ یہ میری زندگی ہے۔ اس پر ایک لڑکی نے عجب سی مسکراہٹ کے ساتھ جسے میں اس وقت نہ سمجھ سکی تھی، کہا ''اوہ آئی سی۔'' میں نے دیکھا وہ سب آپس میں بہت بے تکلف تھے۔ کچھ دیر تک سب کارڈ کھیلتے رہے۔ مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے اکیلی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد شراب کا دور شروع ہو گیا۔ اس کی بُو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے اس ماحول سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ ان کی حرکتوں کو کافی دیر تو میں برداشت کرتی رہی آخر تنگ آ کر میں نے حسن سے احتجاج کیا تو کہنے لگا ''راضیہ مشرق اور مغرب میں بڑا فرق ہے۔ مشرق غلام ہے اور مغرب آقا..... مشرق کے لوگوں میں غلامی کی عادت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے نشست و برخاست، بول چال غرضیکہ ہر جگہ پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ مغرب کی فضا آزاد ہے۔ یہاں کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ تم اپنے آپ کو اس میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو۔'' حسن کی باتوں کا جواب خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

میں نے اپنے آپ کو ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ لندن کی زندگی سے مجھے نفرت ہو چلی تھی۔ یہاں ہر طرف نفسانیت اور حیوانیت جلوہ گر تھی۔ جنس اور شراب کے گرد یہاں کی معاشرت گھوم رہی تھی۔ میں بیمار سی رہنے لگی۔ بہت پریشان ہو جاتی تو والدین کو خط لکھنے لگتی لیکن اس میں بھی اپنے دل کا حال نہ لکھ سکتی کیونکہ حسن کو میں نے خود پسند کیا تھا۔

زیبا اور جان بہن بھائی تھے۔ دونوں حسن کے کلاس فیلو تھے۔ ایک روز جان نے مجھے اور حسن کو اپنی سالگرہ پر مدعو کیا۔ میں گھر سے باہر مجبوری کے تحت ہی نکلتی تھی۔ اس روز بھی میں نے انکار کر دیا

لیکن حسن کی ناراضگی کا خیال کر کے جانے کو تیار ہو گئی۔ پارٹی میں حسن اور زیبا نے ڈانس کیا تو مجھے بہت اذیت ہوئی۔ پھر جان نے میرا ہاتھ پکڑا۔

''میں آپ کا پارٹنر بن کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''کیا بات ہے؟'' حسن نے میرے قریب آ کر کہا۔

''میرا پارٹنر بننا انہیں پسند نہیں۔'' جان نے کہا۔

''کیوں؟''

''میں نہیں چاہتی۔'' میں نے روکھا سا جواب دیا۔

''ہرج ہی کیا ہے؟ میں بھی تو زیبا کے ساتھ.....''

''بہت ہو چکا حسن اب میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ کے بعد حسن میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ دوستوں کا گھر آنا بند ہو گیا اور وہ خود بھی وقت پر گھر آ جاتا۔ میں بھی خوش تھی کہ میں حسن کو بدلنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ ایک روز کہنے لگا ''میرا خیال ہے میں تمہیں کراچی بھیج دوں۔ چند ماہ تک میں بھی آ جاؤں گا۔''

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں اس ماحول سے تنگ آ چکی تھی۔ جھٹ تیار ہو گئی۔ روانگی کے وقت مجھے دلی خوشی تھی کہ میں وطن جا رہی ہوں۔ مادر وطن جس کی آغوش میں مجھے سکون ہی سکون ملے گا۔ مشرقی تہذیب کے سائے میں یقیناً میں زیادہ خوش رہوں گی۔

گھر پہنچ کر مجھ سے مل کر سب خوش ہوئے۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ تین دن بعد لندن سے رجسٹری موصول ہوئی۔ میں نے خوشی خوشی لفافہ کھولا۔ مگر اسے پڑھ کر میری چیخ نکل گئی..... وہ میرا طلاق نامہ تھا۔ حسن نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ اس نے لکھا تھا ''میں کسی فرسودہ خیالات اور پرانے ڈھکوسلوں کی پابند لڑکی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔'' مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حسن مجھے کسی بلندی تک بہلا پھسلا کر لے گیا ہو اور اوپر سے دھکا دے دیا ہو۔'' میرا سر چکرانے لگا ''یا اللہ اب میں کیا کروں؟'' اس حادثہ نے میرا رُخ موڑ دیا تھا۔

میں اکثر رات کو اُٹھتی اور رونا شروع کر دیتی۔ ضرورت سے زیادہ تنہائی پسند ہو گئی تھی۔ مسلسل بخار نے سب کو ہی پریشان کر دیا اور آخر ایک دن ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ مجھے ٹی بی ہو گئی ہے۔ یہ سن کر میں خوش ہوئی کہ اب مجھے اس دنیا سے جلدی چھٹکارا مل جائے گا۔ تین ماہ تک پابندی سے علاج ہوتا رہا۔ بھائی جان خود مجھے دوا کھلاتے اور انجکشن لگواتے۔ انہوں نے اپنا پلنگ بھی میرے کمرے میں لا ڈالا۔ ہر وقت مجھے سمجھاتے اور تسلی دیتے رہتے۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ میری شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ شاید سب کا دماغ چل گیا تھا۔ بھلا کوئی کسی مطلقہ اور وہ بھی کسی ٹی بی کی مریضہ سے شادی کرے گا۔

جب بھائی جان نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ پھر سوچا والدین کا حکم پہلے نہیں مانا تو اب مان لوں۔ یہ سوچ کر میں نے ہاں کر دی۔

شادی کی تمام رسومات سادہ طریقے سے انجام پائیں۔ نہ خوشی کے شادیانے بجے نہ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے گئے۔ ہر کام خاموشی کے ساتھ سرانجام پایا۔ اور تو اور رخصتی کے وقت ماں باپ اور بہن بھائیوں کی آنکھیں تک اشکبار نہ ہوئیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس گھر میں میری حیثیت تبدیل

ہو چکی ہے۔ میں اب وہ خوش نصیب راضیہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ والدین نے رسمی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری بارات نہیں بلکہ جنازہ جا رہا ہو۔

میں تنہا اپنے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ میرے ذہن میں آج سے ڈیڑھ سال پہلے کا منظر گھوم گیا جب میں پہلی بار دُلہن بنی تھی اور مجھے میکے سے بڑی شان کے ساتھ رخصت کیا گیا تھا۔ سُسرال والوں کی آنکھیں اس راہ پر جمی تھیں جو باراتیوں کی راہگزر تھی۔ سُسرال پہنچی تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میری نندیں میرے آگے پیچھے، ساس الگ قربان جاتی تھی لیکن آج.....؟ لوگوں کی نگاہیں کس قدر بدلی نظر آ رہی تھیں۔ میرے اس نئے سُسرال میں چند عورتیں تھیں جنہوں نے مجھے خوش آمدید کہا تھا..... آہ کتنا فرق ہے کل اور آج میں..... میں نے سوچا۔ سچ ہے عورت صرف ایک بار دلہن بنتی ہے۔ میرا ذہن سُلگ اُٹھا۔ میں نے اپنا سہرا، گھونگھٹ اور جھومر نوچ کر پھینک دیا۔ میرا سر چکرانے لگا اور میں نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا اور پھوٹ کر رو پڑی۔

سارا کمرہ سسکیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ ''راضیہ.....'' کسی نے بہت آہستگی سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا..... میری سسکیاں اور سسک اُٹھیں۔ ''زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بچھونا ہے۔ ان کانٹوں سے نباہ کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ طوفان سے لڑنے والے ہی منزل تک پہنچتے ہیں۔ تم نے اقبال کو نہیں پڑھا

حادثاتِ غم سے ہے انسان کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

ان کے لہجے میں بلا کی چاشنی تھی۔ محبت اور خلوص کی تڑپ تھی۔ میں نے سوچا یہ کوئی عظیم اور باکردار انسان ہے لیکن میں ایک ناعاقبت اندیش لڑکی جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا جو ان کے قدموں میں نچھاور کر سکتی..... یہ سوچ کر میں پھر رو دی۔ ''مت رو راضیہ۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''اس لیے نہیں رو رہی ہوں کہ حسن نے مجھے چھوڑ دیا۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جس تہذیب کی خاطر میں نے لوگوں کا مذاق اُڑایا انہیں ذلیل و رسوا کیا اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو حقیر سمجھا اور والدین سے بغاوت کی..... اسی تہذیب کی زہریلی ناگن نے مجھے ڈس لیا۔ آہ میں کتنی پستی میں گر گئی تھی..... مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں کتنی پشیمان ہوں۔ کاش.....''

میں نے پوری طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال ڈالی۔ ''ایسا نہ سوچو راضیہ۔ عزت اور ذلت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے رسوا کرنے سے کوئی رسوا نہیں ہو سکتا۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے لیکن اپنی غلطی پر نادم ہونا اور ربّ سے معافی کا طالب ہونا انسانیت کی معراج ہے۔ ندامت کے آنسو ربّ کو بہت پسند ہیں۔ تم نے انسانیت کی اس معراج کو پا لیا ہے۔ تم ایک عظیم عورت ہو۔ اپنے دل سے تمام پرانے خیالات کو جھٹک دو۔ ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔''

انہوں نے مجھے سہارا دیا۔ میں نے بہت آہستگی سے اپنا سر اٹھایا کہ اس مسیحا کو دیکھ تو لوں جس نے میری مُردہ تمناؤں کو نئی زندگی بخشی اور روح کو پاکیزگی بخشی۔ سر اٹھاتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ میرے سامنے احسن کھڑا تھا.....!

.....❁.....❁.....

برسوں بعد

یاسمین کنول

اصل میں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے اور اگر میں بھی پیا دیس سدھار گئی تو گھر میں امی ابا کے پاس کون رہے گا؟ گھر کیسے چلے گا؟ بہنوں نے گرمی، سردی کی چھٹیوں اور عید شب برأت پر آنا ہوتا ہے۔ میں نہ ہوئی تو ان کو کون پوچھے گا۔ والدین تو بہت ضعیف ہیں نا.....'' زریاب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

دو سہیلیوں کی کہانی جو ایک دوسرے سے برسوں بعد ملی تھیں

سردیوں کا آغاز تھا۔ وہ دونوں ایک دکان پر شوکیس میں سجے جوتے دیکھتے دیکھتے آپس میں مل بیٹھی تھیں۔ راحیلہ اپنے بیٹے کے جوتے خریدنے آئی تھی جبکہ زریاب اپنے لیے سردیوں کا کوئی اچھا سا جوتا خریدنا چاہ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ سکول کالج کو خیرباد کہنے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ دونوں نے بہتر سمجھا کہ جوتے بعد میں خریدے جائیں اور کہیں مل بیٹھ کر ڈھیروں باتیں پہلے کر لی جائیں۔ زریاب راحیلہ کو قریبی ''بریانی ہاؤس'' میں لے گئی جہاں عورتوں کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ بیٹھتے ہی بریانی کا آرڈر لینے والا لڑکا آ پہنچا۔ دو ہاف ڈبے بریانی اور تین سیون اپ کا آرڈر دے کر اس سے جان چھڑائی گئی۔

راحیلہ کو زریاب کے بارے میں جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔ بیٹھتے ہی شادی کا پوچھنے لگی تو زریاب دھیرے سے مسکرائی اور کہنے لگی ''شادی تو قسمت والیوں کی ہوتی ہے مجھ جیسی بدنصیب تو ایسے ہی بیٹھی رہ جاتی ہیں۔''

''مگر کیوں زریاب؟ کیا کمی ہے تم میں؟ یاد ہے سکول کالج میں تمہاری خوبصورتی کی بنا پر ٹیچرز خصوصی طور پر تمہیں ماڈلنگ کے لیے منتخب کیا کرتی تھیں۔'' راحیلہ نے کہا تو زریاب بولی ''صرف خوبصورتی تو سب کچھ نہیں ہوتی ناں۔ انسان کا کوئی مالی پس منظر بھی ہونا چاہیے۔ کوئی بینک بیلنس کوئی پلاٹ کوئی بنگلہ۔''

''یہ سب چیزیں ضروری تو ہیں مگر اتنی بھی نہیں جتنی تم سمجھ بیٹھی ہو۔'' راحیلہ نے بات اچکتے ہوئے کہا ''برسوں بعد ملی ہو بس ہمیں اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔ یہ کیا بور سا ٹاپک لے کر بیٹھ گئی ہو۔ اچھا تو آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' زریاب نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔ گھر ہے، میاں ہے، بچے ہیں اور ہم ہیں اور کیا ہونا ہے۔ خوب ٹھاٹ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔'' راحیلہ چہکی ''اور تم کیا کر رہی ہو آج کل؟'' جوابی سوال داغا گیا تو زریاب سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں بریانی آ گئی۔ زریاب نے اپنے لیے صرف بوتل منگوائی تھی۔ راحیلہ اور اس کے بیٹے کے لیے بریانی اور بوتل تھی۔ سب نے فوراً بوتلیں پکڑ لیں کیونکہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ سیون اپ کا گھونٹ بھرتے ہوئے زریاب بولی ''میں سکول میں ٹیچنگ کرتی ہوں۔ امی ابا ہیں، ان کی مختلف بیماریاں ہیں، بہنیں ہیں، ان کے سسرال ہیں، بس زندگی اچھی گزر رہی ہے۔''

''کیا خاک اچھی گزر رہی ہے؟ زریاب تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' راحیلہ نے بریانی کھاتے کھاتے سوال کیا۔ ''شادی میں نے خود تو نہیں کرنی والدین نے کرنی ہے۔ جب وہی نہیں چاہتے تو پھر.....''

''تو پھر تم خود کچھ نہیں کر سکتی کیا؟ تمہاری بہنیں جن کی تم بڑی خدمت کیا کرتی تھی وہ بھی نہیں چاہتیں کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ؟'' راحیلہ نے پھر اس کی بات اچک لی تھی۔ ''پہلے چاہتی تھیں اب نہیں۔ اصل میں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے اور اگر میں بھی پیا دیس سدھار گئی تو گھر میں امی ابا کے پاس کون رہے گا؟ گھر کیسے چلے گا؟ بہنوں نے گرمی، سردی کی چھٹیوں اور عید شب برأت پر آنا ہوتا ہے۔ میں نہ ہوئی تو ان کو کون پوچھے گا۔ والدین تو بہت ضعیف ہیں نا.....'' زریاب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''اُف کیسے کیسے حالات میں عورتیں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔'' راحیلہ نے سوچا اور بیٹے کو بریانی ختم کرنے کی تلقین کرنے لگی۔ راحیلہ شادی کے بعد دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ ایک شادی میں شرکت کے لیے میکے آئی تھی اور زریاب سے اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔ بریانی کے بعد چائے منگوائی گئی۔ اب کے آرڈر راحیلہ نے دیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے زریاب اس سے بچوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ان کی کلاسز اور مشاغل کے بارے میں پوچھنے لگی۔ راحیلہ کو بہت دکھ ہو رہا تھا کہ اتنی خوبصورت اور ذہین لڑکی اب تک بن بیاہے بیٹھی تھی اور کسی کو اس کی شادی کی فکر تک نہ تھی۔ سب اپنے اپنے مفاد کا سوچ رہے تھے۔ اس کے لیے کوئی بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کو فکر مند دیکھتے ہوئے زریاب بولی ''ہم برسوں بعد ملے ہیں اور تم سوچ میں گم ہو۔ اپنا نمبر ہی دے دو۔ تم سے بات کر لیا کروں گی۔'' اس نے چونکتے ہوئے اپنا نمبر بتایا جو زریاب نے فوراً موبائل میں نوٹ کر لیا۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی دونوں کو اپنے اپنے کام یاد آ گئے اور یوں برسوں بعد ملنے والی فون پر رابطہ رکھنے کے وعدہ پر اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہو گئیں۔

.....❁.....❁.....

رازدان

اشفاق احمد

رعنا نے کہا ''کسی کو کسی پر کوئی حق نہیں ہوتا لیکن ایک وقت آتا ہے..... نجانے کہاں سے آ جاتا ہے وہ وقت..... جب یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی کا حق چھینا جا رہا ہے۔'' فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن دندناتی ہوئی ایکسپریس کے کھڑکھڑاتے ڈبے ویٹنگ روم کے سامنے سے گزرے اور چشم زدن میں گاڑی کو چیخیں مارتی بریکیں چمٹنے لگیں۔

ایک دوشیزہ کی کتھا جو کسی کی محبت کی رازدان تھی

ابھی پانچ بجنے میں پورے پانچ منٹ تھے اور سٹیشن پر چار پانچ آدمی اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ یہ کوئی اتنا بڑا سٹیشن نہ تھا لیکن جنکشن ہونے کی وجہ سے بہت بڑا دکھائی دیتا تھا۔ میل اور ایکسپریس دونوں گاڑیاں یہاں سے گزرتی تھیں لیکن ان کا قیام بہت مختصر ہوتا تھا۔ برانچ لائن کا ایک سرا یہاں تھا تو دوسرا ادھر بارڈر کے پار۔ پہلے اس لائن پر بہت بھیڑ رہتی تھی لیکن جب سے آدھی کٹ کر دوسرے دیس میں رہ گئی تھی سٹیشن سونا ہو گیا تھا۔ پہلے اخبار رسالوں کا سٹال بند ہوا، پھر چائے والے

نے اپنا دڑبہ بند کیا اور شدہ شدہ چھابڑی والے بھی سدھار گئے۔ صبح ایک گاڑی برانچ لائن پر جاتی اور سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آتی۔

پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس نے عطیہ کا خط پرس میں بند کیا اور ویٹنگ روم سے باہر نکل آئی۔ پلیٹ فارم پر ایک قلی ٹرالی دھکیلتا ہوا جا رہا تھا اور دوسرا اسی ٹرالی کے کنارے بیٹھا اپنی پگڑی باندھ رہا تھا..... دور نیم اور شیشم کے درختوں میں گولائی پر گھومتی ہوئی لائن کے پاس سگنل اپنا پنکھ جھلکائے کھڑا تھا۔ سرکنڈوں کی اوٹ سے دھوئیں کا بادل بلند ہو رہا تھا اور گاڑی ادھر لپک رہی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سفید کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے اور سگنل کی جانب منہ کر کے کھڑی ہوگئی۔ سیاہ چرمی پرس اس کے سفید کوٹ کی آستین اور جیب کے درمیان سفید کلائی پر لٹک رہا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار سُست ہوتی جا رہی تھی اور ایک لمحے کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ سگنل کے پاس رُکی، سفید دھوئیں کا بادل چھوڑا اور ہولے ہولے پلٹنے لگی۔ وہ پلیٹ فارم پر اپنی سیاہ اونچی ایڑی ٹک ٹک کرتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ٹرالی پر بیٹھا ہوا قلی زور سے چلایا ''بیگم صاحب گاڑی آ رہی ہے، ایک طرف ہو جاؤ''..... اور اس نے ایک طرف ہونے سے پہلے دیکھا کہ گاڑی کو بریکیں لگ رہی تھیں اور مسافر اپنا سامان اٹھائے کھلے دروازوں میں کھڑے تھے۔

اونچی ایڑی کو پلیٹ فارم سے جو بھر اوپر اُٹھا کر اس نے دیکھا۔ فراز اپنی بانس کی چھڑی کا سہارا لے کر قلی سے سامان اُتھوا رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ گٹھڑی والے بابا کے ساتھ کھڑی ہو کر سٹیشن سے باہر نکل جائے لیکن اس سے پلٹا نہ گیا۔ شاید بابا دُور نکل گیا تھا!

جیبوں سے دونوں ہاتھ نکال کر اور سیاہ پرس کو درمیانی اُنگلی کی آخری پور پر لٹکا کر وہ جلدی سے آگے بڑھی اور فراز کے پیچھے جا کر ہولے سے بولی ''فرزی'' اور فراز کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے اخبار کے گرد لپٹی ہوئی مٹھی اس کے سفید کوٹ سے ڈھکے ہوئے سفید کندھے پر رکھ دی اور شرارت بھرے دیدے گھما کر بولا..... لیکن انجن نے اس زور سے سٹیم چھوڑی کہ کسی کو کسی کی بات سمجھ میں نہ آ سکی۔

وہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شیشم کی قوی ہیکل گول میز پر سٹیشن سے باہر کے نانبائی کی چائے روغنی پیالیوں میں پڑی تھی۔ فراز دونوں ٹانگیں کرسی کے بازو پر سے گزار کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹوں کی نوکوں پر باری باری بانس کی چھڑی مار رہا تھا۔ اس نے سر پیچھے لٹکا کر کہا:

''آپ کو اس علاقے میں میری تعیناتی کا اور خاص طور پر آج کی آمد کا پتہ کیسے چلا؟''

رعنا نے کہا ''ہمیں تمہاری کس بات کا علم نہیں ہوتا۔ اظہار نہیں کرتے تو تم سمجھتے ہو کہ ہم بے خبر ہیں۔'' پھر اس نے نظریں اُٹھا کر فرازی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور جبڑوں پر بڑھتی ہوئی شیو کا سرمگیں غبار چھا رہا تھا۔

رعنا نے چائے کا پیالہ اٹھا کر اپنے خشک ہونٹوں سے لگا لیا اور پیالے کے سبز کنارے پر سے فراز کی سانولی چھب دیکھنے لگی۔ فراز اسی طرح سر گرائے اور پیر جھلاتے ہوئے بولا ''آپ کی سہیلی ناراض تو نہیں ہوئی؟''

رعنا نے پیالہ ہونٹوں سے پرے ہٹا لیا اور متعجب ہو کر بولی ''ایسی باتیں پوچھنے کی ہمت باقی ہے کیا؟''

''کیوں؟'' فراز نے بڑے تحمل سے کہا ''اس

میں ہمت کی کیا بات ہے؟''

''دل پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہو۔'' رعنا نے مسکرا کر پوچھا ''یا اوپرے جی سے کہہ رہے ہو؟''

فراز سنبھل کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ صورت بنا کر بولا ''آپی! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی.....'' لیکن رعنا نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی اور سنجیدہ ہو کر بولی ''اب مجھے آپی کیوں کہتے ہو..... جب عطیہ کا رشتہ ہی بیچ میں نہ رہا تو آپی کیسے رہ گئی؟''

فراز نے کہا ''ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی رعنا کہ عطیہ میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر بے اختیار پیار آ جایا کرتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔''

''اور اب وہ محبت نہیں رہی؟'' رعنا نے سوال کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' فراز بولا ''جیسے بلاٹنگ پر پلاسٹک کی ہلکی سی تہہ چڑھا دی جائے۔ بلاٹنگ بھی رہے اور واٹر پروف بھی ہو جائے۔''

''اور عطیہ کے وہ سارے خط جو اس نے تمہیں لکھے تھے؟'' رعنا کو بلاٹنگ پیپر سے خط یاد آ گئے۔

''میرے پاس محفوظ ہیں۔''

''اور اگر انہیں تمہاری بیگم دیکھ لیں.....؟''

''میں نے کہا ناں کہ محفوظ ہیں۔''

''وہ خط بھی جو اس نے تمہیں ایبٹ آباد سے لکھا تھا؟''

''وہ بھی۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہے؟''

''اس نے تمہیں کون سا خط لکھا جو مجھے نہیں دکھایا۔ تمہارا کون سا خط تھا جو مجھے نہیں پڑھایا!''

''گویا ہماری محبت میں آپ کا بھی ہاتھ تھا!''

رعنا مسکرانے لگی لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس کی اسے توقع تھی۔ فراز کو یوں لگا جیسے اس نے عطیہ سے شادی نہ کر کے بڑی بھول کی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب وہ ساری ساری رات بیٹھ کر عطیہ کو طویل خط لکھا کرتا تھا اور پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ ایک یہ زمانہ ہے..... لیکن یہ کیسا زمانہ ہے! فراز سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بھی تو اچھا خاصا زمانہ ہے، کوئی ایسی بات نہیں جس کے متعلق.....

رعنا نے کہا ''جب ہم ایبٹ آباد میں تھے تو رات رات بھر تمہاری باتیں کیا کرتے تھے۔ عطیہ مجھے وہ سب کچھ بتایا کرتی تھی جو تم اس سے کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تم نے شعر کہنے بھی تو شروع کر دیئے تھے۔''

فراز مسکرایا اور کرسی کی پشت پر سر ڈال کر بولا ''ہاں، اس زمانے میں آزاد نظم کا بڑا رواج چل نکلا تھا اور میں بھی دوسروں کی تقلید میں مبہم قسم کی شاعری کیا کرتا تھا۔'' پھر وہ مسکرانے لگا اور اپنی ٹانگ ذرا اور زور سے جھلانا شروع کر دی۔ رعنا نے روغنی پیالے کے کنارے پر انگلی پھیری اور اپنی سرخ سرخ پور کو دیکھتے ہوئے بولی ''تم نے لکھا تھا..... جاگ اے جان شبستان تیری تاریکی میں، قافلے منزل جاناں.....''

فراز سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا ''میں نے یہ نظم تو کسی کو بھی نہیں دکھائی، پھر تم نے کہاں سے سنی؟''

رعنا کا رنگ ذرا پیلا پڑ گیا اور وہ مسکرا کر بولی ''جب تم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے پنڈی آئے تھے تو یہ نظم لکھ کر ساتھ نہیں لائے تھے.....؟''

''لایا تو ضرور تھا۔'' فراز وثوق سے بولا ''لیکن میں نے کسی کو سنائی تو نہ تھی۔''

''ضرور سنائی ہو گی۔'' رعنا نے کہا ''ذرا یاد تو کرو جب ہم شہر سے چلتے چلتے چھاؤنی کے راستے پر نکل گئے تھے اور تم ریڑھی والے سے ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں خرید کر لائے تھے۔''

فراز کے ذہن میں اس واقعے کی ہلکی سی تصویر

اُبھری اور پھر دھندلانے لگی۔ وہ تینوں..... عطیہ، رعنا اور وہ خود شام کی سیر کو نکلے تھے۔ مری کی ٹھنڈی ہوا میلوں کی مسافت طے کر کے پنڈی کی شاہراہوں میں داخل ہو رہی تھی اور بڑے بڑے اوور کوٹوں کے اندر ان کے جسم کانپ رہے تھے۔ دور ریلوے سٹیشن کی مدھم بتیوں کے اوپر ایک چمکدار ستارہ جگمگا رہا تھا اور رعنا آنکھوں پر ہاتھ رکھے جی ہی جی میں کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک دم ہاتھ چہرے سے اٹھا کر پہلے فراز کو اور پھر عطیہ کو دیکھا تھا اور بڑی آہستہ آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا ''خدا کرے تمہارا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ میرے ذہن میں یونہی جگمگاتا رہے۔'' اس پر فراز کو اپنا ہم جماعت احسن یاد آ گیا تھا جو ہمیشہ ایسی جذباتی حرکتیں کیا کرتا تھا۔

کوٹھی کے سامنے چھوٹا سا لان تھا جیسا کہ عام طور پر کوٹھیوں کے سامنے ہوا کرتا ہے۔ عام کوٹھیوں کے برعکس اس کا ایک گیٹ تھا۔ سامنے والے برآمدے کے ایک کونے میں گول کمرہ تھا اور دوسرے میں چوکور۔ فراز اسی گول کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا اور چوکور کمرے میں عطیہ اور رعنا رہتی تھیں۔ اب کی بار رعنا گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر نہ گئی تھی بلکہ سہیلی کے پاس پنڈی چلی آئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ان چھٹیوں میں فراز پنڈی آ رہا ہے اور شاید انہی چھٹیوں میں ان دونوں کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس نے عطیہ سے فراز کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا۔ فراز نے بھی رعنا کی بہت سی باتیں سنی تھیں مگر اس سے ملا نہ تھا۔ جب خالہ اماں اور عطیہ فراز کو سٹیشن پر لینے گئیں تو ان کے ساتھ رعنا بھی تھی اور یوں پنڈی ریلوے سٹیشن کے بڑے برآمدے میں ان کا تعارف ہوا۔

عطیہ بڑی متلون مزاج اور مغرور قسم کی لڑکی تھی جیسا کہ عام طور پر خوبصورت لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ بات بات پر روٹھ جاتی تھی، جیسے نوجوان لڑکیاں چچیرے اور خلیرے بھائیوں سے روٹھا کرتی ہیں۔ اسے فراز اچھا لگتا تھا، بہت ہی اچھا لیکن وہ ہر لمحہ اس معاملے کی جانچ میں لگی رہتی تھی کہ وہ اسے کس قدر چاہتا ہے، کتنا پیار کرتا ہے، کیسے کیسے نخرے برداشت کرتا ہے، ایک دن میں کتنی بار منا سکتا ہے۔ رعنا کو اس کا یہ رویہ پسند نہ تھا لیکن وہ اسے کس طرح سمجھاتی اور کیسے کہتی کہ فراز سے یوں نہ روٹھا کرو، وہ تو بہت ہی پیارا بچہ ہے! کیرم کھیلتے، تاش بانٹتے، ریکارڈ بجاتے وہ خوانخواہ فراز سے اُلجھ پڑتی اور پھر منہ سجا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ فراز اور رعنا گول کمرے میں اکیلے رہ جاتے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور سارا سامان قالین پر چھوڑ کر باہر نکل آتے..... فراز لان میں اور رعنا برآمدے میں سے ہو کر چوکور کمرے میں۔ پھر رعنا کے پاؤں میں ایک چکر آ جاتا..... چوکور کمرے سے لان تک اور لان سے پھر واپس چوکور کمرے تک صلح کی شرائط طے ہوتیں۔ معاہدے کے ضوابط مقرر ہوتے۔ دونوں فریقوں پر دبی زبان میں زور ڈالا جاتا۔ نسوانیت کا خیال رکھا جاتا۔ مردانگی سے اپیل کی جاتی۔ فراز لان سے اٹھ کر چوکور کمرے میں آتا، معافی مانگتا اور پھر عطیہ اسی طرح منہ سجائے مان جاتی..... اس ناراضگی کی مدت میں رعنا کو فراز کے ذرا سا قریب ہونے کا موقع ملتا۔ وہ عطیہ کے خلاف جو کچھ کہتا، رعنا کو حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ جی ہی جی میں اس کی ہاں سے ہاں ملائے جاتی لیکن فرض کے طور پر اپنی سہیلی کی خاطر وہ سب کچھ سہہ جاتی اور بس اسی قدر کہہ سکتی ''یقین مانو وہ اس قدر بُرا نہیں۔''

اور جب اپنی سہیلی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتی تو جھٹ کہتی ''اگر ہے بھی تو نہیں رہے گا۔ تم اسے

ایک موقع تو اور دو۔'' اور جب دونوں کی صلح ہو جاتی تو رعنا کو یوں لگتا جیسے وہ پنڈی میں ہوتے ہوئے بھی واپس اپنے گاؤں پہنچ چکی ہے۔

ایک دن خالہ نے رعنا کو علیحدگی میں بلا کر عطیہ اور فراز کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ وہ فراز کی والدہ کو خط لکھنا چاہتی تھیں لیکن انہیں ابھی تک عطیہ کے رویے کا ٹھیک سے اندازہ نہ ہوا تھا۔ رعنا کا جی چاہا کہ تعریف و توصیف کے وہ جملے جو اس نے وقتاً فوقتاً کبھی پڑھے تھے، سارے کے سارے فراز کی ذات سے منسوب کر دے، مگر وہ اپنی سہیلی کی وکیل تھی اس لیے اس نے خالہ کو یقین دلا دیا کہ عطیہ میں لاکھ خامیاں سہی، فراز کو اس سے اچھا رشتہ نہ مل سکے گا۔ خالہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن وہ کسی اور کے منہ سے اپنی بچی کی تعریف سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ''ڈاکٹری پاس کر لینے کے بعد فراز کو اچھی سی نوکری تو مل جائے گی ناں؟'' رعنا نے مسکرا کر کہا ''خالہ جان! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹروں کی جس قدر قلت ہے، آپ کے سامنے ہے۔ فراز کو تو امتحان پاس کیے بغیر اچھی سے اچھی نوکری مل سکتی ہے۔'' خالہ جان کو اسی جواب کی امید تھی لیکن انہوں نے منہ بنا کر کہا ''کیا کروں رعنا، کئی چیزیں سوچنا پڑتی ہیں۔ عطیہ کے لیے اتنے رشتے آ رہے ہیں کہ فراز کا نمبر بہت دُور جا پڑتا ہے لیکن اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر!''

''بے شک!'' رعنا نے ہولے سے کہا ''آپ کو ساری باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس معاملے میں ٹھیک سے کوئی رائے نہیں دے سکتی۔'' پھر وہ خاموش ہو گئی اور اس کے سامنے کسی قصبے کا ایک چھوٹا سا سکول اُبھر آیا جس کی چار دیواری کچی اینٹوں سے بنی تھی، اندر چنبیلی اور موتیے کے پودے تھے، صحن میں شیشم کے پیڑوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا، پی ڈبلیو ڈی کے تعمیر کردہ چار پانچ کمرے تھے اور ان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں وہ ہیڈ مسٹریس کی زندگی گزار رہی تھی۔ چند مقامی استانیاں تھیں، ایک بوڑھا سا چوکیدار تھا اور دھوپ میں بیٹھی رہنے والی موٹی سی ''بلاوی'' تھی..... عطیہ اور فراز کسی بڑے شہر کی ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے اور صبح صبح ایک مہذب بیرا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا ان کے کمرے میں ناشتہ لایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں بچہ ہونے والا تھا اور عطیہ نے اپنے خط میں یہ بات بڑے پوشیدہ طریق پر کافی وضاحت سے رعنا کو لکھی تھی۔

''ہاں تو پھر؟'' خالہ نے پوچھا اور رعنا اپنے خواب سے چونک اٹھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور ہولے سے کہا ''آپ بسم اللہ کر کے لکھ ہی دیں خالہ جان!'' خالہ اماں نے ہامی بھر لی اور رعنا لان میں آ کر کیرم کا مقابلہ دیکھنے لگی۔

اس سے ایک دن پہلے کی بات ہے..... فراز اور عطیہ کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کبھی نہ بولنے کا عہد کر لیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ تینوں گول کمرے میں بیٹھے ریڈیو پر ڈرامہ سن رہے تھے۔ یہ کسی انگریزی ڈرامے کا ترجمہ تھا۔ فراز اس میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور عطیہ بار بار اسے بند کر دینے کو کہہ رہی تھی۔ رعنا معاملے کو تشویش ناک صورت سے بچانے کے لیے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی ''کوئی بات نہیں، بس منٹ باقی ہیں۔ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔'' لیکن عطیہ اسی بات پر تلی ہوئی تھی کہ ریڈیو ہر حال میں ڈرامہ ختم ہونے سے پہلے بند ہونا چاہیے۔ فراز عطیہ کی باتوں کی پرواہ کیے بغیر مزے سے ریڈیو سنتا رہا اور بیچ بیچ میں مسکراتا بھی رہا۔ عطیہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ چپکے سے اٹھی اور برآمدے میں جا کر مین سوئچ آف

کر دیا۔ ساری کوٹھی کی بتیاں بجھ گئیں۔ اندر سے خالہ جان کی آواز آئی ''یہ بجلی آج پھر چلی گئی۔'' فراز نے کمرے سے کوئی جواب دینا چاہا تو رعنا نے اندھیرے میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی ''خالہ جان سے کچھ نہ کہیئے گا، وہ خوامخواہ پریشان ہوں گی۔ میں باہر جا کر عطیہ کو سمجھاتی ہوں۔'' اپنا یہ فقرہ ختم ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی رعنا نے وہ ہاتھ یونہی فراز کے منہ پر رہنے دیا اور پھر ٹٹولتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل گئی۔

ایک لمحے میں کوٹھی کی بتیاں پھر جگمگا اُٹھیں۔ عطیہ جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی اور رعنا سٹول کھینچ کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے مناتی سمجھاتی رہی پھر مایوس ہو کر اُٹھی اور فراز کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا اور میز کی ساری چیزیں سمیٹ چکا تھا۔ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی فولاد سے پنجے کے تیز ناخن اس کے کلیجے میں گھسے جا رہے ہیں اور وہ گوشت چرنے کی آواز سن رہی ہے۔ اس نے کواڑ کے ساتھ لگ کر ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا ''یہ کیا کر رہے ہو فرزی؟''

فراز نے سر اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا ''کچھ نہیں۔ یونہی بس سامان ٹھیک کر رہا ہوں۔''

رعنا نے کہا ''سامان اس طرح تو ٹھیک نہیں کیا کرتے۔''

فراز نے کہا ''ہمارے یہاں ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔ جب کسی کو اشاروں ہی اشاروں میں بستر گول کرنے کی تجویزیں ملنے لگیں تو وہ سخت احمق ہوگا اگر.....''

''تم غلط سمجھتے ہو۔'' رعنا نے بات کاٹ کر کہا ''عطیہ کا دل بُرا نہیں ہے، اس کا یہ مطلب تو نہ تھا۔''

''یہ عجب بات ہے۔'' فراز نے مڑ کر کہا ''جب بھی کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس کے حمایتی مظلوم کو یہی کہنے آ جاتے ہیں کہ اس کا دل بُرا نہیں ہے۔''

رعنا نے کہا ''میں اس کی حمایتی تو نہیں ہو فرزی!''

''اور کیا میری ہیں؟'' فراز نے چڑ کر کہا اور رعنا خاموش ہو گئی۔

پھر وہ دبے پاؤں عطیہ کے کمرے کی طرف لپکی لیکن راستے ہی میں رُک گئی۔ اس کا دل چاہا کہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے لگ جائے اور اس وقت تک روتی رہے جب تک اس کا جسم سیڑھیوں کی طرح سرد نہ ہو جائے۔ اس نے اندر جا کر لیٹی ہوئی عطیہ کا شانہ جھنجھوڑا اور خوفزدہ آواز میں کہا:

''فراز جا رہے ہیں عطیہ!''

عطیہ نے جھنجھلا کر شانہ چھڑوا لیا اور تنک کر بولی ''جانے دو، اس کے بغیر شہر اُجڑ جائے گا کیا؟'' اور رعنا کو یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو ''جانے دو، سورج نہ چڑھے گا تو شہر میں اندھیرا ہو جائے گا کیا!'' فراز چلا جائے اور پنڈ کا دیس بستا رہے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بھلا۔'' اس نے ساجت بھرے لہجے میں عطیہ سے کہا ''اٹھو تو سہی، ایک بار اس کے کمرے تک تو چلو۔''

لیکن عطیہ نے چڑ کر رضائی سے سر ڈھانپ لیا اور نیند بھری آواز میں منمنائی ''رہنے دو رعنا۔ آؤ سو جاؤ۔''

تھوڑی دیر تک رعنا چارپائی کے پائے پر پاؤں رکھے کھڑی رہی۔ پھر شال کو کندھوں کے گرد لپیٹ کر گول کمرے کی طرف چلی۔ فراز اپنی چپلیاں اخبار کے کاغذ میں لپیٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر رعنا کی طرف دیکھا اور پھر پیکٹ کے گرد رسی لپیٹنے لگا۔

رعنا کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور دردناک لہجہ میں بولی ''تم واقعی جا رہے ہو فراز؟''

"ستی"

معروف سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامے "عجب اسفار" میں ستی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے کہ جب ایک 'بیوہ' نے ستی کا ارادہ کیا تو تین دن پہلے گانے بجانے میں مشغول ہوگئی۔ گویا دنیا سے رخصت ہونے کو تھی۔ چوتھے دن اس کا بناؤ سنگار کر کے اسے خوشبوئیں لگا کر گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک ناریل تھا جسے وہ اُچھالتی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس سے وہ خود کو دیکھے جاتی تھی۔ نقارے اور نوبت بجتے جاتے تھے۔ ہر ہندو برہمن جھک کر اسے کہتا کہ میرا سلام میری مُردہ ماں، باپ، بھائی، بہن تک پہنچا دینا اور وہ کہتی کہ اچھا اور ہنستی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ عورت ایک حوض کے پاس پہنچی وہاں اس نے غسل کے بعد ایک موٹی ساڑھی پہن لی اور پھر اس کے نزدیک آگ بھڑکائی گئی اور اس پر سرسوں کا تیل چھڑک دیا گیا اور اس نے اس حالت میں آگ میں چھلانگ لگادی۔ نقارے بجنے شروع ہو گئے اور اردگرد موجود لوگوں نے آگ پر لکڑیاں ڈالنی شروع کر دیں اور اس کے اوپر بڑے بڑے ڈنڈے پھینک دیئے گئے تا کہ وہ عورت آگ کے اندر حرکت نہ کر سکے۔ ابن بطوطہ یہ منظر دیکھنے کے بعد بے ہوش ہوگیا۔

(مرسلہ: ناصر حمید۔ قصور)

☆☆☆

فراز نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا "جی" اور اپنا اٹیچی کیس کھول کر پیکٹ اس میں ڈال دیا۔

"خالہ جان پوچھیں گی تو کیا جواب دو گے؟" رعنا نے پوچھا۔

"کہہ دُوں گا گھر سے تار آ گیا ہے، کوئی ضروری کام ہے۔"

"اور اگر انہوں نے کہا تار مجھے دکھاؤ؟"

"تو میں کہوں گا میں نے پھاڑ ڈالا ہے۔"

"اگر وہ نہ مانیں تو؟"

"تو بھی میں چلا جاؤں گا۔"

رعنا نے ہولے سے کہا "عطیہ کا قصور ایسا سنگین تو نہیں کہ معافی ہی نہ دی جا سکے۔"

فراز نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "یہاں معافی مانگنے ہی کون آیا ہے جو دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"میں جو مانگنے آئی ہوں اس کی جگہ!"

"کوئی کسی کی جگہ معافی کیوں مانگے۔ رعنی آپ...... اور پھر آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے؟"

"مجھے ضرورت پڑی ہے ناں۔" رعنا نے رونکھی آواز میں کہا "بس اسے معاف کر دو۔ وہ بیوقوف ضرور ہے بُری نہیں۔"

فراز سوچ میں پڑ گیا تو رعنا کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا فراز کی سیدھی مانگ کافی چوڑی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر تین چار سفید بال برقی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی جھولی میں ڈالی ہوئی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک رعنا اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ فراز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں دھند کی راتوں میں پنڈ کے سنسان کوچے نظر آئیں۔

"اسے ابھی اس بات کا احساس نہیں ہے۔" فراز نے بڑی محبت سے رعنا کا کندھا تھپتھپایا اور آہستہ سے کہا "کاش ہمیں بھی زندگی میں ایسا ہی کوئی دوست میسر آتا!"

اگلے دن جب فراز سو کر اُٹھا تو اس کی ساری

چیزیں بڑے قرینے سے کمرے میں سجی ہوئی تھیں اور آئینے کے پاس اس کی سیاہ نوٹ بک پڑی تھی جس میں وہ آزاد نظمیں لکھا کرتا تھا۔

ویٹنگ روم کے سامنے سے وہی قلی ٹرالی دھکیلتا ہوا گزرا تو فراز اپنے خواب سے چونکا اور اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھنے لگا "میں نے وہ نظم تو کسی کو بھی نہ دکھائی تھی، پھر تم نے کہاں سے سنی رعنی؟"

رعنا نے کہا "عطیہ نے تمہاری نوٹ بک سے پڑھ کر مجھے سنائی تھی۔"

"لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔" فراز نے کہا۔

"تم سے کیسے کرتی؟" رعنا نے مسکرا کر کہا "چوری کا مال ہر ایک کو تو نہیں دکھایا جاتا ناں۔" پھر اس نے شیشم کے قوی ہیکل میز سے اپنا پرس اٹھا کر گود میں ڈال لیا اور سوالیہ نگاہوں سے بولی "اب تو عطیہ کا کوئی خط نہیں آتا؟"

فراز نے کہا "اس نے پہلے مجھے کتنے خط لکھے تھے جواب آتا۔ سنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

رعنا خاموش رہی۔

فراز نے پھر پوچھا "ہو رہی ہے ناں اس کی شادی؟"

رعنا نے سر جھکا کر کہا "تمہیں کیا، اب وہ چاہے کچھ ہی کرے۔ تم مردوں سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ شادی کروانے سے پہلے کم از کم اپنے آپ سے ہی پوچھ لیں کہ......" لیکن وہ پھر خاموش ہو گئی اور فراز نے آگے ہو کر پوچھا "کیا؟"

رعنا نے کہا "کچھ نہیں...... کسی کو کسی پر کوئی حق نہیں ہوتا لیکن ایک وقت آتا ہے...... نجانے کہاں سے آ جاتا ہے وہ وقت...... جب یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی کا حق چھینا جا رہا ہے۔"

فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن دندناتی ہوئی ایکسپریس کے کھڑکھڑاتے ڈبے ویٹنگ روم کے سامنے سے گزرے اور چشم زدن میں گاڑی کو چیخیں مارتی بریکیں چمٹنے لگیں۔ فراز ہڑبڑا کر اٹھا اور کرسی کے ساتھ لگی ہوئی اپنی چھڑی اٹھالی۔ رعنا بھی اٹھی اور اس نے اپنا پرس کلائی پر ڈال کر پھر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے۔ وہ دونوں ویٹنگ روم سے نکلے تو قلی فراز کا سامان اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے صاحب کو باہر نکلتے دیکھا تو انجن کی جانب چل دیئے۔ فراز نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے سر باہر نکال لیا...... اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی رعنا سے کہا "کبھی کراچی آیئے۔"

رعنا دکھ بھرے انداز میں مسکرائی اور اپنے سینڈل کو سگریٹ مسلنے کے طریق پر رگڑتے ہوئے بولی "اگر عطیہ ہوتی تو شاید...... لیکن میرا خیال ہے......" پھر وہ چپ ہوگئی۔

فراز کھڑکی سے اور آگے جھک آیا اور بولا "لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر عطیہ ہوتی تو پھر بھی نہ آتیں؟"

رعنا کا سر اور جھک گیا۔ اس نے دیکھا فرش پر ایک مکوڑا دن بھر دانے دنکے کی ناکام تلاش کے بعد گھر واپس جا رہا تھا۔ فراز نے اپنی دونوں کہنیاں کھڑکی میں جما کر قدرے زور سے کہا "رعنی......"

لیکن نہ گھنٹی بجی نہ سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی کھڑانک سے اپنے پہیوں پر یوں آگے لپکی جیسے پیچھے کسی دیوانے انجن نے زور کی ٹکر دے ماری ہو۔

رعنا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فراز کا ڈبہ کئی گز آگے نکل چکا تھا پھر اور ڈبے آئے، اور ڈبے گزرے اور سٹیشن یوں خالی ہو گیا جیسے لڑائی کے بعد کچی بارکیں!

موت کا انتظار.....

ایس۔ امتیاز احمد

''اور تم جانتی ہو تھیلما کہ ہم یہ کام کس طرح سرانجام دیں گے؟ کھانے کے ساتھ اس کھانے کے ساتھ جو ہر رات تم اسے دیتی ہو۔ بڑھیا کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ کیونکہ اس زہر کا کوئی اپنا ذائقہ نہیں ہوتا، چٹکی چٹکی پاؤڈر ہر ڈش میں ڈال دینا تھیلما! چٹکی چٹکی پاؤڈر ہر رات..... جب تک کہ.....''

اس کہانی کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اسے ہنری سلاسر نے لکھا ہے

تھیلما گیارہ سال سے گورڈن ہوٹل میں بطور ویٹریس ملازم تھی۔ ایک روز ہوٹل کی مالکہ میریان نے جو اس کے قریب سے گزر رہی تھی، تیز لہجے میں کہا ''تھیلما! میں دیکھ رہی ہوں، آج کل تم دل لگا کر کام نہیں کرتیں۔ نہ جانے کس کے خیالوں میں رہتی ہو؟''

''وہ مسز منرو.....'' تھیلما نے کونے کی ویران میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہ خلاف معمول ایک گھنٹے لیٹ ہیں۔ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو؟''

''تمہیں اس کے لیے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بڑھیا ابھی آتی ہی ہوگی۔''

لیکن تھیلما اس کے لیے پریشان کیوں نہ ہوتی۔ مسز منرو سے اسے بے پناہ اُنس تھا، یہی وجہ تھی کہ رہ رہ کر اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ خدانخواستہ مسز منرو کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔

جب وہ باورچی خانے سے دوبارہ کھانے کے ہال میں آئی تو مسز منرو اپنی مخصوص میز پر بیٹھی تھی، زرد زرد، لاغر جسم کی پستہ قد خاتون، انہوں نے سیدھا سادہ سفید لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ کچھ علیل معلوم ہو رہی تھیں۔ بے چاری مسز منرو، کتنی بوڑھی ہیں، نوّے سے کم تو کبا ہی ہوں گی، اور اب تو جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا ہے وہ موت سے قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ یہ سوچتی ہوئی ان کے پاس اشتیاق سے دوڑی۔

''مسز منرو! کہیے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' تھیلما نے اپنے ہاتھ میز پر ٹیکے اور اونچا سُننے والی مسز منرو کے کان کے قریب لے جاتے ہوئے کہا ''مجھے آپ کے متعلق بڑی تشویش ہو رہی تھی کہ آج آپ کھانا کھانے نہیں آئیں۔ کیا پھر آج رات نصیب دشمناں طبیعت ناساز تھی؟''

''ہاں، بات کچھ ایسی ہی تھی۔'' عمر رسیدہ خاتون نے سفید نیپکن کھولتے ہوئے کہا ''آج واقعی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تھیلما اور تم میری بچی میرے بارے میں اتنی فکرمند نہ رہا کرو۔''

''ارے آپ نے ڈاکٹر کو طلب نہیں کیا؟ واقعی آپ کی طبیعت پہلے سے بہتر نظر نہیں آتی۔''

''دیکھو تھیلما! مجھ سے ڈاکٹر واکٹر کے بارے میں بات نہ کیا کرو، میں نے تیس سال ہوئے کسی ڈاکٹر کی شکل نہیں دیکھی۔ اس وقت سے نہیں جب اس بوڑھے بیوقوف ڈاکٹر ویٹ نے کہا تھا کہ تم چند دن میں مر جاؤ گی۔'' اس نے آہستگی سے تھیلما کا ہاتھ تھام لیا۔ ''لیکن میں ممنون ہوں کہ تم میرے بارے میں خاصی فکرمند تھیں۔ تھیلما ڈیئر! کتنا اچھا ہو کہ کوئی تمہارے بارے میں بھی فکرمند رہا کرے۔''

ویٹریس کی آنکھیں مسز منرو کی اس بات پر بے اختیار نم ہو گئیں، آنسو اس کی آنکھوں میں اسی طرح جھلملا رہے تھے جیسے ابھی باہر نکل آئیں گے۔

جب تھیلما دودھ کا گلاس لے کر مسز منرو کی میز پر پہنچی تو وہ گوشت کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو کاٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

''تم بہت اچھی بچی ہو۔'' مسز منرو نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تھیلما نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا ''میری عمر چالیس سال ہے مسز منرو۔ میں بچی قطعاً نہیں ہوں۔''

''تھیلما..... تم میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے کچھ باتیں نہیں کر سکتیں؟''

''کس کے بارے میں آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں؟''

''تمہارے بارے میں۔ تم بُرا تو نہیں مانو گی؟''

''میرے بارے میں؟ مجھ بدنصیب کے بارے میں آپ کیا بات کریں گی؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں تھیلما کہ تمہاری گزر بسر کس طرح ہوتی ہے؟''

''جیسے پہلے ہوتی تھی۔''

''اور وہ تمہارا بھائی! جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا، کیا حال ہے اس کا؟''

''کون؟ آرتھر..... وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بہت زیادہ نہیں کماتا تاہم گزارے لائق تو آمدنی ہو ہی جاتی ہے اس کی۔'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے تمہیں اپنے بھائی سے بہت محبت ہے۔''

''جی ہاں۔ ڈیڈی کے مرنے کے بعد وہی تو

میرا سب کچھ ہے، اس کی عمر پینتیس سال ہوگئی ہے لیکن معاشی آسودگی اسے اب تک حاصل نہیں ہوئی۔ بس مشکل سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"یقیناً یہ....." کہتے ہوئے مسز منرو پر کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔

"کیا میں پہلے پانی لاؤں؟"

"نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں تھیلما۔ پہلی مرتبہ میں اپنے آپ کو عمر رسیدہ محسوس کرنے لگی ہوں..... بعض اوقات میں سوچتی ہوں وقت قریب آ گیا ہے۔"

"اوہ مسز منرو۔" آنسو پھر اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے۔

"میں بہت امیر بیوہ ہوں۔ اتنی امیر کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو، میری ایک نواسی کیلیفورنیا میں ہے۔ اسے بھی بہت کچھ ملے گا کیونکہ وہ میرے خاندان کی واحد فرد ہے لیکن اسے میری ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے لیکن میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں تمہارا خاص خیال رکھوں گی۔"

تھیلما کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات پیدا ہوئے جسے اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میرا خاص خیال رکھیں گی؟"

"اپنے وصیت نامہ میں کیونکہ تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ پچھلے آٹھ سال میں جس طرح تم نے میری خدمت اور دلجوئی کی ہے اسے میں فراموش نہیں کر سکتی۔ جب میں مروں گی تو تم اس قابل ہو گی کہ اس جگہ کو چھوڑ سکو اور کسی اچھے لڑکے سے شادی کر سکو۔ پھر تمہیں عیش و عشرت کی ہر چیز مہیا ہو سکے گی۔ تمہیں اور تمہارے بھائی کو۔"

"اوہ! مسز منرو، نہیں نہیں..... میں آپ کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن موت کو تو کوئی نہیں روک سکتا اور پھر جو کچھ میں کہتی ہوں اس پر عمل بھی کرتی ہوں۔"

اب اسے سانس لینے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مسز منرو..... بے چین ہو اٹھی۔

"میں ٹھیک ہوں تھیلما، میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" جب اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھولیں، وہ بالکل پُرسکون اور چمکدار تھیں۔

جب تھیلما گھر پہنچی تو اس وقت گیارہ بج کر تین منٹ ہو رہے تھے، آرتھر ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھا تھا، تھیلما نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا اور مضمحل سا ہے۔

"آرتھر، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"لیکن کیا اس وقت میرا دماغ چاٹنا ضروری ہے؟"

"پاگل نہ بنو۔ یہ بہت ضروری گفتگو ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنے سے بھی زیادہ ضروری۔"

"میں نے تمہیں کہا نا کہ اس وقت میرا دماغ نہ چاٹو۔"

"آرتھر میں جو بات تمہیں بتانے والی ہوں اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔"

اپنے فائدے کا سُن کر آرتھر کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے اب بڑی دلچسپی سے تھیلما کی طرف دیکھا۔

جب تھیلما نے اپنی بات ختم کی تو آرتھر کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنی پشت آرام دہ کرسی سے ٹکا دی۔

"تمہارے خیال میں کتنی رقم ہو گی؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ اس کا شوہر مچھلی اور جھینگے ایئر ٹائٹ ڈبوں میں بند کر کے غیر ممالک بھیجنے کا

کاروبار کرتا تھا لیکن کئی سال ہوئے اس کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے اس کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور وہ بہت بیمار بھی نظر آتی ہے۔ بیچاری بوڑھی خاتون....."

"یہی تو اہم بات ہے۔" اس کے بھائی نے کہا "اگر وہ جلد ہی مر گئی یعنی آئندہ چند مہینوں میں تو پھر وہ رقم مختلف دھندوں میں لگا دوں گا جو میں نے پہلے ہی سوچ رکھے ہیں۔"

"آرتھر، تمہیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔"

"زیادہ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری بوڑھی دوست کی موت نہیں چاہتا لیکن اگر وہ واقعی بیمار ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ....."

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

دو مہینے ہو گئے اور تھیلما کی نظریں کونے کی میز پر جمی رہیں، ایک رات کے بعد دوسری رات لیکن مسز منرو بلاناغہ رات کا کھانا کھانے کے لیے آتی رہیں البتہ ان کا رنگ مزید زرد ہو گیا تھا اور چلنے میں ان کو کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔

"ذرا اس بڑھیا کو تو دیکھنا۔" ہوٹل کی مالکن نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن وہ رات کا کھانا کھاتے نہ چل بسے، اتنی عمر رسیدہ خاتون کو تو اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔"

تھیلما نے کوئی جواب نہیں دیا، اب وہ مسز منرو کا بے حد خیال رکھنے لگی تھی، نیپکن کھول کر اس کے زانو پر رکھنا، بھنے ہوئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دینا، دودھ کا گلاس بڑے ادب سے پیش کرنا، تھیلما کو معلوم تھا کہ وہ جو خدمت کر رہی ہے، اس میں انسانی ہمدردی کے علاوہ اس کے مفاد کو بھی کافی دخل تھا۔

تیسرا اور چوتھا مہینہ گزر گیا۔ مسز منرو بدستور ریستوران آتی رہیں، مگر اب وہ بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھیں، اور اب تھیلما کے دل میں یہ خواہش شدت سے اُبھرنے لگی تھی کہ وہ مر کیوں نہیں جاتیں۔

مگر مسز منرو نہیں مریں، روزانہ وہ ریستوران میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آتیں اور کھانا کھا کر اسی طرح واپس چلی جاتیں اور ایک مرتبہ تو وہ اپنی میز پر بیہوش ہو گئیں لیکن

"اُلو"

"اُلو ہمارے بھائی ہیں" یہ مستنصر حسین تارڑ کی ایک کتاب کا نام ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اُلوؤں میں دلچسپی رکھنے والے باذوق حضرات کے لئے یہ خبر باعث صد مسرت ہو گی کہ یورپ میں ایک ماہر حیوانات نے اُلوؤں کے بارے میں بے شمار حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے۔ جب پردہ اُٹھایا گیا تو پردے کے پیچھے بھی اُلو تھے۔

بس ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اُلو کے بارے میں تحقیق پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ ورنہ ہمارے ہاں اُلوؤں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر اُلو ہے اور بڑا بڑا اُلو ہے بلکہ ہر شاخ پر اُلو بیٹھا ہے۔ اُلو انسانی حماقت کا آنکھیں جھپکتا ثبوت ہے۔ اہل یورپ اسے عقل و دانش کی علامت کے طور پر اپنی درسگاہوں کی نشانی بناتے ہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں کے لیٹر پیڈ پر اُلو کی شکل بنی ہوتی ہے۔ اور ادھر مشرق میں اُلو کو حماقت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اُلو اور بیوقوف کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں اُلو کا قصور نہیں۔ یہ انسان ہے جو ایک پرندے کو بیک وقت عاقل اور احمق سمجھتا ہے۔

(مراسلہ: عماد لاہوری، نوناریاں)

☆☆☆

کچھ ہی دیر بعد ہوش میں آ گئیں۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا، اس مرتبہ وہ اتنی بیمار ہوئیں کہ ہوٹل کی تیسری منزل سے نیچے ریستوران میں آنا ان کے لیے مشکل ہو گیا اور تھیلما اب ان کا کھانا ٹرے میں رکھ کر تیسری منزل پر لے جانے لگی، جب بھی تھیلما بوڑھی خاتون کے کمرے کا دروازہ کھولتی تو اسے یہ توقع ہوتی کہ وہ مُردہ ملے گی لیکن ہر مرتبہ نرم تکیے پر سر رکھے وہ اسے زندہ ملتی۔

موسم بہار بیت گیا اور پھر موسم گرما اور پھر خون اور ہڈیوں کو منجمد کر دینے والا موسم سرما آ گیا۔ یہ وہ موسم تھا جب بوڑھے ناقابل برداشت سردی کی وجہ سے مر جاتے ہیں لیکن اب ہر رات کونے والی میز پر مسز منرو آ موجود ہوتیں۔

''میں تو اب اس انتظار سے تنگ آ گیا ہوں۔'' ایک صبح آرتھر نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

''آرتھر۔'' تھیلما چیخی۔

''چیخنا چلانا بند کرو تھیلما۔ تم خود بھی تنگ آ گئی ہو۔ اب تم اس بوڑھی عورت سے نفرت کرنے لگی ہو۔''

''نفرت؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں تو مسز منرو کو بہت چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔ یہی کہہ کر دراصل اپنے آپ کو تم مطمئن کرنا چاہتی ہو۔'' آرتھر یہ کہتے ہوئے بے اختیار ہنسنے لگا۔ ''تم اب اس سے نفرت کرنے لگی ہو، تم چاہتی ہو کہ اب وہ بڑھیا جلد از جلد مر جائے، یہی وجہ ہے کہ تم اب اس کے ذکر پر چڑنے لگی ہو۔''

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔'' تھیلما نے کہا مگر وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اسے میرے دل کا حال کیسے معلوم ہوا؟ اس نے سوچا۔ حقیقتاً وہ اب بڑھیا سے نفرت کرنے لگی تھی۔

''میں تمہارے چہرے کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہوں۔'' آرتھر نے کہا۔ ''جوں جوں دن گزر رہے ہیں بڑھیا سے تمہاری نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے مرنے میں ابھی کافی عرصہ لگے گا۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔''

''اب تو پورے آٹھ ماہ ہو گئے تھیلما ممکن ہے وہ سو سال تک زندہ رہے؟''

''لیکن وہ بہت بیمار ہے۔''

''تو پھر مر کیوں نہیں جاتی؟''

''آرتھر..... خدا کے لیے۔''

''کیوں نہ ہم مرنے میں اس کی مدد کریں۔''

تھیلما حیرت زدہ ہو کر آرتھر کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ تھیلما نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ سوچنے لگی۔ آرتھر نے اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کیا اور بولا ''یہ کام بہت آسان ہے تھیلما۔ بہت ہی آسان۔ اور یہ کوئی بھی جرم نہیں ہے، یہ تو ثواب کا کام ہے۔ تم خود سوچو بیماری سے کس قدر اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اگر ہم اسے اس اذیت ناک بیماری سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دیں تو کتنا اچھا ہو، تم اسے تکلیف سے نجات دلا سکتی ہو تھیلما۔''

''بند کرو یہ بکواس۔''

اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''اور تم جانتی ہو تھیلما کہ ہم یہ کام کس طرح سرانجام دیں گے؟ کھانے کے ساتھ اس کھانے کے ساتھ جو ہر رات تم اسے دیتی ہو۔ بڑھیا کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ کیونکہ اس زہر کا کوئی اپنا ذائقہ نہیں ہوتا، چٹکی چٹکی پاؤڈر ہر ڈش میں ڈال دینا تھیلما! چٹکی چٹکی پاؤڈر ہر رات..... جب تک کہ.....''

''تم پاگل ہو گئے ہو، تم بالکل پاگل ہو گئے ہو آرتھر۔''

''لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے

سنو۔'' میں تمہیں بہت سا پاؤڈر اپنی دکان سے لا دُوں گا، اتنا کہ جتنی ضرورت ہو گی پھر تم اسے ہر رات کھانے میں ملاتی رہنا۔ یہ تمہارے لیے بہت آسان ہے۔ کیا نہیں ہے؟ بتاؤ کیا نہیں ہے یہ آسان؟''

''ٹھیک ہے آرتھر۔'' بالآخر تھیلما نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

باورچی خانے اور کھانے کے بیچ والے کمرے میں تھیلما چند لمحوں کے لیے رُکی، صرف چند لمحوں میں اس نے زہر کی دو چٹکیاں بھنے ہوئے گوشت میں ملا دیں اور پھر اس نے ٹرے اٹھائی اور کھانے کے ہال میں آ گئی جہاں مسز منرو بے چینی سے اس کی منتظر تھیں۔

جب تک اس نے کھانا ختم نہ کر لیا وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ کافی نروس ہو رہی تھی، اس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے جنہیں اس نے اپنے ایپرن کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔

واقعی بوڑھی خاتون کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا، اس نے حسب معمول دلچسپی سے کھانا کھایا۔

دوسری رات اس نے اپنا کام اور بھی آسانی سے سرانجام دیا۔

اور اسی طرح تیسری اور چوتھی رات کو بھی لیکن مسز منرو نہیں مریں۔

''یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔'' آرتھر نے کہا ''کیا اس کی طبیعت بہت خراب نظر نہیں آتی؟ میرا مطلب ہے نیم مُردہ سی؟''

''نہیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ زہر دینے سے پہلے اور بعد میں اس میں کیا تبدیلی ہوئی، میرا مطلب ہے جیسے اس کی حالت پہلے تھی سو اب بھی وہی ہے، وہ ہر وقت بیمار سی لگتی ہے۔''

دوسری رات مسز منرو کھانا کھانے نیچے نہیں آئیں اور تھیلما کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس نے سوچا ضرور بڑھیا کا کام تمام ہو گیا ہے لیکن اس کے ایک گھنٹے کے بعد ہی مسز منرو دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترتے ہوئے نیچے آ گئی اور کھانا منگوایا، تھیلما نے حسب معمول زہر کی دو چٹکیاں ملا کر کھانا ان کی میز پر رکھ دیا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا لیکن مسز منرو نہیں مریں۔

''کیا تمہیں اس زہر کے بارے میں پورا یقین ہے؟'' تھیلما نے اپنے بھائی سے ایک روز پوچھا۔

''بالکل مجھے پورا یقین ہے لیکن ہمیں خوراک کی مقدار میں اضافہ کر دینا چاہیے اس سے وہ جلد مر جائے گی۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔ پہلے کے مقابلے میں اب اس کی طبیعت خراب نہیں لگتی آرتھر۔ بعض اوقات میں سوچتی ہوں اس کی عمر سو سال مقرر ہے۔''

''اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ دو سے چار چٹکیاں کر دیں، دو ہفتے اور گزر گئے، چودہ راتیں، چھپن چٹکیاں زہر، لیکن بجائے طبیعت بگڑنے کے وہ پہلے کی نسبت ٹھیک نظر آنے لگیں۔''

دوسرے دن شام کو اس نے طے کر لیا کہ وہ ساری پڑیاں مختلف ڈشوں میں ڈال کر بڑھیا کو کھلا دے گی تاکہ وہ جلدی مر جائے۔

چند منٹ بعد وہ مسز منرو کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔'' مسز منرو نے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نیچے نہیں آ سکی۔''

تھیلما نے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹرے کو دروازے کے قریب، مسز منرو کی پشت کی طرف، میز پر رکھ دیا، اس نے چائے کے دو چمچے کیتلی کے

گرم پانی میں ڈالے اور پھر اپنا ہاتھ ایپرن کی جیب میں ڈالا۔

جیب خالی تھی، وہ زہر تو بھول ہی آئی تھی۔

''تم چائے کے ساتھ دودھ نہیں لائیں؟''

بوڑھی خاتون نے بستر سے نیچے اُترتے ہوئے کہا ''تم دودھ لانا بھول گئیں تھیلما۔''

''ہاں۔'' اس نے قدرے برہمی سے کہا ''میں واقعی دودھ بھول آئی ہوں۔''

''لیکن میں تو دودھ کے بغیر چائے نہیں پیتی تھیلما، کیا تم کچھ دودھ لا سکتی ہو؟''

تھیلما نے غصیلی نظروں سے بوڑھی خاتون کی طرف دیکھا ''میرے پاس دودھ نہیں ہے مسز منرو آپ بغیر دودھ کی چائے پی لیں۔''

''میں نہیں پی سکتی۔'' مسز منرو نے جھلا کر کہا ''میں ہرگز دودھ کے بغیر چائے نہیں پی سکتی۔ میں ہمیشہ دودھ کی چائے پیتی ہوں۔''

''اور میں آپ کے لیے دودھ بالکل نہیں لاؤں گی۔'' تھیلما چیخی ''چاہے کچھ بھی ہو جائے میری جو مرضی ہو گی وہی میں کروں گی۔'' کیا سمجھیں۔

''کیوں تھیلما؟''

''میں وہی کام کروں گی مسز منرو جو میرا دل کہے گا۔ آپ کا خیال ہے کہ میں ویٹرس اس لیے ہوں کہ مجھے اس پیشے سے پیار ہے یا پھر ہوٹل میرا گھر ہے۔ آپ کے خیال میں کیا میں اس غلیظ باورچی خانے میں کام کرنا، گندی پلیٹیں دھونا اور مالکن کی بک بک جھک جھک پسند کرتی ہوں؟''

مسز منرو سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، آخر انہوں نے چونک کر کہا ''تمہیں اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھیلما۔''

''جس طرح میری مرضی ہو گی میں بات کروں گی۔ آپ کون ہوتی ہیں روکنے والی۔''

''تم بہت بدتمیز اور گستاخ ہو گئی ہو تھیلما تم اتنی اچھی نہیں ہو جتنا کہ میں نے سوچا تھا اور اگر تمہارا خیال ہے کہ میں اب بھی تمہارا خیال کروں گی تو تم غلطی پر ہو، میں ابھی وکیل کو بلا کر وصیت نامے سے تمہارا نام خارج کرواتی ہوں۔''

''فون کو مت چھونا۔'' تھیلما نے آگے بڑھ کر اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''چھوڑو مجھے بیوقوف، چھوڑو مجھے۔''

''میری عمر چالیس سال ہے۔'' تھیلما نے آگے بڑھ کر اس کا گلا پکڑ لیا اور پھر اس کی انگلیوں کی گرفت اس کے گلے پر سخت ہوتی گئی اور چند لمحوں بعد مسز منرو کی لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔

اچانک اس کے پیچھے کا دروازہ کھلا اور پھر ہوٹل کی ملازمہ کی پے در پے چیخیں سنائی دیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ پولیس سٹیشن کے ایک کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی، تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک پولیس آفیسر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک کرسی اٹھائی اور اس کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

''لیکن تم نے اسے قتل کیوں کیا؟ تم نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ ایسی بیمار عورت تو.....''

''بیمار؟'' تھیلما نے دہرایا اور پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا ''وہ چڑیل بیمار نہیں تھی۔''

''لیکن وہ واقعی بہت سخت بیمار تھی اور اس کا پتہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے چلا، ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ اتنے عرصے وہ زندہ کیسے رہی لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کا سبب دریافت کر لیا۔ وہ ایتھلونک نامی ایک مہلک مرض میں مبتلا تھی، اسے بہت پہلے مر جانا تھا لیکن جس چیز نے اسے زندہ رکھا وہ زہر کی تھوڑی تھوڑی مقدار تھی جو غالباً ہر رات وہ استعمال کرتی تھی۔ بعض اوقات زہر بھی تریاق بن جاتا ہے۔''

.....❁.....❁.....

روشنی کا خوف

نجم الحسن

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک اندھیری غار میں رہتا ہوں۔ جب میں غار کے دروازے کی طرف جاتا ہوں تو مجھے روشنی نظر آتی ہے اور میں اس روشنی سے ڈر اور خوف کے مارے غار کے اندھیرے حصہ میں پلٹ جاتا ہوں۔ جہاں مجھے سکون ملتا ہے۔ یہ بات ممکن ہے کسی کو افسانہ معلوم ہو مگر واقعتاً ایسا ہی تھا۔

ایک شخص کا ماجرا جسے اندر کا خوف بڑے کام کرنے سے روک دیتا تھا

میں اخبارات میں ملازمت کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنا رسالہ نکالنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جولائی 1975 میں جب انجینئرنگ رویو نکالنے کا سرکاری اجازت نامہ مل گیا تو یہ دن میرے لئے بے حد خوشی کا دن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہواؤں میں اُڑ رہا ہوں کیونکہ ایسا لگتا تھا میں اپنے ذاتی کاروبار میں قدم رکھ کر آگے ہی آگے بڑھتا جاؤں گا۔ میری نئی خوشحالی اور خوشگوار زندگی کی ابتدا ہونے والی ہے۔

ان سارے حسین تصورات کے ساتھ ایک گھبراہٹ نے بھی مجھے گھیر لیا تھا۔ خوابوں کی دنیا سے نکل کر اب عمل کا وقت تھا۔ ایسا کام کرنے کا وقت تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ یعنی اب

مجھے اپنے کاروبار میں قدم رکھنا تھا۔ اب مجھ پر زبردست گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

اکتوبر 1975 میں جب اپنا رسالہ انجینئرنگ رویو شروع کیا تو مجھے ملازمت کرتے ہوئے 10 سے 12 سال ہو چکے تھے۔ اگرچہ میں نے راولپنڈی میں دکان کی تھی جو ناکام رہی تھی۔ اس طرح میرا کیرئیر نوکری کرنا ہی تھا تاہم یہ دکان میرے ذہن میں ایک بات راسخ کر گئی کہ کسی دن میں نے اپنا کاروبار ہی کرنا ہے۔

جب میں اپنے کام کی طرف آیا تو ایک طرف اپنے کاروبار کے حسین خواب کی ابتدا تھی تو دوسری طرف مجھ پر ایک خوف طاری تھا کہ گھر چلانے کے لیے خرچہ کہاں سے آئے گا جبکہ نوکری میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو رقم مل جاتی تھی۔ میں کسی اور وسیلہ سے واقف نہ تھا جہاں سے جیب میں رقم آتی ہو۔ میرے دوست احباب، رشتہ دار، باپ، چچا، ماموں سب لوگ نوکری ہی کرتے تھے۔ اس ماحول میں یہ بہت بڑی پریشانی تھی کہ پیسہ کہاں سے آئے گا، گھر کیسے چلے گا، اس خوف نے باقاعدہ ایک مشکل اختیار کر لی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک اندھیری غار میں رہتا ہوں۔ جب میں غار کے دروازے کی طرف جاتا ہوں تو مجھے روشنی نظر آتی ہے اور میں اس روشنی سے ڈر اور خوف کے مارے غار کے اندھیرے حصہ میں پلٹ جاتا ہوں۔ جہاں مجھے سکون ملتا ہے۔ یہ بات ممکن ہے کسی کو افسانہ معلوم ہو مگر واقعتاً ایسا ہی تھا۔

بہت لوگ کئی بڑے اور اہم کام کرنا چاہتے ہیں مگر کسی گوشے میں چھپا ہوا ایک خوف ان کو بڑے کام میں قدم رکھنے سے روکتا ہے۔ وہ لوگ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر کروں یا نہ کروں کی صورت میں اپنے آپ کو جکڑ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے بلند عزائم دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میں اس صورتحال کو پہنچ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ جن لوگوں نے اپنے خوابوں کو سچ کر دکھانا ہو ان کو کسی نہ کسی ترکیب سے خوف اور ڈر سے باہر آنا ہوگا۔

اپنے خوف سے چھٹکارا اور علاج کے لیے میں نے اپنے ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کوئی دوا دی تھی یا یہ ان کی حکمت تھی کہ میٹھی گولیوں کے ذریعے مجھے نفسیاتی طاقت دی جائے کہ میں خوف کی کیفیت سے باہر آ جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب کی دوا/ ترکیب کامیاب رہی اور میں نارمل ہو گیا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے خوف کو کیسے زیر کرتے ہیں۔ خوف پر فتح کے بغیر بڑی کامیابی نہیں مل سکتی۔

کاروبار میں حوصلہ مندی

لاہور ٹاؤن شپ میں میرے پاس ایک کنال (چھ سو گز) کا پلاٹ تھا۔ کاروبار شروع کرنے کے لیے جب سرمایہ کی ضرورت تھی تو ایک پرانے بیوپاری جناب ایس ایم عالم صاحب اور میرے درمیان جو بات ہوئی کچھ یوں تھی۔

نجم: عالم صاحب مجھے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ لاہور میں چھ سو گز کا ایک پلاٹ میرا واحد اثاثہ ہے۔ کیا میں اس کو بیچ کر رقم کا بندوبست کر لوں؟ سچی بات ہے کہ یہ سوال پوچھتے ہوئے میں بڑے تذبذب میں تھا۔

عالم صاحب: ہاں یہ پلاٹ بیچ دو تاکہ سرمایہ کا بندوبست ہو سکے۔

نجم: یہی میرا اثاثہ ہے اگر کام نہ چلا تو میں اس سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔

عالم صاحب: یہ پلاٹ کب سے تمہارے پاس ہے؟

نجم: کوئی چار سال سے۔

عالم صاحب: اس کا مطلب ہے کہ اب اگر تم یہ پلاٹ بیچ دو تو تم پھر سے ویسے ہی ہو جاؤ گے جیسے چار سال پہلے تھے۔

نجم: یہی تو میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر خالی ہاتھ ہو جاؤں۔ یہ بات میں نے بڑے بوجھل دل کے ساتھ کہی تھی۔

عالم صاحب: دیکھو نجم اپنی خواہشات اور اپنے عزائم کو پورا کرنے کے لیے رسک لینا پڑتا ہے۔ کھو دینے کا حوصلہ کرنا پڑتا ہے۔ پلاٹ بیچنے کا حوصلہ کیے بغیر تم وہیں کھڑے رہو گے جہاں اس وقت ہو، تمہارے خواب اور عزائم خیالوں کی دنیا میں ہی ختم ہو جائیں گے۔

ایک بات اور یاد رکھنا، اگر تم اپنے کام میں ناکام ہو گئے تو آج سے زیادہ قیمتی کارکن ہو جاؤ گے۔ تمہارا تجربہ اور تمہاری سمجھ بوجھ بہتر ہو جائے گی۔ آئندہ مارکیٹ میں تمہاری قدر بہتر ہو گی جس کی وجہ سے تمہیں بہتر تنخواہ ملے گی اور اگر تمہارا کاروبار چل گیا تو یہ پلاٹ سرمایہ کاری کا ذریعہ بن جائے گا۔

عالم صاحب کا کہنا تھا کہ اپنا کام کرنا ہے تو پلاٹ بیچنے کا حوصلہ کر ڈالو۔ پھر وہی ہوا۔ میں نے لاہور کا پلاٹ بیچ دیا جس کے نتائج اچھے ہی برآمد ہوئے۔

.....❁.....❁.....

اقوالِ زریں

☆.....زندگی کے چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جو برسوں سے زیادہ قیمت رکھتے ہیں۔ گزر جانے کے بعد ہم بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔

☆.....سکندر سے کسی نے پوچھا کہ دلیری کیا ہے۔ کہا ”یہ نہ پوچھے کہ دشمن کتنے ہیں بلکہ یہ پوچھے کہ کہاں ہیں۔“

☆.....نوشیروان نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ شجاعت کیا ہے؟ جواب ملا ”قوتِ دل۔“..... کہا کہ قوتِ بازو کیوں نہیں کہتا؟..... اس پر دانا وزیر نے کہا ”اگر دل مضبوط نہیں تو بازوؤں کی مضبوطی بیکار ہے۔“

☆.....جس فرد یا قبیلے کو اپنی روزی کے لیے کسی اور کو خوش کرنا پڑے وہ خود کیسے خوش رہ سکتا ہے۔

☆.....جذبات کی غلامی بدترین غلامی ہے۔

☆.....محض لباس سے انسان نہیں پہچانا جا سکتا کیونکہ انسان کا بنانے والا خدا اور لباس کا بنانے والا درزی اور جولاہا ہوتا ہے۔

☆.....چار نیکیاں افضل ترین ہیں: غصہ کے وقت درگزر، تنہائی میں پارسائی، تنگدستی میں سخاوت، طاقت کے باوجود انکسار۔

☆.....”یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیراں..... اے قائداعظم تیرا احسان ہے احسان“ آدھا احسان مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر اُتار دیا گیا۔ خدارا باقی احسان رہنے دو۔

☆.....کیا کوئی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل رشتہ داروں میں حرف ابجد کا حرف ب پہلے کیوں آتا ہے؟ مثلاً

باپ، بھائی، بھابھی، بیٹا، بیٹی، بہن، بھاوج، بہنوئی، بیوی..... اور چچا، چچی، خالہ، خالو، ماموں، ممانی، پھوپھا، پھوپھی..... ان سے علیحدہ کیوں رکھے گئے ہیں۔

(مرسلہ: تسنیم انور سلیمی)

وفاؤں کی قاتل

انیس طاہرہ

دنیا کبھی یہ نہیں کہے گی کہ میں اپنے بچے کی قاتل ہوں..... بھلا کوئی ماں اپنے بچے کی قاتل ہو سکتی ہے؟ لیکن..... لیکن مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں ایسا کروں گی اور ضرور کروں گی..... تجھے تڑپانے کے لیے..... اذیت دینے کے لیے..... زندہ درگور کرنے کے لیے.....

ایک عورت کی کہانی جو توجہ نہ ملنے سے انتقامی جذبے کا شکار ہو گئی

جامن کے پیڑ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے وہ اب بھی اس اہم گتھی کو سلجھا رہی تھی جسے اس کا بالغ ذہن عمر کے پچیس سال گزرنے پر بھی نہ سلجھا پایا تھا۔ نیلو کے کہے گئے الفاظ گو بظاہر عامیانہ سے تھے لیکن اس کے نرم و نازک احساسات پر اب تک مسلسل ضربیں پڑ رہی تھیں جس کی چوٹ پر اس کا دل خون کے آنسو بہا رہا تھا اور دماغ حقیقت کی بھٹی میں سُلگ سُلگ کر اس کے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔ کیا اس کی شادی محض اس لیے نہیں ہوئی کہ اس کے ماں باپ زندہ نہیں؟ کیا وہ اب تک کنواری اس لیے ہے کہ متوسط طبقہ کی لڑکی ہے؟ کیا نیلو نے اپنی دوستی کا حق یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ کون اس روکھی پھیکی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر روگ مول لے گا؟

ہوں! تو وہ خشک اس لیے ہے کہ نیلو کی طرح اس کا اپنا بنگلہ نہیں، شوہر نہیں، بچے نہیں..... جن کی وہ مالک بن کر حکمرانی کرے۔ کیا ایک عورت کی

زندگی کی کل کائنات کے یہی وہ مادی عناصر ہیں جن کے حصول پر وہ خوشی سے سرشار ہو جاتی ہے؟..... لیکن نہیں! باجی تو اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں اور ہوں بھی تو کیوں؟ دولہا بھائی کے ساتھ انہیں نہ صرف معاشی کفالت کرنی پڑتی ہے بلکہ ان کی جھک جھک بھی سننی پڑتی ہے۔ زندگی کی وہ ساری لطافتیں، مسکراہٹیں اور راحتیں ایک خواب بن چکی تھیں جسے باجی جیتی جاگتی دنیا میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کی محرومیاں لبوں پر گلے شکوے بن کر نہ آئیں حالانکہ دیکھنے والی آنکھیں انہیں دیکھ کر ٹٹولتیں تو وہ مسکرا کر نگاہیں موند لیتیں جیسے اپنے غموں کو آنکھوں کے پیمانوں میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔

کالج کی تعطیلات میں جب وہ گھر لوٹی تو اپنی شادی کی باقاعدہ تیاریوں میں مسرور ہونے کی بجائے گم سم سی رہ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی باجی سے اپنے حق کے لیے لڑ نہ سکی۔ وہ اتنا بھی تو نہ کہہ پائی کہ باجی کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ رکھا ہے کہ جس کے پلے چاہا باندھ دیا لیکن نہیں..... غلطی اس کی اپنی تھی۔ باجی نے تو بارہا خط کے ذریعے اس کی پسند اور رائے معلوم کرنا چاہی تھی مگر وہ ہر بار بے نیازی سے ٹال دیا کرتی تھی جیسے وہ خود ابھی بچی ہے اور اس گراں ذمہ داری کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔

وقت گزاری کے لیے اس نے ڈھیروں افسانے پڑھ ڈالے تھے۔ تقریباً ہر افسانہ رومان کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیروئن ہے کہ لذتِ انتظار کی چاشنی میں کھوئی ہوئی ہے۔ ہیرو ہے کہ ہیروئن کے لیے بے تاب و بے قرار جان تک کی بازی لگا دینے کو تیار اور ولن بے چارہ یا تو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہیروئن کو تباہ و برباد کر دے گا یا پھر دنیا سے منہ موڑ کر محبت کا بھرم رکھ لے گا۔ جانے کیوں اسے ان سارے افسانہ نگاروں کی اوٹ پٹانگ لفاظیوں سے زندگی میں پہلی بار نفرت سی محسوس ہوئی۔ وہ جو تخیلات کی اونچی پرواز میں حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے ہیں جانے اپنے احساسات کی جھوٹی تسکین کے لیے قاری کے دُکھوں پر تازیانے لگا کر انہیں کیا ملتا ہے؟ افسانے اور حقیقت کی تلخیوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ابھی کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچ پائی تھی کہ سکوٹر سٹارٹ کرنے کی آواز پر اس کی نگاہیں بے ساختہ سامنے بنگلے کے مکینوں پر جا پڑیں۔ نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک پیاری سی لڑکی اپنی گود میں گول مٹول خوبصورت بچہ سنبھالے اپنے شوہر کو الوداع کہہ رہی تھی۔ جواباً اس کے شوہر نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بچے کو پیار کرتا ہوا آفس روانہ ہو گیا۔ تو کیا ازدواجی زندگی اتنی پُر بہار بھی ہو سکتی ہے؟ کیوں نہیں؟ زندگی تو اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔ کسی انجانی سرگوشی نے اسے گدگدایا تو وہ بھی اپنی جذباتی دنیا میں ایسے پیکر کو ڈھونڈنے لگی جسے صرف اس سے والہانہ پیار ہو۔

اب تو ہر لمحہ اس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھی اس پیاری سی لڑکی کی دن بھر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا کرے۔ جبھی تو وہ بڑے غور سے اسے چلتے پھرتے دیکھتی، بچے کو پیار کرتے دیکھتی، رنگ برنگے کپڑے پہناتے دیکھتی، لان میں بیٹھے سویٹر بنتے دیکھتی اور کچھ نہیں تو اسے مطالعہ کرتے دیکھ کر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ وہ ان کتابوں کا نام جان لے جنہیں وہ بغور پڑھا کرتی ہے۔ پھر شام کے جھٹپٹے میں تو اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر صاف و شفاف سڑک پر پھسلنے لگتیں۔ سکوٹر کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے

دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر وہ اس دلفریب منظر میں کھو جاتی کہ کیسے وہ پیاری سی لڑکی آفس فائل اپنے شوہر سے لے کر دل میں اُتر جانے والی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہے اور بچہ باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر اپنے پیار کا اظہار کرتا تو وہ جھپٹ کر اسے گود میں لے کر چومنے لگتا..... اور..... جب رات کے سائے لہرانے لگتے، دونوں میاں بیوی گھومنے نکلتے تو اس کے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں آنکھیں موندے مستقبل کے حسین تانے بانے میں اُلجھی نیند کی پرسکون وادی میں چلی جاتی۔

شادی کی ہنگامہ آرائی میں وہ خود کو بھلا بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اور صرف ایک بار اپنے گلفام کو دیکھا تھا۔ گلفام تو اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھا۔ کاش اس کا دل بھی اتنا ہی حسین ہو۔ ایک انجانا خوف جب کبھی اسے ڈرا دیتا تو اس کی نظریں اس بنگلے کا طواف کرنے لگتیں جس سے اسے بے حد اُنسیت ہو چلی تھی۔

اوں! جانے یہ کیسی شادی تھی کہ گلفام نے اسے پکچر، پارٹی، پکنک یا چھوٹی موٹی تفریح میں سے کسی ایک کی بھی پیشکش نہ کی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی رنگین بہاروں کا تصور تو خیر خزاؤں کا روپ دھار ہی چکا تھا پر اب تو وہ اپنی خشک زندگی کی تلخیوں سے بھی اُکتا چکی تھی۔ جانے زمانے بھر کی بدنصیبی اسی کا مقدر کیوں بن گئی تھی۔ اسے اپنے شوہر سے ذرہ بھر بھی تو ہمدردی نہ تھی اور ہوتی بھی کیوں؟ بھلا وہ شخص جو دولت سمیٹنے کے چکر میں پتھر دل بن چکا تھا ایک عورت کے حسین و نازک احساسات کا قدرداں کیونکر ہو سکتا تھا؟ اس نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہ پوچھا کہ تمہارے چہرے پر تلخی اور ناگواری کے احساسات کیوں ہیں؟ تم کن مصائب سے دوچار ہو؟ بے وقت کھانا کھا کر تم اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہو؟ کیوں لباس میں تساہل پسندی تمہاری عادت بن رہی ہے؟ اس کی بلا سے وہ جیے، مرے یا جہنم میں جائے۔ سماج کے جس بندھن میں گرفتار ہو کر وہ نامعلوم اذیتوں سے دوچار تھی اس کا مداوا تو دُور کی بات، باجی اور بھیا تک کو اس کی خبر نہ تھی۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جب اس کی باجی نے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا ''کیوں رباب تجھے ملازمت کی کیا پڑی جب گلفام کی ماہانہ آمدنی ہزاروں میں ہے۔'' ''ہاں باجی، ان کی آمدنی ہزاروں میں ہے..... پھر بھی چند سو کی رقم کے لیے انہوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ میں گھر میں فالتو بیٹھ کر ڈگری ضائع نہ کروں۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے باجی انہوں نے، میرا دل بھی لگ جاتا ہے اور خرچ بھی نکل آتا ہے.....'' وہ طنزیہ مسکرائی۔ ''خرچ اور تیرا..... وہ بھی گنی چنی رقم میں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے رباب؟ کیا وہ تیرا کفیل نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس نے شادی کیوں کی تھی؟ میں آج ہی گلفام سے بات کروں گی۔'' ''نہیں باجی نہیں..... کوئی ضرورت نہیں کچھ کہنے سننے کی۔ آپ کے کہنے سے ان کی فطرت بدل نہیں سکتی، عادت چھٹ نہیں سکتی..... انہیں اگر میری پروا نہیں تو مجھے بھی گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' ''لیکن رباب تم یہ بھول رہی ہو کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔'' باجی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ بھی یہ بھول رہی ہیں کہ خوشیاں زبردستی خریدی نہیں جا سکتیں۔ میرا مقدر جن تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے اسے نہ تو آپ روشنیوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں اور نہ میں.....'' بے بسی کے عالم میں دریچے کی ٹھنڈی سلاخوں سے اپنا

چہرہ رگڑتے ہوئے وہ اپنے احساسات کی اس بغاوت کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو اسے راہِ فرار پر اکسار ہے تھے۔

''کہہ تو دیا ہے رباب کہ مجھے تم سے کوئی انسیت نہیں...... لگاؤ نہیں...... دلچسپی نہیں۔'' ''تو پھر مسٹر گلفام آپ نے شادی کیوں کی تھی؟'' اس کا دل چاہا کہ جواب میں وہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کا منہ نوچ لے، اس کا گریبان پھاڑ ڈالے اور اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے...... لیکن...... لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی...... سوائے آنسو بہانے کے۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ دنیا کی ظاہری آنکھیں اسے ہی موردالزام ٹھہرائیں گی۔ باوجود اس کے کہ احساس کی عدالت میں ازدواجی تلخیوں کا ذمہ دار صرف اور صرف اس کا شوہر ہے جو اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں۔

حالات نے رباب کے احساسات کو اس قدر مجروح کر دیا کہ اسے اپنے ہونے والے بچے سے محبت تو بڑی بات، ہلکی سی اُنسیت بھی نہ تھی۔ اس پر گلفام کے رویے کی تبدیلی نے تو اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ ہوں! تو گلفام کو بچے سے ابھی سے والہانہ پیار ہے۔ جبھی تو ہر اگلے قدم پر پیچھے مڑ کر وہ اسے سہارا دینے کی کوشش کرتا جیسے وہ ازل سے اس کا تمنائی تھا۔ خودغرض، کمینہ فطرت انسان میں نے تجھے اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ تُو مجھے اب فریب نہیں دے سکتا۔ میں تجھے کبھی وہ خوشی نہیں دُوں گی جس کا تُو خواہش مند ہے۔ تُو یہ سمجھ رہا ہے کہ بچہ تیری ملکیت ہے لیکن...... لیکن اگر میں چاہوں تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے جیتے جی موت کے گھاٹ اُتار دُوں...... اس لیے کہ وہ تیرا ہی نہیں، میرا بھی بچہ ہے۔ اس پر پہلا حق میرا اور بعد کو تیرا ہے۔ دنیا کبھی یہ نہیں کہے گی کہ میں اپنے بچے کی قاتل ہوں۔ بھلا کوئی ماں اپنے بچے کی قاتل ہو سکتی ہے؟ لیکن...... لیکن مجھے ایسا کرنا ہو گا۔ میں ایسا کروں گی اور ضرور کروں گی...... تجھے تڑپانے کے لیے...... اذیت دینے کے لیے...... زندہ درگور کرنے کے لیے......

''رباب بچے کے کپڑے وغیرہ سب تیار کر لیے تم نے؟'' گلفام نے گھر لوٹتے ہی ڈھیر سے کھلونے اور بے بی سیٹ اس کے آگے ڈال دیئے۔

''جی ہاں بالکل۔'' بظاہر مسکراتے ہوئے اور حقیقتاً نفرت سے منہ سکوڑتے ہوئے وہ تلخی سے بولی۔

''کتنی کمزور ہو گئی ہو رباب۔ ڈاکٹر سے انجکشن اور ٹانک کیوں نہیں لکھوا لیتیں؟ گھر میں پڑی پڑی بور الگ ہو جاتی ہو۔ میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ جہاں دل چاہے چلی جایا کرو۔ چلو باجی کے گھر چلیں بہت دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔'' اخبار اپنے سامنے پھیلائے وہ گنگنانے لگا۔ ''گلفام! یہ تم کہہ رہے ہو...... زندگی میں پہلی بار اتنی ہمدردی اور خلوص سے......'' اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا...... ''نہیں، نہیں...... تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں...... لگاؤ نہیں...... دلچسپی نہیں...... تمہیں تو صرف اپنے ہونے والے بچے سے پیار ہے۔ اس بچے کی خاطر تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔ تسلی دے رہے ہو۔ زندگی سے پیار کرنا سکھا رہے ہو...... تو کیا میری اپنی حیثیت محض ضمنی ہے اور بچے کی حیثیت کلی ہے؟ نہیں...... نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا...... کبھی نہیں، کبھی نہیں! میرے جیتے جی تم مجھے نظرانداز کر دو اور بچے کو سینے سے لگا لو...... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دُوں گی۔ غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں تو اس کا بدن شدت جذبات اور احساس شکست سے کانپنے لگا...... لیکن اپنی کیفیت کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

ماں کی عظمت

ماں ایک پھول ہے، ایک دولت ہے، شفقت ہے، خزانہ ہے، محبت کا دریا ہے۔ (میم) سے شروع ہونے والا یہ لفظ ماں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ''ماں'' کہتے ہی دونوں ہونٹ کس قدر ایک دوسرے کو چوم لیتے ہیں۔

دنیا کے تمام رشتوں میں غرض شامل ہوتی ہے۔ سارے رشتے اپنی خدمت کے عوض صلہ چاہتے ہیں مگر ماں انمول ہیرا ہے جو بچوں سے اپنی بے لوث و بے غرض محبت اور خدمت کے صلے میں کسی شے کی طلب گار نہیں ہوتی بلکہ عمر کے آخری حصے تک اس کے بے لوث پیار اور ایثار کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ماں ایک مقدس الہامی کتاب کی طرح ہے جس کو دیکھنا بھی باعثِ ثواب ہے۔

ماں دُنیا کی ایک عظیم رحمت ہے جو انسان کو جنم دیتی ہے۔ نو ماہ اپنے خون سے سینچتی ہے اور پھر اپنی چھاتی سے لگا کر اسے بڑا کرتی ہے۔ ماں کا یہ قرض ہر انسان کی زندگی پر ہوتا ہے۔ ماں دنیا اور آخرت میں رہائی کا ذریعہ ہے۔ ماں ایک ایسا رشتہ ہے جس میں جنت اور دوزخ دونوں ہی پوشیدہ ہیں۔ اگر ماں کی خدمت کی جائے تو بلاٹکٹ جنت مل جائے گی اور تھوڑی سی گستاخی کا خیال بھی کیا تو سیدھا دوزخ کا راستہ ہے۔

(ق دہلوی/کراچی)

☆☆☆

اس سے قبل کہ آنسوؤں کی آگ کو ٹھنڈے پانی سے بجھا سکے، دھڑام سے چکرا کر گر پڑی اور..... اور جب اسے ہوش آیا تو شدت تکلیف کے باوجود اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہسپتال کی اجنبی فضا میں نرس کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا ''سسٹر میرا بچہ کہاں ہے؟''

''بچے کو نہلایا جا رہا ہے بی بی، آپ یہ گولی کھا لیں۔'' گولی کھاتے ہی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ حقیقت کی دنیا سے دُور خوابوں کی حسین دنیا میں کھو گئی۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے پلنگ کو ٹٹولا لیکن وہ تو خالی تھا..... بالکل خالی..... اور جھولا..... جھولا بھی تو خاموش پڑا تھا..... نہ کسی کے رونے کی آواز..... نہ چلانے کی..... نہ کسی کا کلبلاتا وجود..... پھر اس کا بچہ کہاں ہے.....؟ کہاں ہے اس کا بچہ.....؟ اس کی متلاشی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں..... شاید کہ نرس بچے کو بنا سنوار کر لا رہی ہو۔ اس نے دل کو تسلی دی۔

''رباب کیسی طبیعت ہے اب؟'' گلفام کی گمبھیر سی آواز نے اسے بے چین کر دیا۔ کروٹ بدل کر اس نے گلفام کو دیکھا۔ گلفام کی سرخ اور متورم آنکھیں اس کے دلی کرب کی غماز تھیں۔ ''گلفام، میرا بچہ کہاں ہے؟'' اس نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اپنے آنسو روکتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پایا..... ''وہ دُور چلا گیا ہے رباب، دُور..... بہت دُور! رباب میں تو اس کا نام ''شاداب'' رکھنے والا تھا لیکن..... لیکن زندگی کی شادابی اس کا مقدر نہیں تھی! اور.....'' اور اس لمحے رباب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچے ہی کی نہیں اپنے شوہر کی بھی قاتل ہے۔ وہ قاتل ہے..... وہ قاتل ہے..... خوشیوں کی قاتل..... آرزوؤں کی قاتل..... اور وفاؤں کی قاتل..... بے شمار انجانی سرگوشیوں کی بوچھاڑ نے اسے تڑپا تڑپا دیا تو تکیے میں منہ چھپا کر وہ رو پڑی۔

سناٹا

نگہت سیما

قدرت کے ایک سنگین مذاق کا دلگداز افسانہ، جوڑے کی کہانی جن کی زندگی میں سناٹے نے قبضہ جما رکھا تھا!

اس گھر میں آ کر مجھے ہمیشہ ہی وحشت ہوتی ہے۔ یہ کوئی دو کنال پر پھیلی ہوئی وسیع کوٹھی، خوبصورت باغیچہ، پیارا سا لان، آڑو، خوبانی اور پیتے کے درخت، گلاب اور چنبیلی کے کنج، ڈھیروں رنگ رنگ کے انگریزی پھول لیکن اس سب کے باوجود مجھے یہاں آتے ہوئے وحشت ہوتی ہے۔ شہر کی سب سے بارونق شاہراہ پر واقع اس کوٹھی کے اندر کتنی ویرانی، کتنا سناٹا ہے۔ اس کے چاروں اور ہنگامے جنم لیتے رہتے ہیں لیکن اس کے مکینوں کو شاید ان ہنگاموں، ان رونقوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں جب بھی یہاں آئی ایک عجیب سی اُداسی نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں..... میں کسی ویرانے میں چلی آئی ہوں۔ آج کی طرح پہلے بھی کئی بار یہاں اس لوہے کے بڑے سے گیٹ کے

پاس کھڑے کھڑے میں نے ڈھیروں باتیں سوچی ہیں اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اندر داخل ہونا پڑا ہے۔ جہاں طوطے کی مسلسل ٹیں ٹیں، قمریوں اور چڑیوں کی پیاری پیاری آوازوں کے شور کے باوجود مجھے ایک جان لیوا خاموشی اور گہرے سناٹے کا احساس ہوتا ہے۔ روح کو تھکا دینے، نڈھال کر دینے والا جامد اور گہرا سناٹا۔

ہمیشہ کی طرح اپنی بے پناہ سوچوں سے گھبرا کر میں گیٹ کی کھڑکی پھلانگ کر اندر آ گئی ہوں۔ بالکل سامنے برآمدے میں طوطے کا پنجرہ لٹکا ہوا ہے اور وہ حسب معمول ''سلو بی بی، سلو بی بی۔'' کی رٹ لگا رہا ہے۔ شاید اسے بھی میری طرح سناٹے سے خوف آتا ہے۔ اسی لیے ہر وقت شور مچائے رکھتا ہے لیکن یہ سناٹا، یہ خاموشی پھر بھی نہیں ٹوٹتی۔ اس سے ذرا پرے سیمنٹ کے چبوترے پر لکڑی اور لوہے کی جالی کا بنا ہوا خوبصورت پنجرہ ہے جس میں بے شمار رنگ برنگی چڑیاں پھدک رہی ہیں اور اس کے ساتھ ہی قمریوں کا ڈربہ ہے اور اس کے بالکل قریب چوکی پر کوئی بیٹھا ہے۔ ہاں تو یہ سلمٰی آپا ہیں۔ پکے ہوئے گیہوں کی مانند سنہری رنگت، شنگرفی ہونٹوں اور لانبے لانبے سیاہ بالوں والی سلو آپا جن کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ یوں جیسے کسی نے ان میں ستارے ہی ستارے بھر دیئے ہوں۔ میں نے کتنی دفعہ انور بھائی سے پوچھا تھا۔

''سچ! انو بھیا یہ سلو آپا کی آنکھوں میں اتنی چمک کہاں سے آ گئی۔''

''ارے تجھے نہیں پتہ۔'' وہ شرارت سے ہنستے۔ ''انہوں نے اپنی آنکھوں میں سو وولٹ کے بلب لگا چھوڑے ہیں۔''

اور سرخ ہوتی ہوئی سلو آپا کی آنکھیں اور بھی چمک اٹھتیں اور میں حیرت سے ان کی چمکتی آنکھوں کو دیکھنے لگتی لیکن اب..... اب وہ نیون سائن کی سی جلتی بجھتی روشنیوں والی آنکھیں کتنی ویران اور وہ شگفتہ شگفتہ سا معصوم چہرہ کتنا سپاٹ ہو گیا ہے۔ مسکراتے لب یوں بھنچے رہتے ہیں جیسے انہوں نے ہنسنا تو کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ سلو آپا کا یہ ستا ستا ویران چہرہ، بجھی بجھی بے رونق آنکھیں، جن میں ہر وقت دھول سی اُڑتی رہتی ہے۔ جب کبھی میری نظریں ان بجھی بجھی آنکھوں سے ٹکراتی ہیں تو یہاں پھیلا ہوا سناٹا اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ تو کیا یہ وہی سلو آپا ہیں جن کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی تھیں اور جن کے لب ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ سات سال قبل جب انو بھائی سے ان کی شادی ہو رہی تھی تو وہ کتنی خوش تھیں۔ خاندان کے بچے سارا وقت ان کے کمرے میں گھسے رہتے اور وہ ان سے ڈھیروں پیاری پیاری باتیں کرتیں۔ انہیں بچوں سے پیار بھی تو بہت تھا۔ اسی لیے تو سب کہتے تھے۔

''ارے بھئی سلو اگر فیملی پلاننگ والوں کو تمہارے ان باغیانہ خیالات کا علم ہو جائے تو وہ یقیناً یہ شادی روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔''

سلو آپا شرما جاتیں تو انو بھائی ان کی مدد کو آ جاتے۔ ''تو کیا ہوا سلو ہم اپنے درجن بھر بچوں کے ساتھ چاند پر جا بسیں گے۔''

''توبہ، توبہ کچھ تو خدا کا خوف کیجئے، ایک نہ دو پورے درجن بھر۔''

انو بھائی کس قدر ہنس مکھ، کتنے شریر ہوا کرتے تھے۔ پر اب کتنے سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ کبھی ہنستے بھی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے مجبوراً ہنس رہے ہوں۔ کتنے بدل گئے ہیں وہ۔ پہلے گھنٹوں ہمارے گھر بیٹھے نہ تھکتے تھے اور اب آفس جاتے ہوئے ذرا کی ذرا رُکتے ہیں۔

''سلو تمہیں یاد کر رہی تھی بیٹا۔''

میں انہیں پکارتی ہی رہ جاتی ہوں لیکن وہ اپنی گاڑی پورچ سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ امی کو ان سے کتنی شکایت رہتی ہے وہ جو ان کے مرحوم بھائی کی واحد نشانی ہیں لیکن وہ تو اتنا بھی نہیں رُکتے کہ میرا جواب ہی سُن جائیں جیسے انہیں یقین ہو کہ میں ضرور وہاں جاؤں گی۔ وہاں جہاں جاتے ہی مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں یا پھر نفاست سے سجی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پکے فرش پر پھینکنے لگوں۔ کچھ تو سکوت ٹوٹے، کچھ تو ہنگامہ ہو لیکن جب سلو آپا مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی ہیں تو میرے قدم وہیں منجمد ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اتنی یاسیت اتنی ویرانی اور تنہائی کا اس قدر جان لیوا سا احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی تکلیف دہ سوچیں جھٹک کر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی ہوں تاکہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ان کی تنہائیاں تو دُور ہوں لیکن ہر بار جب بھی میں نے کوئی بہت ہی مزیدار سا لطیفہ سنا کر ان کی طرف دیکھا تو مجھے احساس ہوا یہ تنہائیاں کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ سوائے..... سوائے..... ان کی بجھی بجھی آنکھیں دیکھ کر مجھے کئی بار اس جاں بلب مریض کا خیال آیا جس کی آنکھوں سے زندگی کی ساری چمک ختم ہو گئی ہو لیکن پھر بھی امید کی ایک ہلکی سی لو ان بجھتی آنکھوں میں تھرتھرا رہی ہو۔ سلو آپا چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ خواب کے عالم میں چل رہی ہوں۔ میں نے بارہا سوچا ہے جیسے وہ جی نہیں رہیں بلکہ زندگی انہیں گھسیٹ رہی ہے۔

طوطا ''سلو بی بی، سلو بی بی'' کی رٹ لگائے جا رہا ہے اور میں نے یہاں کھڑے کھڑے کتنی باتیں سوچ لی ہیں۔ انو بھائی نے آج صبح آفس جاتے ہوئے بتایا تھا کہ سلو آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

میں نے ایک بار پھر اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹک ڈالا ہے اور تھکے تھکے قدموں سے برآمدے کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ طوطے نے میری موجودگی محسوس کرتے ہوئے اپنے پنجرے میں اُچھلنا کودنا شروع کر دیا ہے۔ ''سلام بی بی، بی بی میاں مٹھو، میاں مٹھو۔'' وہ زور زور سے چیخ رہا ہے۔ سلو آپا نے تھوڑا سا مڑ کر مجھے دیکھا۔

''آ جاؤ بیٹا۔''

بخار کی حدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے لیکن آنکھوں میں ہمیشہ کی سی ویرانی ہے۔ ستاروں کی طرح چمکنے والی آنکھوں میں دھول اُڑ رہی ہے۔ میں نے نہایت ہولے سے آپا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

''کیا ہو رہا ہے آپا؟''

''یہ آج رحمت تیتروں کا ایک جوڑا لایا ہے۔ کہہ رہا ہے بہت اچھا بولتے ہیں۔ انہیں دیکھ رہی تھی۔''

میں نے مڑ کر ایک نظر رنگین چڑیوں اور قمریوں کو دیکھ کر سوچا ہے تو آج ان میں تیتروں کا اضافہ ہو گیا لیکن سلو آپا تم خواہ دنیا بھر کے پرندے یہاں اکٹھے کر لو تب بھی یہ سناٹا جو یہاں اور پھر تمہاری اور انو بھائی کی روحوں پر چھایا ہوا ہے، نہیں چھٹے گا، نہیں چھٹے گا بلکہ ان کے شور سے تو یہ سناٹا اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ میں یک دم اُداس ہو گئی ہوں۔ سلو آپا اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔

''تم نے دیکھا بیٹا، قمری نے بچے نکالے ہیں۔''

''نہیں سلو آپا۔''

میں..... مجھے۔ مجھے تو بس انسانوں کے بچے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں نے سوچا اور آپا کے پیچھے چلتی ہوئی ان کی خوابگاہ میں آ گئی ہوں۔ دروازے پر رُک

کر پردے کو پکڑے پکڑے میں نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی ہے۔ سلو آپا نے کتنی خوبصورتی سے اپنی خوابگاہ کو سجایا ہے۔ مجھے یاد ہے جب شادی کے بعد سلو آپا نے اسے سجا کر انو بھائی کی طرف دیکھا تھا تو وہ ہنسنے لگے تھے۔

''یہاں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔''

''بھلا کس چیز کی؟'' سلو آپا پریشان ہو گئی تھیں۔

''ایک خوبصورت سے پالنے کی جس میں ایک.....''

اور اب تو اس میں ایک پالنا بھی ہے۔ میرے بالکل سامنے، آپا کے بیڈ کے ساتھ، کھڑکی کے نیچے۔ یہ پالنا سات سال سے کسی گل گوتھنے سے بچے کا منتظر ہے۔ تب آپا کی شادی کو چھ ماہ ہی تو ہوئے تھے جب ہمارے پڑوس میں جرمنی سے ایک شخص یہ خوبصورت پالنا بیچنے کے لیے لایا تھا اور میں نے ضد کر کے اسے خرید لیا تھا۔ یہ پالنا جس کے جھلانے سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں اٹھتی تھیں۔ جب سلو آپا نے یہ پالنا یہاں رکھا تھا تو انو بھائی پالنے کو دیکھ کر بہت ہنسے تھے۔

''توبہ کتنی بے صبری ہو سلو۔''

سلو آپا شرما گئی تھیں اور پھر میں نے سلو آپا کے ساتھ مل کر پالنے کو رنگ برنگی خوبصورت جھالروں سے سجایا تھا اور دو ننھے ننھے سنبل کے بے حد نرم تکیے پالنے میں رکھ دیئے تھے اور وہ تکیے آج بھی یونہی پالنے میں پڑے ہیں جیسے ابھی ابھی آسمانوں سے کوئی فرشتہ اُترے گا اور گلابی گلابی گالوں والے پیارے سے بچے کو اس میں لا ڈالے گا اور سلو آپا مسکراتی ہوئی اسے جھلانے لگیں گی..... اور..... اور..... اُف سلو آپا کی اس نفاست سے سجی ہوئی خوابگاہ میں کتنی گھٹن ہے۔ میں نے پردہ چھوڑ دیا ہے اور پالنے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی ہوں۔ سلو آپا میری طرف پیٹھ کیے تولیے سے منہ صاف کر رہی ہیں اور میرے تصور نے ایک بار پھر پالنے میں لیٹے ہوئے گلابی گلابی گالوں والے گل گوتھنے سے بچے کا روپ دھار لیا ہے اور سلو آپا اپنے نازک نازک ہاتھوں سے پالنے کو جھلا رہی ہیں اور موسیقی کی مدھم مدھم لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ غیر ارادی طور پر میں نے پالنے کو ہلایا ہے۔ موسیقی کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی ہے۔ سلو آپا نے چونک کر مجھے دیکھا ہے اور میں نے بے حد گھبرا کر اپنی نظریں پالنے سے ہٹالی ہیں لیکن میری نظریں دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی بچہ گاڑی سے اُلجھ کر رہ گئی ہیں۔ یہ بچہ گاڑی انو بھائی لاہور سے لائے تھے۔ تب ان کی شادی کو دو برس بیت چکے تھے۔

''مجھے یہ گاڑی بہت پسند تھی بینا۔ میں نے سوچا کہیں کوئی اور نہ خرید لے۔'' انہوں نے بتایا تھا اور سلو آپا نے نہایت چاؤ سے اسے یہاں کھڑا کر دیا تھا۔ اس سے بے اختیار میرا جی چاہا کہ کوئی ننھے ننھے قدموں سے دوڑتا ہوا آئے اور اس گاڑی کو دھکیل کر باہر لے جائے۔ اندرونی اذیت سے بچنے کے لیے میں نے اپنی نگاہوں کا رُخ بدل ڈالا ہے۔ اب میں دائیں ہاتھ کی دیوار میں بنے ہوئے خوبصورت شوکیس کو دیکھ رہی ہوں جس میں ایک طرف نیلی آنکھوں والی خوبصورت گڑیا ڈانس کرنے کے انداز میں کھڑی ہے۔ قریب ہی چابی سے چلنے والا جہاز ہے۔ یہ کھلونے اور ننھے ننھے خوبصورت فراک رضا بھائی امریکہ سے لائے تھے۔ تب سلو آپا کی شادی کو پورے چار برس بیت چکے تھے اور رضا بھائی کا خیال تھا کہ سلو آپا اب تک یقیناً والدہ محترمہ بن چکی ہوں گی۔ انہوں نے کبھی میری اس بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ سلو آپا کے کوئی بچہ نہیں۔ گویا بچے اور سلو آپا

لازم و ملزوم ہیں۔ تب سلو آپا کی آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ ''رضا بھائی۔ میں بھلا ان سب چیزوں کا کیا کروں گی؟''

''تو کیا ہوا، کبھی تو کام آ جائیں گی'' اور سلو آپا نے بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ یہ چیزیں یہاں شوکیس میں رکھ دی تھیں۔ میں نے شوکیس سے نگاہیں ہٹا کر سلو آپا کی طرف دیکھا ہے جو نہ جانے کیا سوچ رہی ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ میرے اندر کی گھٹن بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ نفاست، ترتیب، توازن اور شائستگی، کاش کوئی اس نفاست سے سجے ہوئے کمرے کو اتھل پتھل کر ڈالے، کچھ تو تبدیلی ہو۔ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے بارہا میں نے سوچا ہے کہ رائٹنگ ٹیبل پر کوئی سیاہی کی دوات گرا دے۔ سفید میز پوش پر نیلی نیلی سیاہی کے دھبے ہوں اور سیاہی گرانے والا سہمی سہمی نظروں سے سلو آپا کی طرف دیکھے تو وہ بے اختیار جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیں۔ ''ارے تو کیا ہوا لے دیکھ میں اسے ابھی دھو ڈالتی ہوں۔'' بالکل ایسے ہی جیسے سلو آپا مجھے کہا کرتی تھیں۔ جانے کتنی بار میں نے ان کی رائٹنگ ٹیبل پر سیاہی گرائی تھی اور ہر بار سلو آپا نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے تو کیا ہوا بینی! لے دیکھ میں اسے ابھی دھوئے ڈالتی ہوں۔'' ستاروں کی سی چمکتی آنکھوں والی سلو آپا کا کمرہ ہر وقت بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کا خوبصورتی سے سجا ہوا کمرہ کباڑیے کی دکان نظر آنے لگتا۔ ان کی کتابوں کے خوبصورت کور بچوں کے ہاتھوں میں بستر کی چادریں زمین پر اور تکیے اِدھر اُدھر کونوں میں ہوتے، لیکن وہ مسکراتے ہوئے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے کمرے کو پھر سے سنوار دیتیں۔ میں نے بارہا بڑی شدت سے چاہا ہے کہ یہاں بھی تو کوئی ہو جو سلیقے سے رکھی ہوئی چیزوں کو بے ترتیب کرتا رہے اور سلو آپا مسکرا مسکرا کر انہیں سمیٹتی رہیں۔ میرے تصور میں ایک بار پھر سہما سہما ایک بچہ چلا آیا ہے جس نے کارنس پر پڑا ہوا چینی کا خوبصورت مجسمہ گرا دیا ہے اور اب اس کی کرچیوں کو سہمی سہمی خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا ہے اور سلو آپا نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا ہے۔

''کوئی بات نہیں چندا، چیزیں تو ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔'' بالکل ایسے ہی جیسے سلو آپا نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے اس وقت کہا تھا جب میں نے ان کا بے حد خوبصورت پھولدان توڑ دیا تھا اور ڈر کر رونے لگی تھی اور انہوں نے میرے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے میرے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کر لیا تھا۔

''بینا..... بینی کیا سوچ رہی ہے۔ جانے یہاں آ کر تجھے کیا ہو جاتا ہے۔''

میں نے چونک کر کارنس کی طرف دیکھا ہے جہاں چینی کا خوبصورت مجسمہ سات برسوں سے یونہی پڑا ہوا ہے۔

''سلو آپا۔'' میں نے بے حد دُکھ سے انہیں دیکھا۔

''زیادہ سوچا نہ کر بینا، دُکھ تو ازل سے ہمارے ساتھ ہیں..... اور ابد تک رہیں گے۔''

انہوں نے اپنی تھکی تھکی نظریں نیچے جھکا لی ہیں اور میں پالنے کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی ہوں۔ گلاب کی کیاریاں صاف ستھری ہیں۔ کسی نے کوئی پھول نہیں توڑا۔ نہ مسل کر کیاریوں میں پھینکا ہے۔ لان صاف ستھرا ہے۔ امرود پک کر تیار ہو گئے ہیں۔ کسی نے کچے امرود توڑ توڑ کر نہیں پھینکے اور اس ترتیب، توازن اور صفائی سے میرا دل جانے کیوں اُکتا جاتا ہے۔ میں نے ایک نظر پھر خوابگاہ میں ڈالی ہے۔ سات سال سے یہ پالنا یونہی پڑا ہے۔ خوابگاہ میں گھٹن ہے اور باہر.....

باہر تو اور بھی وحشت ہوتی ہے۔ ''میاں مٹھو، میاں مٹھو، چوری کھالو۔'' طوطا چیخ رہا ہے۔ طوطے کی اس ٹیں ٹیں، قمریوں کی حق السراہ اور چڑیوں کی پیاری آواز کے باوجود باہر سناٹا ہے، ویرانی اور خاموشی۔

کاش اس گھر میں ایک بچہ ہوتا۔ ہمیشہ کی طرح میری سوچ اس نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہے اور میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر سلو آپا کے پاس آ بیٹھی ہوں۔

.....

.....اور آج بھی اس گھر میں آتے ہوئے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ آج جب اس گھر میں ایک پیارا سا بچہ ہے، بالکل میرے تصور کی طرح گلابی گلابی گالوں اور سیاہ آنکھوں والا گل گوتھنا سا بچہ..... یہ دو کنال پر پھیلی ہوئی خوبصورت اور وسیع کوٹھی جہاں انو بھائی رہتے ہیں، منا ہے اور..... اب بھی انو بھائی پہلے کی طرح آفس جاتے ہوئے ذرا کی ذرا اپنی گاڑی روکتے ہیں۔

''بیٹا آج منے کی طبیعت ٹھیک نہیں اگر ہو سکے تو.....''

وہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں انکار کرنا چاہتی ہوں۔ ''نہیں انو بھائی میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہاں جا کر وحشت ہوتی ہے۔'' لیکن میری آواز آنسوؤں سے رندھ جاتی ہے۔ انو بھائی کی گاڑی نکل جاتی ہے اور میں اُڑتی ہوئی دھول دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ انو بھائی کی آنکھوں میں کتنی اُداسیوں نے ڈیرا ڈال لیا ہے۔ میرا دل دُکھ جاتا ہے۔ میں تھکے تھکے قدموں سے گھر سے باہر آتی ہوں اور لوہے کے اس بڑے سے گیٹ کے نزدیک جیسے میرے پاؤں منجمد ہو جاتے ہیں۔ میں نے بارہا سوچا تھا۔ اگر اس گھر میں ایک بچہ ہو جائے تو یہ جامد سناٹا، گمبھیر خاموشی ختم ہو جائے۔ آج اس گھر میں ایک بچہ ہے لیکن پھر بھی خاموشی، تنہائی اور ویرانی کا احساس ختم نہیں ہوا۔ برآمدے میں لٹکا ہوا مٹھو آج بھی چیخ چیخ کر اس سناٹے کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ خوبصورت گھر جو صبح ہوتے حق السراہ، اللہ ہو اور مٹھو میاں کی بے شمار آوازوں سے گونج اٹھتا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں کتنی خاموشی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ ہاں چند دنوں کے لیے احساس ختم ہوا تھا۔ مجھے وہ شام آج بھی یاد ہے جب انو بھائی نے ہنستے ہوئے میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ مدتوں بعد یوں شام کے وقت انہیں اپنے ہاں دیکھ کر میں حیران سی رہ گئی تھی۔

''انو بھائی آپ؟''

''ارے بیٹا کی بچی جلدی سے تیار ہو جا آج اوڈین میں پکچر دیکھیں گے اور واپسی پر چائنیز ریستوران میں کون آئس کریم کھائیں گے۔''

''انو بھائی!'' میں نے بے حد حیرت سے ایک بار پھر انہیں دیکھا تو انہوں نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر مجھے گھما ڈالا۔

''جلدی سے تیار ہو جا گڑیا، سلو انتظار کر رہی ہو گی۔''

وہ امی کے پاس چلے گئے اور میں جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آ گئی..... سلو آپا برآمدے میں ہماری منتظر تھیں۔ خلاف معمول مٹھو خاموش تھا۔ سلو آپا مجھے دیکھ کر ہولے سے ہنسیں۔ ان کی آنکھوں میں وہی ستاروں کی سی چمک تھی۔

''آج ہم بہت خوش ہیں بیٹا۔'' انو بھائی نے پیار سے سلو کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جواب طلب نظروں سے آپا کی طرف دیکھا تو انہوں نے میرے کان میں ہولے سے سرگوشی کی۔

''سچ سلو آپا۔'' میں خوشی سے ان کے گلے لگ گئی۔

اور اس شام ایک طویل عرصہ بعد ہم نے اکٹھے پکچر دیکھی اور آئس کریم کھائی تھی۔ کھانے کی میز پر انو بھائی چہک رہے تھے ورنہ وہ تو مدت سے کھانا

نہایت خاموشی سے کھاتے اور اپنی کتابیں اُٹھا کر برآمدے میں چلے جاتے تھے۔ ان دنوں زندگی کتنی حسین ہوگئی تھی۔ میں سلو آپا کے ساتھ بیٹھ کر ننھے ننھے کپڑے سیتی اور انو بھائی ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنستے رہتے۔ پھر یہ ڈھیر سارے دن کتنی جلدی گزر گئے۔

ایک شام کالج سے آتے ہی انو بھائی کا فون ملا۔ انہوں نے منے کی پیدائش کی خبر سنائی تو میں کتابیں وہیں پھینک کر بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ برآمدے میں مٹھو ''سلو بی بی، سلو بی بی'' کی رٹ لگا رہا تھا۔ میں اسے نظرانداز کر کے تیزی سے سلو آپا کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اندر سے آتے ہوئے انو بھائی سے ٹکرا گئی۔ عجیب وحشت برس رہی تھی ان کی آنکھوں سے..... ''انو بھائی'' میں انہیں دیکھ کر گھبرا گئی۔

''بنی۔'' انہوں نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے یہ کب چاہا تھا، کب چاہا تھا کہ.....''

''انو بھائی کیا ہوگیا ہے آپ کو؟'' میں نے سمجھا شاید وہ یہ خوشی برداشت نہیں کر سکے۔

''بنی۔'' وہ لڑکھڑا گئے۔ میں نے ان کے لڑکھڑاتے وجود کو بمشکل سہارا دیا۔ وہ قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئے۔

''میں نے تو اس سے یہ خواہش کبھی نہیں کی تھی بینا تو جانتی ہے نا۔ وہ خود ہی کڑھتی رہتی تھی پھر وہ کیوں روٹھ گئی۔ کیوں چلی گئی مجھے یہ عظیم تحفہ دے کر۔'' انہوں نے کرسی کے بازو پر سر رکھ دیا اور میں گھبرا کر اندر چلی گئی۔ نرس بچے کو سلو آپا کے پہلو سے اُٹھا رہی تھی اور وہ آنکھیں بند کئے گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بے حد طمانیت اور سکون تھا جیسے انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہو۔ جانے کس بات پر ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا۔

''تخلیق کے بغیر عورت نامکمل ہے۔ وہ جب تک ماں نہیں بنتی اس کا وجود بے معنی ہے۔ ایسے ایک ڈبے کی مانند جو باہر سے تو بہت خوبصورت ہو لیکن اندر سے بالکل خالی ہو۔''

اور اب تخلیق کے جان لیوا لمحوں سے گزرنے کے بعد وہ کتنے سکون کتنی طمانیت سے سو رہی تھیں۔ میں نے روتے ہوئے ان کی بند آنکھوں کو چوم لیا اور روئی کے گالوں ایسے..... نرم رخساروں والے منے کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ہائے یہ ستاروں کی سی چمکنے والی آنکھیں ایک دفعہ تو اس تخلیق کو دیکھ لیتیں۔

میں نے یہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے ڈھیروں باتیں سوچ لی ہیں۔ منا اب تین سال کا ہوگیا ہے اور انو بھائی ان تین سالوں میں یکدم ہی جوانی کی دہلیز کو عبور کر کے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوگئے ہیں اور باقی سب کچھ وہی ہے۔ برآمدے میں آج بھی مٹھو میاں کا پنجرہ لٹکا ہوا ہے اور وہ ''سلو بی بی'' کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ رنگ برنگی چڑیاں، قمریاں اور تیتر بھی اپنی اسی مخصوص جگہ پر ہیں جیسے سلو آپا ابھی یہاں سے اُٹھ کر گئی ہوں۔ انو بھائی نے ان کی خوابگاہ کو بھی ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ وہ آج بھی یوں ہی نفاست سے سجی ہوئی ہے۔ کھڑکی کے پاس خوبصورت جھالروں والا پالنا آج بھی سلو آپا کے نازک نازک ہاتھوں کے لمس کا منتظر ہے کہ وہ آئیں اور اپنے منے کو اس میں لیٹا کر جھلاتے ہوئے لوری گائیں۔ پالنے سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں اٹھتی رہیں اور منا اپنی خوبصورت آنکھوں کو بند کر کے نندیا نگر سونے کے لیے چل دے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا، کچھ بھی نہیں..... ہاں سلو آپا نہیں ہیں۔ منا ہے..... منا جو سارا دن اپنی سلولائیڈ کی گڑیا کو سینے سے لگائے چڑیوں کے پنجرے کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور مجھے آج بھی اس گھر میں ویسی ہی تنہائی اور سناٹے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تہہ بہ تہہ جمے ہوئے کہرے کی طرح گہرا اور جامد سناٹا۔

''منا بیمار ہے۔'' آج صبح انو بھائی نے دفتر جاتے ہوئے بتایا تھا ''منا بیمار ہے۔'' میں نے سوچا ہے اور لوہے کے بڑے سے گیٹ کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ہوں۔ منا بیمار ہے۔ سلو آپا ساری رات جاگتی رہی ہوں گی۔ یہ خیال ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں آیا ہے اور میری آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ مٹھو نے مجھے دیکھتے ہی اُچھلنا کودنا شروع کر دیا ہے۔ ''بی بی، بی بی سلام۔'' میں اسے نظرانداز کر کے قمریوں کے پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہوں جہاں منا اپنی گڑیا کو گود میں لٹائے بیٹھا ہے۔ اسے تو بخار تھا پھر یہ ٹھنڈے فرش پر کیوں بیٹھا ہے۔ میں سوچتی ہوں اور اسے گود میں اُٹھا لیتی ہوں۔ اس کا جسم اب بھی بخار سے تپ رہا ہے۔

''بی بی کہاں ہے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''پتہ نہیں۔'' وہ اپنی آیا کو بی بی کہتا ہے۔ میں اسے اُٹھائے اُٹھائے ڈرائنگ روم میں چلی آتی ہوں۔ نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کو دیکھ کر آج بھی میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی اس کمرے کو بے ترتیب کر دے، صوفوں پر پڑے ہوئے کشن قالین پر پھینک دے، میز پر سیاہی گرا دے اور مینٹل پیس پر رکھی ہوئی چیزوں کو توڑ ڈالے اور سلو آپا پیاری سی مسکان سے بکھری چیزوں کو سمیٹتی رہیں لیکن کشن ترتیب سے پڑے رہتے ہیں، کارنس پر سجاوٹ کی چیزیں یوں ہی سجی رہتی ہیں اس لیے کہ منا بہت سمجھدار ہے۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنی گڑیا سے کھیلتا رہتا ہے۔ وہ رائٹنگ ٹیبل پر سیاہی گرانا جانتا ہی نہیں۔ وہ اپنے بستر پر یوں آرام سے لیٹتا ہے کہ شکن تک نہیں پڑتی۔ کھلونوں سے کھیلتا ہے تو پھر انہیں ترتیب سے رکھ دیتا ہے جیسے جانتا ہو کہ بکھری چیزوں کو سمیٹنے والے ہاتھ اب منوں مٹی کے نیچے دب چکے ہیں۔ وہ بہت کم روتا اور بہت کم ہنستا ہے۔ ضد بھی نہیں کرتا۔ میں نے بارہا انو بھائی سے پوچھا ہے ''انو بھائی منا شرارت کیوں نہیں کرتا۔ یہ اتنا چپ چپ کیوں رہتا ہے۔ کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ بیٹھتا ہے تو گلاس کے نیچے پڑے میٹس کو کھینچ کر گلاس گرانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ انو بھائی خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہتے ہیں اور تب اس سکوت سے گھبرا کر میں نے کئی دفعہ منے سے کہا ہے۔

''منے تم چیزیں کیوں نہیں بکھیرتے، لو ان کشنوں کو اٹھا کر قالین پر پھینک دو۔'' لیکن وہ یوں حیرانی سے میری طرف دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ میں ان چیزوں کو بکھیر تو دُوں پر انہیں کون سمیٹے گا۔ کون مجھے گلے سے لگا کر کہے گا کوئی بات نہیں چاند اور دیکھو میں انہیں ابھی ٹھیک کئے دیتی ہوں۔''

اور ایسے میں میں بے اختیار انو بھائی سے کہتی ہوں کہ وہ منے کو لے کر ہمارے ہاں آجائیں لیکن وہ نہیں مانتے۔

''سلو ناراض ہو جائے گی۔ کیا پتہ اس کی روح اپنے منے سے ملنے آئے اور مایوس ہو کر چلی جائے۔ نہیں بینا میں نہیں جاؤں گا۔''

منے نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا ہے۔ گڑیا اس کے ہاتھوں سے گر پڑی ہے۔ میں چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آگئی ہوں اور کارنس کے پاس رُک گئی ہوں۔ منے دیکھو یہ کیا ہے، کتنا پیارا گھوڑا ہے اور یہ..... یہ دیکھو کتنا پیارا سا پھولدان ہے۔ لو اس گھوڑے سے کھیلو۔''

''نہیں توت جائے گا۔'' منے نے اپنا سر پیچھے کر لیا ہے۔

''تو کیا ہوا!'' منے نے حیرانی سے مجھے دیکھا ہے۔

''بی بی کہتی ہیں اچھی چیزیں نہیں تولتے۔'' وہ اپنی توتلی زبان میں مجھے سمجھا رہا ہے اور میرے حلق میں ڈھیروں آنسو اُتر گئے ہیں۔ سلو آپا کہتی تھیں چیزیں تو ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ میری

آنکھیں جل تھل ہوگئی ہیں اور میں منے کے سنہری بالوں پر چہرہ رکھے رو رہی ہوں۔

"تُو کیوں روتی ہے بینا؟" وہ بالکل انو بھائی کے سے انداز میں کہتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کل شام انو بھائی نے مجھے روتے دیکھ کر کہا تھا "تُو کیوں روتی ہے بینا! مجھے دیکھ میرے اندر کتنا اندھیرا ہے، اتنا دھواں، اتنی گھٹن کہ کبھی کبھی مجھے اس اندھیرے میں منا بھی دکھائی نہیں پڑتا لیکن میں نہیں روتا۔ تُو بھی نہ رویا کر بینا۔ سلو کو تکلیف ہوگی۔" میرے سر پر رکھا ان کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور میں نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے تھے لیکن اب انو بھائی گھر نہیں ہیں اور میں بے تحاشا رو رہی ہوں۔ منا حیران حیران سا مجھے دیکھ رہا ہے۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے کارنس پر پڑا ہوا پھولدان اُٹھا لیا اور برآمدے میں پھینک دیا ہے۔ چھناک کی آواز سے خوبصورت پھولدان ٹوٹ گیا ہے لیکن اب پھر وہی خاموشی کا جان لیوا سا احساس ہے۔ منے کی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت ہے اور باہر گہرا سناٹا ہے۔ اس گھر میں آ کر مجھے ہمیشہ ہی وحشت ہوئی ہے۔ آج بھی جب اس گھر میں گلابی گلابی گالوں اور سیاہ آنکھوں والا پیارا سا بچہ ہے۔

"میں منے کو گھر لے جا رہی ہوں" میں نے تیزی سے رائٹنگ پیڈ پر لکھا ہے اور انو بھائی کے لیے یہ پیغام چھوڑ کر باہر نکل آئی ہوں۔ برآمدے میں مٹھو چیخ رہا ہے لیکن میں نے منے کو سینے سے لگائے اپنے پیچھے بھاری گیٹ کو بند کر دیا ہے۔

آٹھ ٹن وزنی ٹرک کان سے کھینچنے کا مظاہرہ

جارجیا کے سابق ریسلر اور طاقتور شخص نے آٹھ ٹن وزنی ٹرک کو کان سے کھینچنے کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کا نام ورلڈ ریکارڈ ہولڈر کے طور پر درج کر لیا جائے گا۔ 32 سالہ لاشا پترایہ نے جس وقت یہ مظاہرہ کیا بدقسمتی سے اس وقت گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا کوئی نمائندہ وہاں موجود نہ تھا لیکن میڈیا پر اس کی فوٹیج آنے سے اسے اُمید ہے کہ جلد گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والے اس سے رابطہ کریں گے۔ فلم میں پترایہ نے پہلے اپنے کان کی جلد کو آٹھ ٹن وزنی ٹرک کھینچنے کے لئے تیار کیا اور پھر ایک کیبل کے ذریعے ٹرک کو اپنے دائیں کان سے باندھ کر یہ حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا۔ اس موقع پر سینکڑوں لوگ طاقت کا یہ شاندار مظاہرہ دیکھنے کے لئے موجود تھے۔

یاد رہے کہ آٹھ سال قبل پترایہ نے 26 میٹر کے ایک ہیلی کاپٹر کو اپنے کان سے کھینچنے کا مظاہرہ کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس ہیلی کاپٹر کا وزن 7 ہزار 8 سو پچاس کلو تھا۔ تاہم اس بار پترایہ نے 8 ٹن وزنی ٹرک کو کان سے کھینچ کر اپنے سابقہ ریکارڈ کو بھی بہتر بنا دیا ہے۔

(زاہد فیصل۔ شیخوپورہ)

.....☆☆☆.....

شبِ ظلمت

فہمیدہ کوثر

"ارے آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، باؤلے تو نہیں ہو گئے۔" صفیہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ صفیہ بھی اندھیرے میں کھڑی ہے۔ اس لیے حقیقت کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ صفیہ کے ساتھ گزرا ہوا وقت بھی اندھیرے کی نذر ہو گیا۔

ایک شخص کا فسانہ جس کے اندر اندھیرا رچ بس گیا تھا

میرا ذہن بالکل ماؤف تھا۔ میں جتنا سوچتا، اتنا ہی اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا۔ میرے اردگرد تاریکیوں کا ایسا جال تھا کہ میں کوشش بسیار کے باوجود باہر نکل نہ پاتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ اندھیرے گہرے ہوتے جا رہے ہیں جس میں ہم سب ایک دوسرے کو نہیں پہچان پا رہے۔ وہ شام مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اس سے ان تاریکیوں کا ذکر کیا تھا۔

"کیا؟" اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیسی تاریکی۔ میں تو اُجالے کی طرف کھڑا ہوں اور اس اُجالے نے میرے وجود کو بھی روشن اور اُجلا بنا دیا ہے۔" اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"کیا تم واقعی اپنی طرف بڑھتے ہوئے اندھیرے اور پستیوں سے بے خبر ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"یار کیسی بے مقصد اور عجیب بات لے کر بیٹھے

ہو۔'' اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے حس ہو چکا ہے یا پھر اس نے منافقت کی چادر اوڑھ رکھی ہے اور اس چادر میں وہ حقیقت کو قریب سے نہیں دیکھ پا رہا اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ بھی اندھیرے میں تھا لیکن وہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ تو اندھیرے کو روشنی سمجھ بیٹھا تھا۔

اس دن میں خاصا پریشان رہا۔

گھر آ کر میں نے اس بات کا ذکر صفیہ سے کیا تو وہ حیران ہو کر بولی ''بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اندھیرے میں کھڑا ہو اور کہے کہ وہ روشنی میں کھڑا ہے۔''

''بھئی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی اپنے قرب و جوار کے اندھیروں کو اس خوف سے تسلیم نہیں کرتا کہ وہ بھی ان کا حصہ نہ بن جائے۔''

میں نے دلیل دینا چاہی۔

''ارے آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، باؤلے تو نہیں ہو گئے۔''

صفیہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ صفیہ بھی اندھیرے میں کھڑی ہے۔ اس لیے حقیقت کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ صفیہ کے ساتھ گزرا ہوا وقت بھی اندھیرے کی نذر ہو گیا۔

ایک روز میں پھر اس کے پاس گیا۔ وہ شاید کوئی رومانوی ناول پڑھ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' میں نے ناول پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں بس ذرا بور ہو رہا تھا تو لائبریری میں سے یہ ناول لے آیا۔''

وہ ناول کو لاپرواہی سے ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''یار تم عجیب آدمی ہو۔'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''دنیا آہستہ آہستہ اندھیرے کی طرف بڑھ رہی ہے اور تم وہی فرسودہ عشقیہ ناول پڑھ رہے ہو۔''

میں نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

''اوہ..... یار..... پھر وہی بات۔'' اس نے ماتھا پکڑ لیا۔

''سنو! فضل تمہیں کسی ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔ تم نہ تو خود سکون سے زندگی بسر کرتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو چین سے جینے دیتے ہو۔'' وہ برہمی سے بولا۔

اب وہ میری باتوں سے بالکل بیزار ہو چکا تھا۔

میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''فضل۔'' اس نے آواز دی۔

میں اس کی پکار پر رُک گیا۔

وہ دھیمے سے لہجے میں بولا ''تمہارے اندر اندھیرا رچ بس گیا ہے جس کی وجہ سے تم روشنی کو نہیں دیکھ سکتے۔ اپنے اندر کے اندھیروں کو دُور کر دو تمہیں روشنی کا سراغ مل جائے گا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے چلا آیا۔

قریب ہی ایک چھوٹی سی بک شاپ تھی۔ کچھ ہی دیر میں میں بک شاپ کے اندر تھا۔ میں نے تمام کتابیں کھنگال ڈالیں۔ مجھے ایسی کوئی کتاب نہ مل سکی جس سے میں اپنے اندر کے اندھیرے کو دُور کر سکتا۔ میں ایک دم بددل سا ہو گیا۔

یکا یک مجھے خیال آیا کہ وہ کوئی رومانوی ناول پڑھ رہا تھا۔ میں نے ذہنی اضطراب سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک رومانوی ناول خرید لیا۔

میں اس ناول کو پڑھ کر کچھ دیر کے لیے راحت

وسعت کی طرف آنا چاہتا تھا تاکہ اپنے اندر کے اندھیروں سے چھٹکارا حاصل کرسکوں۔

بک شاپ سے واپسی پر اندھیرا چار سو پھیلنے لگا۔ آسمان پر سورج غروب ہونے کے بعد گہری سرخی چھا گئی تھی۔ میں خاصی دیر تک اس سرخی کو دیکھتا رہا۔

مجھے اماں جان کی بات یاد آگئی۔ ان کا خیال تھا کہ جب دنیا میں ہوس، لالچ اور طمع بڑھ جائے گی تو آسمان انگارے کی مانند سرخ ہوجائے گا۔

یوں میں ان کی بات کو پلے سے باندھے بچپن میں سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر نظریں جما لیتا لیکن آسمان کبھی سرخ نہ ہوا اور آسمان کو سرخ ہوتا دیکھنے کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی۔

لیکن آج بک شاپ سے واپسی پر آسمان کو سرخ دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد آسمان کی سرخی اب میرے لیے اشتیاق کی بات نہیں رہی تھی بلکہ میرا وجود پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہر طرف اندھیرا پھیل گیا جس نے آسمان پر چھائی ہوئی سرخی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گھر آکر میں بے سکون اور بے چین سا رہا۔

''اجی، خیریت تو ہے۔ کیوں پریشان ہو؟'' صفیہ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا؟'' میں نے استفساریہ انداز میں پوچھا۔

''کیا؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''وہی جو مجھے دکھائی دیتا ہے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

اور میں خود بھی نہ سمجھ سکا کہ میں صفیہ کو کیا سمجھانا چاہتا ہوں، مجھے محسوس ہوا کہ میں اندھیروں کا مسافر ہوں۔

اس رات میں نے تمام ناول پڑھ ڈالا۔

ناول بھی عجیب کہانی لیے ہوئے تھا۔ اپنے اردگرد سے بے خبر انہونی سے آنکھیں بند کئے تمام کردار اپنی دنیا میں مگن تھے۔ زن، زر، زمین کے چکر میں پڑ کر مقصدِ حیات کو بھول چکے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ناول پڑھ کر مجھے ذہنی آسودگی ملے گی مگر میں تو بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ یہ ناول بھی مجھے روشنی کی طرف نہ لا سکا۔

.....

میں صبح دیر تک سوتا رہا۔ صفیہ کی آواز پر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا، لگتا ہے رات ٹھیک سے نہیں سوئے۔''

میں نے صفیہ سے بے وجہ تکرار کو پسند نہ کیا۔

غسل کے بعد ناشتے کی میز پر آ بیٹھا اور سامنے رکھے ہوئے اخبار کو آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا لیکن ایک خبر پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

''سونامی کی لہروں نے شہر کو نگل لیا۔''

ذہن ماؤف ہوگیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

جب آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹ گیا تو اس خبر کو بار بار پڑھا۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ سونامی کی بجائے اس اندھیر نے انہیں نگل لیا جس میں وہ اپنے مقصدِ حیات کو بھول گئے تھے۔ متاعِ حیات بھلانے والوں کو تو اللہ تعالیٰ بھی بھلا دیتا ہے۔

اسی سے شام کا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ جب میں نے آسمان کو سرخ ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور سرخی کے بعد ایک گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ یکدم مجھے لگا کہ اندھیرے میرا وہم نہیں تھے بلکہ ان اندھیروں کو میں کھلی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔

بچوں کو کہانی سنانے کی روایت

فاطمہ چودھری

تیز رفتار طرزِ زندگی اور رشتوں کے درمیان فاصلوں نے جہاں اور بہت سی روایات تبدیل کی ہیں وہاں رات میں بچوں کو کہانی سُنانے کی روایت بھی ختم ہوتی جارہی ہے

والدین اور بچوں کے انمول تعلق سے جُڑی روایت جو قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہے

تحقیق سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق گزشتہ برسوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگیا ہے جبکہ بچے پڑھائی سے تین گنا زیادہ وقت ویڈیو گیمز، انٹرنیٹ اور ٹی وی دیکھنے میں صرف کررہے ہیں۔

بچوں کو رات میں سونے سے پہلے کہانیاں سنانے کی روایت اب دم توڑتی جارہی ہے۔ دوسری طرف، بچوں میں بھی کہانی سننے کا شوق پہلے جیسا نظر نہیں آتا۔ تحقیق دانوں کے مطابق یہ روایت اب ماضی کا قصہ بننے جارہی ہے۔

گزشتہ برس کی جانیوالی ایک تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ کتابیں پڑھنا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ نہیں رہا ہے۔ بچوں میں لمبے وقت تک ایک ہی کتاب پر توجہ مرکوز رکھنے کی صلاحیت میں کمی واقع

ہوئی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ کتاب پڑھنے میں ان کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔

ماہرین کے مطابق انٹرنیٹ اور ویڈیو گیمز کے زیر اثر پلنے والے بچوں کو کتابیں بور کرتی ہیں۔ روز بروز بڑھتے ہوئے معیارِ زندگی کے مسائل نے والدین کو بھی معاشی سرگرمیوں تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ کہانی سننے اور سنانے دونوں میں دلچسپی کا عنصر ختم ہوتا جارہا ہے۔ لندن میں 'پبلشنگ اینڈ ایجوکیشن جائنٹ پیرسن' کے زیر انتظام ایک تحقیق بچوں میں کتابیں پڑھنے کا رجحان کو دیکھنے کے حوالے سے کی گئی۔ تحقیق میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق گزشتہ برسوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگیا ہے جبکہ بچے پڑھائی سے تین گنا زیادہ وقت ویڈیو گیمز، انٹرنیٹ اور ٹی وی دیکھنے میں صرف کررہے ہیں۔ سروے میں والدین سے پوچھا گیا، کیا وہ اپنے بچے کے لیے ہر روز کہانی کی کتاب پڑھتے ہیں؟ ہر چار میں سے ایک ماں باپ کا کہنا تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے بچے کو رات میں کہانی کی کتاب نہیں سنائی۔ جبکہ ہر دس میں سے 4 یعنی 42 فیصد والدین کے مطابق وہ ہفتے میں ایک بار ضرور اپنے بچے کے لیے کہانی کی کتاب پڑھتے ہیں، 8 فیصد والدین ایسے تھے جنھوں نے کہا کہ وہ چھ ماہ میں شاید ایک بار اپنے بچے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

والدین کی مجموعی رائے کے مطابق، بچے ٹی وی دیکھنا، کمپیوٹر پر وقت گزارنا اور ویڈیو گیمز کھیلنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ والدین نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے اپنے بچے کی دو برس عمر ہو جانے کے بعد پہلی بار اس کے لیے کتاب پڑھی۔

جبکہ اساتذہ کی رائے میں طالب علم کلاس میں کورس کی کتابیں پڑھنے میں دھیان نہیں دیتے ہیں۔ 91 فیصد اساتذہ کا ماننا ہے کہ، طالب علم زیادہ دیر تک اپنی توجہ ایک ہی مضمون پر مرکوز نہیں رکھ پاتے ہیں تاہم والدین اگر بچوں کو گھر میں کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیں تو بچوں میں کتب بینی کا شوق پھر سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔

پبلشنگ ادارے پیرسن کے سربراہ راڈ بریسٹو کے مطابق برسوں کا تجربہ اور تحقیق دونوں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ، بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

ایک دوسری تحقیق 'نیشنل لٹریسی ٹرسٹ' کی جانب سے سامنے آئی ہے جس میں نوجوانوں میں کتاب پڑھنے کی عادت کا مشاہدہ کیا گیا۔ اس سروے میں 11 سے 16 سال کے نوجوانوں نے حصہ لیا۔

تحقیق میں حصہ لینے والے 33 فیصد نوجوانوں نے کتابیں پڑھنا اپنا پسندیدہ مشغلہ بتایا جبکہ، یہ ہی سوچ 14 سے 16 سال کے نوجوانوں میں صرف 24 فیصد دیکھی گئی، 17 فیصد نوجوانوں کی رائے میں اگر انھیں کتابیں پڑھتے وقت کوئی دیکھ لے تو انھیں شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ پچاسی فیصد نوجوانوں نے بتایا کہ انھیں ان کی والدہ کی طرف سے گھر میں پڑھائی کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں کتابیں، رسالے حتی کہ کمپیوٹر کی ویب سائٹ پڑھنے کے رجحان میں بھی گزشتہ سات برسوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔

تحقیق دانوں کی رائے میں طالب علموں کے لیے پڑھائی کیلیے وقت نکالنا بہت ضروری ہے جو طالب علم کورس کی کتابوں کے علاوہ کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں وہ امتحانات میں بہتر نتائج لاتے ہیں۔

اسی طرح جو بچے اسکول میں پڑھائی کرنے کے ساتھ روزانہ گھر میں بھی پڑھائی کرتے ہیں ان کی معلومات کلاس کے ہم عمر بچوں کی بہ نسبت تیرہ گنا زیادہ ہوتی ہے۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

(تحریر: صائمہ عمران)

"تندرستی ہزار نعمت ہے" بہت مشہور مقولہ ہے۔ اس مقولے کو ہمیں اپنی عملی زندگی میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ تندرست رہنے کیلئے ہمیں اپنا طرز زندگی بھی اسی طرح کا رکھنا ہوگا جو صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہو۔ اس میں سب سے ضروری ہے "ہماری غذا"۔ یہ بہت اہم ہے کہ ہم اپنی غذا کی طرف توجہ دیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے پیٹ کو مرغن غذاؤں سے بھرنے کی بجائے ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ قدرت نے بے شمار سبزیاں، دالیں، پھل اور اناج انسان کو عطا کئے ہیں جو نہ صرف ہمیں توانائی دیتے ہیں بلکہ ان کا استعمال ہمیں بیماریوں سے بھی دور رکھتا ہے۔

آج ہم آپ کو ایسی ہی صحت بخش تراکیب بتا رہے ہیں جو نہ صرف آپ کو توانائی فراہم کریں گی بلکہ آپ کو مزید کسی ڈش کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ health conscious لوگوں کے لیے تو یہ تراکیب بہت ہی مفید ہیں۔

Mixed Bean Salad with Tomato Dressing

اجزاء:

ہری پیاز لمبی کٹی ہوئی	ایک پیالی
سُرخ لوبیہ (اُبال لیں)	ایک پیالی
سفید لوبیہ (اُبال لیں)	ایک پیالی
چنے (ابلے ہوئے)	آدھی پیالی

ٹماٹر (چوکور کاٹ لیں)	ایک پیالی
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچ
ڈریسنگ کے لیے:	
زیتون کا تیل	تین کھانے کے چمچ
سفید سرکہ	دو چائے کے چمچ
لہسن باریک کاٹ لیں	ایک چائے کا چمچ
ٹومینو کیچپ	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	حسب ذائقہ

ترکیب: ایک بڑے پیالے میں تمام چیزوں کو ملا لیں، ایک الگ پیالی میں ڈریسنگ کی تمام چیزوں کو مکس کر لیں اور سلاد کے اجزاء کے اوپر ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔

کھیرے اور ادرک کا سلاد

اجزاء:

کھیرے (چوکور کاٹ لیں)	دو عدد
پیاز (چوکور کاٹ لیں)	دو عدد
ادرک (چوپ کر لیں)	دو کھانے کے چمچ
پودینے کے پتے	دو کھانے کے چمچ
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچ
ڈریسنگ کے لیے:	
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
زیتون کا تیل	ایک چائے کا چمچ
چینی	آدھا چائے کا چمچ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: تمام اجزاء کو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور پندرہ منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

(تحریر: فاطمہ قیوم)

Sweet and Sour Chicken Wings

اجزاء:

چکن ونگز	14-12 عدد
براؤن شوگر	ایک کھانے کا چمچ
باربی کیو ساس	دو کھانے کے چمچ
کیچپ	دو کھانے کے چمچ
کچلا ہوا لہسن	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچ
نمک	ایک چائے کا چمچ
آئل یا مکھن	دو کھانے کے چمچ

ترکیب: ایک باؤل میں کیچپ، باربی کیو ساس، لہسن، نمک، براؤن شوگر، گرم مصالحہ پاؤڈر اور مرچ ڈال کر مکس کریں اور ونگز ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور 1 سے 2 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

آئل گرم کریں اور تمام ونگز ڈال کر فرائی کریں کہ وہ گولڈن ہو جائیں۔ اب میرینیشن کا بچا ہوا مکسچر اوپر سے ڈال دیں اور ڈھکن دے کر ہلکی آنچ پر پکائیں یہاں تک کہ ونگز اچھی طرح گل جائیں اور نرم ہو جائیں۔ اب تیز آنچ پر پکائیں تاکہ پانی خشک ہو جائے۔ ڈش میں نکالیں اور سرو کریں۔

سویوں کی مٹھائی

اجزاء:

مکھن	دو چمچ فرائی کے لیے
سویاں	ایک پیکٹ
کنڈینسڈ ملک	ایک ٹن
کوکونٹ پاؤڈر	ایک کپ

بادام، پستہ (تھوڑے سے) باریک کٹے ہوئے

ترکیب: پین میں مکھن گرم کریں اور سویوں کو پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ اب کنڈینسڈ ملک اور کوکونٹ پاؤڈر شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور چولہے سے اُتار لیں۔ ایک فلیٹ ڈش میں پھیلا دیں، اوپر بادام پستے چھڑک دیں اور چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ مزیدار مٹھائی تیار ہے۔

چاکلیٹ رول

اجزاء:

مکھن	100 گرام
شکر	100 گرام
میدہ	150 گرام
دودھ	حسب ضرورت
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچ
کوکو	دو چائے کے چمچ
کیسٹر شوگر	دو کھانے کے چمچ
نمک	ایک چٹکی

ترکیب: میدے کو چھان کر اس میں بیکنگ پاؤڈر اور نمک ملا دیں۔ مکھن اور شکر کو ملا کر کریم سی بنا لیں۔ میدہ میں ملا کر گوندھ لیں۔ گوندھنے کے لیے دودھ استعمال کریں۔ اب اس آمیزے کو دو حصوں میں تقسیم کریں۔ پہلے حصے میں کوکو اور دوسرے حصے میں ونیلا ایسنس ملائیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ بیل کر

رول بنالیں پھر اوپر تلے رکھ کر بیلیں اور آدھا سینٹی میٹر کی موٹائی کے برابر بیل لیں۔ اس کو سیلوفین کی تھیلی میں بیک کر کے فریج میں گھنٹہ بھر کے لیے رکھ دیں۔ اب اپنی مرضی کے مطابق شیپ دے کر آدھے گھنٹے تک بیک کریں۔ سرو کرنے سے قبل کیسٹر شوگر چھڑک لیں۔

پنیر والے پوٹیٹو چپس

اجزاء:

بڑے بڑے آلو	ایک کلوگرام
پنیر ٹکڑے کئے ہوئے	ایک کپ
مکھن	60 گرام
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: آلوؤں کو ہلکا سا اُبال لیں۔ ان کے چھلکے اتار کر دو سینٹی میٹر کی چوڑائی میں گول گول کاٹ لیں۔ قتلے پر مکھن پھیلا کر پنیر کے چند ٹکڑے ڈالیں۔ بیکنگ ڈش میں لگا کر 350 فارن ہائیٹ پر 20 منٹ تک بیک کریں۔ گرم گرم پیش کریں۔

سموسے

اجزاء:

میدہ	ایک پاؤ
قیمہ	ایک پاؤ
نمک	حسب ضرورت
مرچ سرخ	آدھا چائے کا چمچ
دھنیا (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد (چھوٹی)
گھی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
ہری مرچ	تین عدد
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچ

ترکیب: گھی گرم کر کے پیاز لال کر لیں، لال ہونے پر قیمہ ڈال دیں اور بھون لیں، لال مرچ نمک اور سفید زیرہ ڈال کر بھون لیں اور گلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو اس میں ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر بھون کر اُتار لیں۔ میدہ میں گھی اور نمک ڈال کر اچھی طرح گوندھ لیں اور چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر بیلنے کے بعد بیچ میں سے دو ٹکڑے کر لیں۔ دونوں ٹکڑوں پر قیمہ ڈال کر قیف کی شکل کر لیں اور کناروں کو صفائی سے کوڑ لیں۔ گھی گرم کر کے اس میں ایک ایک کر کے تل لیں۔ جب بادامی ہو جائے تو اتار لیں۔

نوٹ: اس طرح سموسوں میں قیمے کے بجائے آلو یا دوسری چیزیں بھری جا سکتی ہیں۔ میٹھے سموسے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

بھنے ہوئے کاجو

اجزاء:

کاجو	ایک کلوگرام
گراؤنڈ پیپر	آدھا چائے کا چمچ
نمک	ایک چائے کا چمچ
پانی	ایک چائے کا چمچ

ترکیب: نمک اور مرچ کو پانی میں ملائیں اور اس پیسٹ کو کاجو پر ملیں۔ گھی لگی اوون ٹرے پر ڈال کر 350 فارن ہائیٹ پر 40 منٹ تک بیک کریں۔ چائے یا مشروبات کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

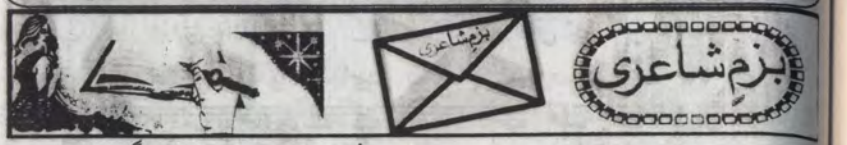

حمد باری تعالیٰ

جو تجھے پسند آئے جو تیرے قریب ہو
یا رب کوئی تو ایسا سجدہ نصیب ہو
معجزہ بھی دیکھوں گر تیرا ہو کرم
میری شفاعت کو کھڑا تیرا حبیب ﷺ ہو
اس راہِ اطاعت میں یہ مرتبہ عطا کر
ہو تیرا جو رقیب وہی میرا رقیب ہو
جب تک یہاں رہوں حمد و ثناء لکھتا رہوں
پھر مکہ اور مدینہ میں پڑھنا نصیب ہو

(ایس۔امتیاز احمد، کراچی)

دُعا

یا رب مرا جہان میں جب تک قیام ہو
ہر دم لبوں پر میرے درود و سلام ہو
سانسوں کا سلسلہ مرے جب تک رہے بحال
ہر آتی جاتی سانس میں بس انؐ کا نام ہو
[illegible] الٰہی سعادت بھی یہ نصیب
ہو صبح میری مکہ میں بطحا میں شام ہو
زم زم ملا جہان میں پینے کو جس طرح
محشر میں بھی عطا ہمیں کوثر کا جام ہو
[illegible] مصطفیٰ ﷺ پر جو سو جاؤں ایک بار
حاصل مجھے جہان میں یہ بھی انعام ہو
رحمت تیرا حبیب ﷺ ہے سر تا پا اے خدا
پھر کیوں نہ امتی پہ جہنم حرام ہو
محشر میں جب بلائیں غلاموں کو مصطفیٰ ﷺ
شامل انہی غلاموں میں یہ بھی غلام ہو
اعزاز شوق کے لیے کافی ہے یہ خدا
پاپوشِ عاشقاں میں ہی گر انتظام ہو

(شوق خانواہنی، خانواہن)

نعتِ رسول مقبول ﷺ

نبی کی شان ایسی ہے بڑی ہی شان والے ہیں
میرے مولا کے پیارے ہیں بڑی ہی شان والے ہیں
نبی سے پہلے بھی آئے کئی پیغمبر مولا
پر وہ ﷺ ہیں سردار الانبیاء بڑی ہی شان والے ہیں
ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بھی نہ آئے گا
حسین علیہ السلام کے وہ نانا ہیں بڑی ہی شان والے ہیں
بنا کر بھیجا رب نے رحمت اللعالمین ان کو
وہ رحمت برساتے ہیں بڑی ہی شان والے ہیں
اُمت کے لیے وہ رات بھر روتے رہتے تھے
وہ اُمت کو بخشوائیں گے بڑی ہی شان والے ہیں
یہ مانا یوسف (علیہ السلام) بھی تھے دنیا میں سب سے پیارے
پر وُہ پیاروں میں بھی پیارے ہیں بڑی ہی شان والے ہیں
پکارتے تھے صادق ان کو دشمنانِ اسلام بھی
وہ سچے اور سخی تھے بڑی ہی شان والے ہیں
کریں گے کاشف پر بھی وہ اپنی رحمتیں اور کرم
وہ اُمتیوں کے رکھوالے ہیں بڑی ہی شان والے ہیں

(محمد کاشف بشیر، ایبٹ آباد)

کلامِ اقبال

گونگی ہو گئی آج زباں کچھ کہتے کہتے
ہچکچا گیا میں خود کو مسلماں کہتے کہتے
یہ بات نہیں کہ مجھے اس پر یقیں نہیں
بس ڈر سا گیا خود کو صاحب ایماں کہتے کہتے
توفیق نہ ہوئی مجھے اک وقت کی نماز کی

اور چپ ہوا مؤذن اذاں کہتے کہتے
کسی کافر نے جو پوچھا یہ کیا ہے مہینہ
شرم سے پانی ہوا میں رمضاں کہتے کہتے
میری الماری میں گرد سے اٹی کتاب کا پوچھا
میں گھر گیا زمیں میں قرآں کہتے کہتے
یہ سن کر چپ سادھ لی اس نے اقبال
یوں لگا جیسے رک گیا ہو حیواں کہتے کہتے
(انتخاب ساحل نور، فیصل آباد)

غزل

فصل گل میں پھولوں سے لدی ٹہنیوں کو لٹیروں نے نوچ لیا
ننگی شاخ پر بیٹھی عندلیب حرماں نصیب نوحہ کناں ہے آج
مالی جان کی بازی لگا کر چمن بندی کرتا رہا
نا اہل کرپٹ حکمرانوں نے چمن کر دیا ویران آج
بے تحاشہ لوڈشیڈنگ بجلی ناپید کاروبار بند ہے
بھوک سے بے تاب سڑکوں پر مزدور لب جاں ہے آج
مہنگائی افراتفری ملک میں حکمران کرپشن میں ڈوبے ہوئے
چولہا ٹھنڈا گیس نہیں خاتونِ خانہ پریشان ہے آج
جھوٹ کی دنیا چل رہی دن رات ایوانوں میں آج کل
زباں و بیاں کو دیکھئے کتنا بڑا منافق ہے انساں آج
اکیسویں صدی ہے قانون کا منشا و معنی سمجھتا ہے ہر خاص و عام
قوم کی بدنصیبی عدلیہ کے پیچھے پڑا بدنیت حکمراں ہے آج
سچائی انسانیت کا زیور مگر لوگ بے بہرہ ہیں اس سے
جمہوریت کے نام پر دغا فریب کی پوٹلی سیاستدان ہے آج
(قاضی محمد یوسف، مسقط)

برکھا

جب برکھا بوند برستی ہے
من آنگن جاگ سا جاتا ہے
ان سوتے جاگتے نینوں میں
اک سپنا جاگ سا جاتا ہے
میرا تن من جھلس گیا بس کر
کیوں دیپک راگ مناتا ہے
سب تھپک سلایا جذبوں کو
کیوں پھر پھر آن جگاتا ہے
(زاہدہ یوسفی، لاہور کینٹ)

غزل

میں نے بہت دُکھ سہے ہیں تنہا
اب مجھے تم اور زیادہ نہ آزمانا
ہر روز آنے کا کہہ دیتا ہے
پھر چپکے سے کر دیتا ہے کوئی بہانہ
تمام جنگل کاٹ کر رکھ دیا تم نے
اب پرندے کہاں بنائیں اپنا آشیانہ
شکاری سے بچ کر رہو اب
کہیں تم نہ بن جانا اسکا نشانہ
راکھ کی چنگاری کا دھیان رکھنا
اس کا کام بھی ہے گھروں کو جلانا
مدینہ کے شاہ کا یہ پیغام ہے
بھوکوں کو کھلانا اور پیاسوں کو پلانا
(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

ہمارے دل کا ہر رستہ کھلا ہے
چلے آؤ یہ کیسا فاصلہ ہے
کئی بے نام سے لوگوں کی چاہت
یہ دل کتنا حدوں سے بڑھ گیا ہے
یہ شہر آرزو کی سمت چلنا
ہمیں ظالم بہت مہنگا پڑا ہے
بہاریں بھی پلٹ آتی ہیں آخر
تم آؤ گے ہمیں اتنا پتہ ہے
منازل اور بھی ہوتی ہیں مانا

تمہیں منزل بنایا کیا بُرا ہے؟
تمہی نے لے لیا جیون ہمارا
ہمارے پاس کیا باقی بچا ہے
کوئی تلخی ہمیں بھی یاد آئی
کہ پلکوں سے جو آنسو گر پڑا ہے
تمہی مجبور تھے یا ہم گریزاں
وفا کے سلسلے کو کیا ہوا ہے
یہی اعزاز ہے اپنا کنول اب
کہ تم نے ہم کو اچھا کہہ دیا ہے
(یاسمین کنول، پسرور)

گزارش

اس سے پہلے کہ مقدر میں میرے رسوائی ہو
دُور آنکھوں سے تمہارے حُسن کی رعنائی ہو
اس سے پہلے کہ برق افگن چھین لے میرا شباب
اس سے پہلے کہ تمہاری آنکھ بھی دھندلائی ہو
اس سے پہلے کہ میری آواز میں شامل ہو کرب
اس سے پہلے کہ تیری کوملتہ مرجھائی ہو
آ بھی جاؤ وقت کی رفتار بڑھتی جائے ہے
عقل اور مجنون کی تکرار بڑھتی جائے ہے
میرے گھر کی خامشی میں بڑھ گئی گمبھیرتا
اور سلیپنگ پلز کی تعداد بڑھتی جائے ہے
تو کہیں ہے میں کہیں ہوں مضطرب ہیں شام و سحر
بے قراری صورتِ اشعار بڑھتی جائے ہے
آ بغاوت ہی کریں کچھ تو کریں میرے رفیق
بے میرے قد سے میری دیوار بڑھتی جائے ہے
(زاہد محمد علی شکرگڑھ)

غزل

وہ جو اب کے مکر گیا کچھ کچھ
میں زمانے سے ڈر گیا کچھ کچھ
مجھ پر الزام کیوں لگاتے ہو
اس کا دل بھی بھر گیا کچھ کچھ
میں جو چپ تھا تو لوگ بھی چپ تھے
پانی سر سے اُتر گیا کچھ کچھ
اس نے اب راستہ بدل ڈالا
کام دشمن بھی کر گیا کچھ کچھ
اشک آنکھوں میں روک لیتا ہے
درد اپنا سنور گیا کچھ کچھ
اس کی آئی جو یاد اے رانا
میرا چہرہ نکھر گیا کچھ کچھ
(قدیر رانا، راولپنڈی)

بے وفا

شاعری کی ہے میں نے تجارت نہیں
دل میں جو بھی خیال آ گیا لکھ دیا
ایک خط میں لکھا حاصل زندگی
دوسرے میں تمہیں بے وفا لکھ دیا
میرا اپنا نہ تھا کوئی مرے سوا
میں نے چاہا کسی کو نہ چاہا گیا
میں نے جتنے محبت بھرے خط لکھے
ان پہ اپنے ہی گھر کا پتہ لکھ دیا
رات پرچھائیوں میں بسر ہو گئی
چاند تارے نہ نکلے سحر ہو گئی
پڑھ نہ پائے نجومی میرے ہاتھ کو
لکھنے والے نے جانے یہ کیا لکھ دیا
آج دل کے کھنڈر سے گزر ہو گیا
روتے روتے گریبان تر ہو گیا
آنسوؤں نے تیرے نام کے سامنے
بے وفا بے وفا بے وفا لکھ دیا
(قیصر الجعفری)

بندا

کاش میں تیرے بن گوش میں بندا ہوتا
رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول
تُو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں
جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے
ملتا اس گوش کا پھر گوشہ مانوس مجھے
کان سے تُو مجھے ہرگز نہ اُتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
یوں تری قربت رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں میں ترا حلقہ بگوش
کاش میں تیرے بن گوش میں بندا ہوتا

(مجید امجد)

محبت

محبت جب بھی ہوتی ہے
ستارہ وار ہوتی ہے
بساط وقت سے باہر
ابد کے پار ہوتی ہے
محبت جب بھی ہنستی ہے
کہیں بجلی چمکتی ہے
کہیں بادل برستے ہیں
کہیں نظمیں سناتی ہے
زمیں پر پھول کھلتے ہیں
پرندے لوٹ آتے ہیں
محبت جب بھی روتی ہے
سمندر پھیل جاتے ہیں
کنارے ڈوب جاتے ہیں
محبت جب بھی سوتی ہے
کسی عورت کے بستر میں
بڑی گہری گھنی نیندیں
بدن پر اوڑھ لیتی ہے
محبت جب بھی مرتی ہے
ابد کی موت مرتی ہے

(نصیر احمد ناصر)

تم یاد آئے

جب شام ہوئی
جب پنچھی لوٹ کے گھر آئے
جب لوگوں کے دل گھبرائے
تم یاد آئے
جب خاموشی نے دروازے پر دستک دی
جب تنہائی نے گیت کوئی گایا
جب ویرانی نے پیار بھرا دل تڑپایا
تم یاد آئے
جب میری کہانی عام ہوئی
جب شہر میں اپنی بات ہوئی
جب رات ہوئی
تم یاد آئے
جب پچھلے پہر سناٹا تھا
جب خواب میں تم نے ساتھ دیا
جب ہاتھ میں میرے ہاتھ دیا
تم یاد آئے
جب چاند ستارے ڈوب گئے
جب دنیا کے ہنگاموں نے مجھے آن لیا
جب دن نکلا
تم یاد آئے

(نوید جمیل)

اگر تم ساتھ دو میرا

جھلستے دن ہوں گرمی کے
سفر ہو ناشناسائی کا
بڑا پرپیچ رستہ ہو
بہت سی پیاس اکٹھی ہو
اور اک ناراض سورج ہو
صدا ہو زرد پتوں کی
ہوا بے چین پھرتی ہو
کوئی عالم ہو وحشت کا
خموشی خود بھی ساکت ہو
زمیں پر جس طرح دیکھیں
تمہارا نام لکھا ہو
بیابانی کا منظر ہو
ہو ہر منظر پہ ویرانی
تمہارا ہجر پھیلا ہو
اُداسی شام والی ہو
ہو موسم بھی خزاں والا
درختوں پر جدائی ہو
میری آنکھوں میں بارش ہو
میرے سینے میں ساون ہو
میں واقف ہوں کہ مشکل ہے
مگر اس ویران عالم میں
اگر تم ساتھ دو میرا
تمہارا ہجر بھی مہکے
جدائی بھی سنور جائے
خموشی بھی سنور جائے
زمیں بھی جھوم کر گائے
اُداسی ساتھ رہ کر بھی
کہیں رستہ بھٹک جائے
سفر آسان ہو جائے
خوشی مہمان ہو جائے
اگر تم ساتھ دو میرا
زمانے کی شہنشاہی
مری پہچان ہو جائے
اگر تم ساتھ دو میرا

(نغمہ خالد)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام: ..... تعلیمی قابلیت: .....
عمر: ..... پسندیدہ شاعر: .....
پسندیدہ غزل/نظم: .....
مشاغل: ..... تاریخ پیدائش/برج: .....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ: ..... پتہ: .....
ای میل: .....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجیے۔

روزی کا دفاع

مظفر کاظمی

پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کبھی کبھی جلتے شعلوں میں بھی کودنا پڑتا ہے..... ایسے ہی ایک ضرورت مند کا قصہ جسے خود کو روزگار کے میسر موقع کا اہل ثابت کرنا تھا!

میرا معمول ہے کہ ہر جمعے کو اخبار میں شائع ہونے والے فلمی اشتہارات کا بغور جائزہ لیتا ہوں۔ عام طور پر مجھے کوئی نہ کوئی معیاری فلم مل ہی جاتی ہے۔ اس صورت میں شام کو گھر جاتے ہوئے متعلقہ سینما میں اتوار کے سپیشل یا تین بجے والے شو کے لیے ایڈوانس بکنگ کروا تا جاتا ہوں۔ اتوار کے سوا فلم دیکھنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہفتے کے باقی دنوں میں اگر کوئی دوست کھینچ لے جائے تو الگ بات ہے اور ہاں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میں ایک نہیں تین چار اخبار دیکھ ڈالتا ہوں مگر کام کی کوئی فلم ہی نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں میرا اتوار کا پروگرام جناح باغ کی سیر کا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار جناح باغ سے آگے شادمان کالونی میں اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لیے بھی چلا جاتا ہوں۔

مگر اس اتوار کی صبح جب میں نیند سے بیدار ہوا

تو مجھے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجب کسلمندی طاری تھی۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ ورزش بھی کی مگر طبیعت کا بوجھل پن قائم رہا۔ ناشتے کے بعد تو اس کیفیت میں اضافہ ہی ہوا۔ عام دنوں کی نسبت سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ سارا دن بستر میں گزارا جائے۔ اب اسے میری خوش قسمتی ہی کہہ لیجئے کہ گزشتہ جمعے کو اخبار میں کسی معقول فلم کا اشتہار نظر نہ آیا تھا۔ ظاہر ہے ایڈوانس بکنگ بھلا کیوں کرواتا؟

وہ اتوار گھر پر بستر ہی میں گزارنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ایک کتاب ''ایک ایگزارسسٹ''۔ ولیم پیٹر بلاٹی کا یہ دہشت ناک ناول میں نے ہفتے کی رات شروع کیا تھا۔ اڑھائی بجے تک تین سو صفحات پڑھ لیے تھے۔ اب بقایا ناول کو ختم کرنے کی خواہش شدید تر تھی کہ انجام تک پہنچنے کا تجسس بلاٹی نے بڑی ذہانت سے ناول میں سمو رکھا تھا اور ہاں وہ جو میری طبیعت میں کچھ گڑبڑ تھی، تو اس کی وجہ میری دیر تک شب بیداری بھی تو ممکن ہے۔

خیر..... میں نے لحاف اوڑھا، کتاب پڑھنی شروع کی اور پھر مجھے اسی وقت ہوش آیا جب آخری صفحے کی آخری سطر بھی ختم ہو گئی۔ میں نے چونک کر گھڑی کی جانب دیکھا۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ چند لمحوں تک چھت کو گھورتے ہوئے ناول کی یاد تازہ کرتا رہا۔ بلاشبہ پیٹر بلاٹی بلا کا کرافٹس مین ہے۔ مگر ناول میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جنہیں ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرے گا۔

اب کے بستر سے اُٹھ کر میں نہایا۔ پندرہ بیس منٹ کے لیے چھت پر ''سن باتھنگ'' کے مزے لوٹے، اس اثناء میں بھوک چمک اٹھی تھی۔ سو بادل نخواستہ اٹھ کر بازار میں میر صاحب کے ہوٹل کا رخ کیا جہاں میرا حساب کھلا ہوا ہے۔ میر صاحب ریٹائرڈ آرمی اکاؤنٹنٹ ہیں۔ اب تانگوں کا کاروبار کرتے ہیں، ساتھ میں یہ ہوٹل کھول رکھا ہے۔ کرائے پر تانگے لینے والے کوچوانوں کے لیے ان کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوپہر اور شام کا کھانا انہی کے ہوٹل پر کھائیں گے۔ سو نتیجہ ظاہر ہے جب بھی کھانے کو جایئے تین چار کوچوان آپ کو پہلے سے براجمان نظر آئیں گے۔ زور زور سے قہقہے لگ رہے ہیں۔ ہنسی ٹھٹھا ہو رہا ہے۔ کوچوانوں کی مخصوص اصطلاحوں میں گفتگو اور گالیاں دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں کھانا کھاتے ہوئے یا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تانگہ چلا رہے ہیں یا پھر خود پر جگالی کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ آپ مشورہ دیں گے۔ یہاں کوئی اور ہوٹل کیوں نہیں دیکھتے۔ سو عرض ہے کہ پوری بستی میں یہی ہوٹل ہمارے نزدیک ہے اور پھر دوسری راز کی بات ذرا کان ادھر لا کر سنیے۔ کوئی دوسرے ہوٹل والا ہمارا حساب کھولنے پر بھی تو تیار نہیں۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ایک کمی کا احساس بری طرح ہوا۔ ہوتا بھی کیوں نا؟ سامنے کی چیز تھی۔ ایک سوا ایک ہی تو بجا تھا مگر روٹی لگانے والا ندارد اور تنور سرد!

اندر میر صاحب اپنے چند کوچوانوں کے حلقے میں 'راجہ اندر' بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر جلال تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق مونچھوں کو بار بار تاؤ دیتے ہوئے غرا رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ وہ تو جیسے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے:

''آؤ جی، آج فلم دیکھنے نہیں گئے۔ کھانا کھائیں گے مگر یہ کم بخت کرموآج بھی نہیں آیا۔ میرا تو بیڑا غرق کر دیا۔ آپ ہی بتایئے وہ ہوٹل کیونکر چل سکتا ہے جس کا تنور چی ہی غائب ہو۔ صبح اس کے گھر گیا تھا۔ کہنے لگے، کہیں کام گیا ہے۔ خانہ خراب

بتا کے جاتا تو میں کوئی انتظام کر لیتا۔ ان ملازموں کے تو دماغ خراب ہو گئے ہیں۔ سارا قصور بھٹو کا ہے۔ خود تو ووٹ لے لیے اور ہمیں پھنسا دیا.....''

ابھی وہ اپنی رو میں بہت کچھ کہتے مگر میں نے پوچھا ''تو کیا آج کھانا نہیں ملے گا؟''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' ان کے لہجے میں یک دم نرمی پیدا ہو گئی۔ ''کتنی روٹیاں کھائیں گے۔ گھر سے پکوا رہا ہوں۔'' پھر اپنے چھوٹے بیٹے کو اشارہ کیا۔ ''جا تین روٹیاں لے آ، گرم گرم۔''

میں نے نشست سنبھالی اور جب تک ان کا بیٹا گھر سے روٹیاں لایا وہ کرموکے نہ آنے سے اپنے نقصان کا رونا روتے رہے۔ البتہ جب میں نے کھانا شروع کیا تو انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور کوچوانوں کے ساتھ پھر سے اپنے مخصوص انداز میں محوِ گفتگو ہو گئے۔

کھانے کے بعد میں نے چائے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے ہوٹل کے گدی نشین ملازم کو لقمہ دیا۔ ''تیز پتی، تیز چینی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر کرموکو کوسنے لگے۔

گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں ایک بار پھر ''ایگزارسسٹ'' کے خیالوں میں کھو گیا تھا اور میر صاحب کی باتوں پر مناسب وقفوں کے ساتھ غیر شعوری طور پر محض سر ہلا رہا تھا جبکہ مجھے کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

پھر اچانک اپنے خیالوں سے میری محویت ٹوٹ گئی جب میں نے ایک نحیف و نزار بوڑھے کو ہوٹل کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ ڈاڑھی کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے لباس سے اس کی مفلوک الحالی عیاں تھی۔ وہ اندر آیا۔ ایک نظر سب کو دیکھا پھر اس نے کوچوانوں کے جلو میں بیٹھے ہوئے میر صاحب کو تاڑ لیا کہ وہی ہوٹل کے مالک ہو سکتے ہیں۔ وہ آگے بڑھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور جب وہ بول رہا تھا مجھے اس کے کھلے منہ سے گنتی کے چند ہی دانت نظر آئے۔ ''بابو صاب، میں بھکاری نہیں ہوں، مجھے کام دے دو۔ اکیلا ہوں بس دو وقت کی روٹی چاہیے۔''

میر صاحب غصے میں تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ بوڑھے کو جھاڑ پلا دیتے مگر اس کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ اس پر خوامخواہ ترس کھانے کو جی چاہتا تھا۔ میر صاحب نے فوراً تو جواب نہیں دیا۔ سوچ میں ڈوب گئے۔ بوڑھا پھر سے فریاد کرنے لگا۔

''بابا ہمارا تو یہ بس چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ ایک گدی نشین ہے۔ ایک ٹیبل مین اور تیسرا کرمو'' اور پھر اس کے ساتھ ہی میر صاحب نے ایک بار پھر روٹیاں لگانے والے کرموکو رگیدنا شروع کر دیا۔

اسی اثناء میں ایک کوچوان نے نووارد بوڑھے سے پوچھا ''بابا روٹیاں لگا لیتے ہو؟''

بوڑھے نے پہلے تو انکار میں سر ہلایا پھر جیسے اس نے اپنی غلطی خود ہی پکڑ لی ہو۔ ''ہاں ہاں پکا لیتا ہوں۔ جب سے نیک بخت مری ہے روٹی پکانے کا تجربہ ہو گیا ہے۔''

''تندرو میں بھی لگا سکتے ہو؟''

''جب توے پر پکا سکتا ہوں تو پھر تندرو میں کیا مشکل ہے؟''

کوچوان نے فاتحانہ انداز میں میر صاحب کو دیکھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ''دیکھا چٹکیوں میں آپ کا مسئلہ حل کر دیا۔''

میر صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''بابا آج رات تُو روٹیاں لگا۔ اگر کام اچھا ہوا تو تجھے رکھ لیں گے اور کرموکی چھٹی۔''

مجھے یقین ہے کہ بوڑھے نے میر صاحب کی

بات کا آخری حصہ بالکل نہیں سنا۔ اگر سنا ہوتا تو وہ یقیناً انکار کر دیتا۔ اپنی آمد کے بدلے میں کرموکی علیحدگی پر وہ ہرگز ہرگز آمادگی کا اظہار نہ کرتا۔ وہ تو بس کام مل جانے کی خوشخبری سن کر اتنا خوش ہو گیا کہ اس نے بے اختیار ہو کر میر صاحب کے گھٹنے چھو لیے تھے۔ ڈھیروں دعائیں دی تھیں اور اس کو چوان کو بطور خاص تھپکی دی تھی جس نے اس کے سامنے روٹیاں لگانے کی تجویز رکھی تھی۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے حساب کی کاپی میں کھانے اور چائے کی رقم درج کی اور جب میں واپس گھر جا رہا تھا تو میر صاحب بوڑھے سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔

.....

سہ پہر کو جب مجھے چائے کی طلب ہوئی تو میں ایک بار پھر میر صاحب کے ہوٹل میں گیا۔ چائے پیتے ہوئے میری نظریں بوڑھے پر جمی رہیں جس نے آٹا گوندھ کر ابھی ابھی ہاتھ دھوئے تھے اور اب بڑی ملائمت اور محویت سے تنور کے اردگرد کی صفائی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے اور اعمال سے ایک ایسی طمانیت ٹپک رہی تھی گویا اسے بیٹھے بٹھائے قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

.....

پھر جب میں رات کے کھانے کے لیے میر صاحب کے ہوٹل پہنچا تو تنور کے گرد خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہر شام بہت سے گھروں سے گندھا ہوا آٹا تنور میں روٹیاں لگنے

پُرسکون قیام گاہ کا خواب

سوئٹزرلینڈ کی ڈیزائنر نے غبارہ نما پُرسکون گھر تیار کرلیا ہے۔ بعض اوقات زندگی کے ہنگاموں اور شوروغل سے اُکتا کر انسان سکون اور ایسا ماحول چاہتا ہے جہاں وہ ہو اور اس کی تنہائی۔ اسی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سوئس ڈیزائنر میکا سالیب نے ایک ایسی غبارہ نما ٹرانسپرینٹ قیام گاہ تیار کی ہے جو ایک پُرسکون اور بیرونی شوروغل سے پاک کمرے کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آپ اپنی ضرورت کی اشیاء مثلاً سونے کا بستر، کھانے پینے کا سامان وغیرہ بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ یہ غبارہ نما کمرہ آپ گھر کے اندر یا کسی حسین مقام پر جہاں کہ پانی کے اندر بھی رکھ کر استعمال کر سکتے اور حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ میکا سا کا کہنا ہے کہ اس خاص طور پر تیار کردہ کمرے پر انیس سو پاؤنڈ لاگت آئی ہے اور اسے بہت جلد کمرشل بنیادوں پر فروخت کیلئے پیش کیا جائے گا۔

(مرسلہ: سائرہ تنویر۔ جوہر ٹاؤن لاہور)

.....☆☆☆.....

کے لیے آیا کرتا تھا اور ہر شام ایک ایسی صورتحال ہوتی تھی کہ ایک طرف ہوٹل کے اندر بیٹھے ہوئے گاہک شور مچا رہے ہوتے کہ انہیں گرما گرم روٹی دی جائے اور آٹے والے لوگ الگ مطالبہ کرتے کہ ان کی روٹیاں پہلے لگائی جائیں۔ میں اس صورتحال سے عموماً حظ اٹھایا کرتا تھا مگر اس شام میرے اشتیاق میں اضافے کی ایک اور وجہ تھی..... وہی بوڑھا!

میں نے دیکھا، اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اس کے بوڑھے ہاتھ کپکپا رہے تھے مگر وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روٹیاں لگا سکے۔ اس کے روٹیاں لگانے کے انداز سے صاف مترشح تھا کہ وہ اس معاملے میں اناڑی ہے مگر وہ حتی الامکان، شعوری طور پر خود کو تنور میں روٹیاں لگانے والے ایک ماہر تنور چی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔ بہت ممکن تھا اگر وہ آہستگی سے کام کرتا تو اسے مناسب قسم کی روٹی لگانے میں کامیابی ہوتی۔

میں ذرا اور قریب ہو گیا۔ میر صاحب اس کے سر پر کھڑے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ بوڑھے پر مرکوز تھی۔ انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا۔ وہ تو بس بوڑھے کی کارکردگی پر طنزیہ جملوں کی بھرمار کیے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے اندر سے گاہکوں کی غراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ''کیسی روٹیاں ہیں؟'' کوئی روٹی کے کچی ہونے کا رونا رو رہا تھا تو کوئی جلی ہونے کا۔ باہر آٹے والے لوگ بوڑھے کو سستی اور نااہلی کے طعنے دے کر اس کا الگ ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے تو میر صاحب سے صاف کہہ دیا ''میر صاحب، اگر کل بھی اسی نے روٹیاں لگائیں تو ہم کسی دوسرے تنور کا رُخ کر لیں گے۔ ہمیں نہیں چاہئیں ایسی روٹیاں۔'' اس کے اس جملے نے تو جلتی پر تیل کا کام دیا۔ ادھر اندر سے بھی روٹی روٹی کی رٹ تیز ہو گئی اور میر صاحب کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

''جو کسر کرمو نے چھوڑی تھی وہ تُو نے پوری کر دی۔ بس کل سے تُو کام نہیں کرے گا۔'' بوڑھے نے ملتجیانہ نظروں سے میر صاحب کو دیکھا۔ ایک نظر تنور کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں پر دوڑائی۔ وہ زبان حال سے کہہ رہا تھا ''مجھ پر رحم کرو، صبر کرو، مجھے کام تو کرنے دو۔ میرے رزق پر لات مت مارو۔''

پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ روٹیاں بنانے اور لگانے لگا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا، پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی بوڑھی آنکھیں بھرائی ہوئی تھیں مگر وہ اندھا دھند روٹیاں لگائے جا رہا تھا۔

اچانک تنور کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی نے بڑی تلخی سے کہا ''بابا تمہارا تو حافظہ بھی کمزور معلوم ہوتا ہے۔ اپنی طرف روٹیاں لگا کر بھول ہی گئے ہو۔ ساری روٹیاں جل گئی ہیں، میرے آٹے کا ستیاناس کر دیا۔''

بوڑھے نے دائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی روٹیاں لگانے والی گدی ایک طرف رکھی اور سلاخیں تھامے تیزی سے جلنے والی روٹی نکالنے کے لیے جھکا مگر اس کے عمل میں اتنی تیزی تھی کہ اس کا توازن قائم نہ رہا اور وہ اپنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ منہ کے بل تنور میں گر پڑا۔

چند ہی لمحوں میں فضا انسانی جسم کے جلنے کی ناقابل برداشت بُو سے بھر گئی!

سیارہ مشورہ کلینک

ڈاکٹر ندیم چوہدری

ڈاکٹر ندیم چوہدری 28 سال سے لاہور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ نے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، آیورویدک سائنس اور یونانی سسٹم آف میڈیسن کا بغور مطالعہ کر رکھا ہے۔ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے آپ تمام طریقہ ہائے علاج میں سے مناسب ترین ادویہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس گروپ کی دوائی تجویز کی جاتی ہے بالکل اسی گروپ کی غذا بھی مریض کو استعمال کروائی جاتی ہے۔ نتیجتاً مریض اپنے مرض سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ ہر طرح کے مرض کا علاج کرتے ہیں لیکن بالخصوص آپ کو معدہ، جگر اور جنسی امراض کے علاج میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہزاروں مریض آپ کے ذریعے سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس فن میں مزید ترقی دے (آمین) آپ میڈیکل ریسرچ سکالر بھی ہیں۔ آپ کے مضامین کئی نیشنل اور انٹرنیشنل اخبارات اور رسالوں مثلاً حکایت، نوائے وقت، دبئی نیوز وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ نے آپ کی طبی خدمات سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو دعوت دی ہے کہ اپنی طبی قابلیت کے جوہر ان صفحات کی زینت بنائیں۔ اس ماہ کا مشورہ کلینک آپ کے سامنے ہے۔

چہرہ چھائیوں سے بھرا ہوا ہے

جہلم سے ذکیہ باسط لکھتی ہیں: ڈاکٹر صاحب السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، دنیا و آخرت کی کامیابیاں عطا فرمائے۔ سیارہ مشورہ کلینک ایک انتہائی مفید سلسلہ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اسے ہمیشہ جاری رکھیے گا تاکہ خلق خدا آپ کے مشوروں سے مستفید ہوتی رہے۔ میں اس خط کے ذریعے آپ کو اپنا ایک مسئلہ لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر کے ممنون فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب میری عمر تقریباً 21 سال ہے۔ میں نے بی ایس سی کی ہوئی ہے۔ میرے چہرے پر چھائیاں بہت زیادہ ہیں جن کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے بہت علاج کروایا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ یہ چھائیاں جلد میں مکس ہیں۔ کوئی بھی کریم لگانے سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ کریمیں لگانے سے تو اُلٹا کام خراب ہو جاتا ہے۔ چہرہ پہلے سے بھی بدنما ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں جلن بہت ہوتی ہے۔ چوبیس گھنٹے ہاتھ اور پاؤں گرم رہتے ہیں۔ دل بہت گھبراتا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم جگر کی گرمی بتاتے ہیں۔ دو تین بار دوائی لی ہے جس سے جلن میں تو فرق پڑا ہے لیکن چھائیاں ٹھیک نہیں ہوتیں۔ آپ مہربانی فرما کر کوئی بہترین نسخہ تجویز کریں اور اس مصیبت سے میری جان چھڑوائیں۔

☆.....بیٹی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ چہرے کی چھائیاں دراصل کسی اندرونی خرابی کی غمازی کرتی ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے ماہانہ نظام میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ علاوہ ازیں آپ خوراک کس قسم کی کھاتی ہیں؟ رنج و غم یا ٹینشن کس قدر ہے؟ کیا آپ کی نیند پوری ہوتی ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کہیں آپ بہت زیادہ دماغی تھکان کا شکار تو نہیں؟ چھائیوں کے مستقل علاج کے لیے جسم کو detox کرنا بھی ضروری ہوتا ہے یعنی غیر ضروری فاضل مادے جسم سے خارج کیے جاتے ہیں یعنی جسم میں جو چیز بڑھ چکی ہے اس کو خارج کرنا اور جو چیز کم ہے اس کو جسم میں داخل کرنا علاج معالجے کا بنیادی اصول ہے۔

آپ ہومیو دوائی کالی بائیکروم 30 خرید لیں اور حسب ہدایت استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ نیٹرم میور اور فیرم فاس 6x چار چار ٹکیاں دن میں چار بار نیم گرم پانی سے کھا لیا کریں۔ بڑا گوشت، بینگن اور پالک اپنی غذا سے خارج کر دیں۔ بکرے کا گوشت اور سرسوں کا ساگ آپ کے لیے مفید غذائیں ہیں۔ پھلوں میں آم، خربوزہ اور پپیتا مفید ہیں۔ اگر ان پھلوں کا موسم نہ ہو تو گاجریں اور مولیاں وافر مقدار میں استعمال کریں۔ چہرے کو دھونے کے لیے ڈیٹول سوپ یا نیم سوپ استعمال کریں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ قبض نہ ہونے دیں۔ اگر ہو جائے تو چھلکا اسپغول استعمال کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ذہنی سکون ختم ہو چکا ہے

حیدرآباد سے کسی بہن نے خط لکھا ہے لیکن اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ لکھتی ہیں: سیارہ ڈائجسٹ میں آپ کا کالم پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جب یہ پتہ چلا کہ آپ نفسیاتی اور معاشرتی مسائل پر مشورے دیتے ہیں تو کچھ امید بندھ گئی کیونکہ میرا مسئلہ کچھ اسی طرح کا ہے۔ عرض یہ ہے کہ میری عمر چالیس سال ہے۔ میری پہلے دو جگہ شادی ہو چکی ہے لیکن دونوں شوہر انتہا درجے کے ظالم نکلے۔ انہوں نے مار پیٹ کرنے میں اور ہر طرح کی اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دونوں جگہ سے مجھے طلاق ہوگئی۔ اب میری تیسری جگہ پر شادی ہوئی ہے۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن چونکہ میرے گزشتہ دو شادیوں کے تجربات بہت تلخ ہیں اس لیے میرے ذہن میں ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ یہ شوہر بھی میرے ساتھ بُرا سلوک نہ کریں۔ میں ویسے تو نارمل رہتی ہوں لیکن جب بھی شوہر سے میرا سامنا ہوتا ہے تو میری طبیعت میں بہت زیادہ گھبراہٹ آ جاتی ہے۔ ان کے سامنے صحیح کام بھی اُلٹا ہو جاتا ہے۔ یہ صورتحال دیکھ کر وہ پریشان ضرور ہوتے ہیں لیکن مجھ سے شکایت کوئی نہیں کرتے۔ میں نے گزشتہ بیس سالہ زندگی چونکہ بہت اذیت میں گزاری ہے اس لیے مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں تاکہ میں نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکوں۔

☆.....آپ کے اندر جو احساس عدم تحفظ اور خوف پایا جاتا ہے یہ ماضی کے گزرے ہوئے تکلیف دہ تجربات کا نتیجہ ہے۔ میں آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو بہت زیادہ خوشیاں اور سکون عطا فرمائے۔

آپ نے خود لکھا ہے کہ آپ کے شوہر ایک عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے آپ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ سے شادی کی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مثبت سوچ رکھنے والے اور عورت ذات کا احترام کرنے والے شخص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آپ کی مذکورہ بالا کیفیات نوٹ کرنے کے باوجود آپ سے اس بارے میں

بات نہیں کی۔ ایک اچھے شخص کی رفاقت میسر ہونے پر آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کیجیے اور ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کے چمن کو ہمیشہ ہنستا بستا رکھے۔

آپ کو چاہیے کہ فراغت کی زندگی سے پرہیز کریں۔ مثبت تعمیری کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے سے آپ کو ایک خوشگوار مسرت حاصل ہوگی۔ آپ کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھیں۔ شوہر کے قریبی رشتہ داروں کا بھی احترام کریں۔ ہمیشہ دوسروں کے کام آئیں۔ جھوٹ، فریب اور مکاری کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ آہستہ آہستہ آپ کی قوت ارادی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور آپ ذہنی انتشار، خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے نجات حاصل کر لیں گی۔

بے رونق بال اور سیاہی مائل رنگت

ملتان سے منزہ شاہین لکھتی ہیں: ڈاکٹر صاحب السلام علیکم! مختلف جگہوں سے مایوس ہو کر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ بے شمار جگہوں سے علاج کرایا لیکن فائدہ بالکل نہیں ہوا۔ میری عمر 20 سال ہے اور میں بی کام کی طالبہ ہوں۔ میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ بالوں سے متعلق ہے۔ میرے بال انتہائی روکھے اور بے رونق ہیں۔ صرف دو سال قبل یہی بال نرم، چمکدار اور گہرے کالے تھے۔ آگے سے ان کے سرے بھی دو منہ کے ہو گئے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے چہرے پر بلیچ کریم لگائی تھی اور اپنے بال بھی بلیچ اور کلر کیے۔ شاید میرے بالوں کی بے رونقی اس کریم کی وجہ سے ہے۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے کی رنگت کافی سیاہی مائل ہے۔ جب میں اپنی سہیلیوں کو دیکھتی ہوں تو دل میں خواہش اُٹھتی ہے کہ کاش میرے چہرے کی رنگت بھی اس طرح کی ہو۔ آپ سے گزارش ہے کہ ان دونوں مسائل کے حل کے لیے مجھے کوئی بہتر مشورہ دیں۔

☆.....بیٹی آئندہ احتیاط کریں کہ جب بھی بالوں کو بلیچ کرنا ہو یا کلر کرنا ہو تو کسی ماہر سے مشورہ کر لیں ورنہ بالوں کو مستقل طور پر کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ ایسے بالوں کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ ہفتے میں دو بار تیل لگایا جائے۔ کبھی کبھی سر دھونے سے قبل اپنے بالوں کو انڈوں، تیل اور دہی سے کنڈیشنر کریں۔ بالوں کے دو منہ سے بچنے کے لیے بالوں کی نوکوں کو ہر چار سے چھ ہفتے تک ترشوا دیں۔ سادہ غذا استعمال کریں۔ پھلوں اور سبزیوں کا زیادہ استعمال کریں۔ ٹینشن سے بچیں۔ اپنی نیند ہر حال میں پوری کریں۔ حد سے زیادہ دماغی تھکان بھی بالوں کی صحت پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ ہر حال میں اعتدال سے کام لیں۔ چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے آپ جو کا آٹا لے لیں۔ اس میں دہی شامل کر کے ایک پیسٹ سی بنا لیں اور اسے چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں۔ 20 منٹ بعد نیم گرم پانی سے چہرہ اور ہاتھ دھو لیں۔ انشاء اللہ آپ کے دونوں مسائل حل ہو جائیں گے۔

دار چینی کے فوائد

کوئٹہ سے احمد زمان خان لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب حکمت ہمارا خاندانی پیشہ رہا ہے۔ یہ فن دادا پردادا سے ہمارے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔ صرف ہماری نسل نے یہ کام نہیں سیکھا۔ میری تعلیم ایم بی اے ہے اور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ میرے دوسرے دونوں بھائی انجینئر ہیں۔ دونوں بہترین عہدوں پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ ہے۔ میری دو سال قبل شادی ہوئی تھی۔ میرے سُسر دل کے کسی مرض میں مبتلا تھے۔ علاج معالجے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا پھر

کسی نے دارچینی اور شہد ملا کر کھانے کا کہا۔ میرے سُسر اس پیسٹ کو ڈبل روٹی کے سلائس پر لگا کر ناشتے میں استعمال کرتے رہے تو ان کے خون کی شریانوں کی رکاوٹ کافی حد تک ختم ہوگئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے فن حکمت کیوں نہ سیکھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہمیں دارچینی کے فوائد سے آگاہ کریں اور مختلف امراض میں اس کے درست استعمال کی وضاحت کریں۔

☆.....خان صاحب! آپ نے اپنے خط میں امراض قلب کے حوالے سے جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ خون کے گاڑھا ہونے اور کسی مواد کے جماؤ کا شکار ہونے سے شریانیں سخت ہو جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایسی غذاؤں اور دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بلاکیج (blockage) کو ختم کرسکیں۔ دارچینی اس گروپ کی ایک ممتاز دوائی ہے۔ اسے شہد کے ساتھ ملا کر مسلسل استعمال کرنے سے امراض قلب پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

دارچینی کے دیگر فوائد حسب ذیل ہیں:

☆اگر ایک گلاس نیم گرم پانی میں چائے کا ایک چمچ شہد اور تھوڑی دارچینی حل کر کے غرارے کئے جائیں تو اس عمل سے منہ سے آنے والی ناگوار بُو ختم ہو جاتی ہے اور سانسیں خوشگوار مہک کی حامل ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جو لوگ نقرس یا گنٹھیا میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کے لیے دارچینی تکلیف کو کم کرنے کے لیے معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسے مریضوں کو چاہیے کہ ایک حصہ شہد کو دو گنا نیم گرم پانی میں ڈالیں پھر اس میں ایک حصہ دارچینی ملائیں تب اس آمیزے کو جسم کے ان حصوں پر لگا کر مالش کریں جہاں کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی ہو۔ شدید نوعیت کے نقرس میں مبتلا مریضوں کے لیے یہ طریقہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

☆جاپان اور آسٹریلیا میں ہونے والی ایک حالیہ تحقیق میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہد اور دارچینی کا استعمال ہڈیوں کے سرطان میں بہت مفید ہے۔ ان امراض میں مبتلا مریض ایک کھانے کا چمچ شہد ایک گلاس پانی میں حل کریں اور اس میں ایک چمچ دارچینی کا پاؤڈر ملائیں۔ ایک ماہ تک دن میں دو یا تین دفعہ استعمال کرنے سے انشاء اللہ یہ مرض دور ہو جائے گا۔

☆ایسے افراد جو عام طور پر ٹھنڈ کے اثرات قبول کر کے نزلہ زکام میں مبتلا ہو جاتے ہیں ایسے مریض اگر شہد اور دارچینی ملا کر مسلسل تین دن تک کھائیں تو اس سے کھانسی بھی دُور ہوگی اور بدن کی مختلف جوفوں کی صفائی بھی ہو جائے گی۔ اسی طرح جو لوگ بلغم کی زیادتی کی وجہ سے سماعت کی کمی کا شکار ہو جائیں انہیں بھی یہی نسخہ استعمال کرنا چاہیے۔

☆بڑھاپے میں انسان اکثر تھکاوٹ کا شکار رہتا ہے۔ ایسے میں اگر شہد اور دارچینی گرم پانی میں حل کر کے استعمال کریں تو ایک ہفتے میں جسم کی توانائی بحال ہو جاتی ہے اور بندہ اپنے آپ کو چست و توانا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اکثر لوگوں کے کمزوری کی وجہ سے بال گرنے لگتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ایک آسان نسخہ حاضر ہے۔ گرم زیتون کے تیل میں ایک کھانے کا چمچ شہد اور ایک چائے کا چمچ دارچینی ملا کر پیسٹ سی بنالیں اور اسے سر اور بالوں پر لگائیں۔ 15 منٹ بعد سر دھولیں۔ کچھ دن بعد بال گرنا بند ہو جائیں گے۔

☆علاوہ ازیں جلد کے انفیکشن اور کیل مہاسوں کے لیے بھی شہد اور دارچینی کا استعمال مفید ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شہد سے تیار کردہ چائے میں اگر دارچینی پاؤڈر شامل کر کے پی لیں تو اس سے نہ صرف ذہن کو بہت سکون ملتا ہے بلکہ جسم

بھی اطمینان محسوس کرتا ہے۔ نتیجتاً انسان خود کو کم عمر محسوس کرنے لگتا ہے۔

☆ تین کپ پانی اُبالیں۔ اس میں چار چائے کے چمچ شہد ڈالیں اور ایک چائے کا چمچ دار چینی پاؤڈر شامل کریں۔ اس کی ایک چوتھائی مقدار دن میں تین سے چار مرتبہ پی لیں۔ یہ قہوہ آپ کو ذہنی اور جسمانی سکون سے ہمکنار کرے گا اور آپ کی جلد کو نرم اور تروتازہ رکھے گا۔

ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ

سرگودھا سے چوہدری عبدالقیوم لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب میں سیارہ ڈائجسٹ میں آپ کا مشورہ کلینک بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ ایک بہت معلوماتی سلسلہ ہے۔ ہمیں اس سے بہت سی طبی، نفسیاتی اور معاشرتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آج میں اپنا ایک مسئلہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے تقریباً دو سال پہلے میری کمر میں درد شروع ہوا جو گردوں کے قریب تھا۔ درد اتنا شدید تھا کہ میں سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر بیٹھ جاتا تو پھر اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں ہسپتال گیا۔ وہاں انہوں نے میرا خون اور پیشاب ٹیسٹ کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے گردوں کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے مجھے دوائی دی جو کہ میں نے استعمال کی۔ نتیجتاً درد میں تھوڑا افاقہ ہوگیا۔ پھر میں ایک اور ہسپتال گیا۔ انہوں نے میرے ایکسرے لیے اور بتایا کہ آپ کی ریڑھ کی ہڈی کے دو مہروں میں خرابی ہے، آپ ورزش کیا کریں اور فرش پر سویا کریں۔ میں کافی عرصے سے ایسا ہی کر رہا ہوں۔ کچھ دن ٹھیک رہتا ہوں اور اس کے بعد پھر درد شروع ہو جاتا ہے۔ اب یہ درد گردن سے نیچے والے مہروں میں بھی ہوتا ہے اور گردوں والی جگہ پر ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب ہوتا ہے۔ گردن میں تو درد ہر وقت رہتا ہے مگر نچلے مہروں میں کبھی کبھی آرام بھی آجاتا ہے۔ میری عمر 35 سال ہے۔ میری عمومی صحت بھی کمزور ہے۔ اگر میں دودھ پیوں تو بلغم بڑھ جاتا ہے۔ اگر میں کوئی گیم کھیلتا ہوں تو درد زیادہ ہو جاتا ہے اور سانس بھی چڑھ جاتا ہے۔ یہی مسئلہ میرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا بھی ہے۔ کیا یہ موروثی ہے؟ ازراہِ کرم راہنمائی فرمائیں اور بہترین علاج تجویز فرمائیں۔

☆.....چوہدری صاحب! سب سے پہلے تو اس چیز کو جان لیں کہ یہ سلسلہ موروثی نہیں ہے۔ غذا میں کمی اور عدم توازن بنیادی طور پر اس کا سبب ہیں۔ جسم کی ہڈیوں، جوڑوں اور پٹھوں کو مناسب غذا نہیں ملتی رہی۔ اس قسم کی صورتحال میں اس طرح کے مسائل کا جنم لینا ایک قدرتی امر ہے۔ بہرحال آپ اپنے گردوں کا الٹراساؤنڈ کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ گردوں میں کیا خرابی ہے۔ علاوہ ازیں اپنی متاثرہ ریڑھ کی ہڈی کا ایکسرے کرائیں تاکہ صحیح تشخیص ہو سکے کہ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں واقعی کوئی خرابی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ان کے نتائج سے ہمیں آگاہ کریں۔ گردوں کا مسئلہ تو عام دوائی سے حل ہو جائے گا لیکن مہروں کے صحیح علاج کے لیے بہترین دوائی تیار کرنا پڑتی ہے۔ یہ دوائی نہ صرف مہروں کی ساخت کو درست کرتی ہے بلکہ درست افعال انجام دینے کے لیے بہترین توانائی بھی مہیا کرتی ہے۔ نیز رپورٹس دیکھنے کے بعد مناسب غذا کا تعین بھی کیا جائے گا جو کہ علاج میں معاون ثابت ہوگی اور نتیجتاً آپ کی صحت بہت جلد بحال ہو جائے گی۔

لڑکیوں کے قد چھوٹے ہیں

کوٹ ادو سے عمر عباس آہیر رقمطراز ہیں: ڈاکٹر صاحب میں سیارہ ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں اور آپ کے سیارے مشورہ کلینک سے بھی بدستور مستفید ہوتا ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میری

دونوں لڑکیوں کے قد ان کی عمروں کے حساب سے بہت چھوٹے ہیں۔ ایک صاحب نے دو عدد دوائیں تجویز کی ہیں۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ آپ سے مشورہ کر لوں۔ براہ کرم مہربانی فرما کر اپنی ماہرانہ اور قیمتی رائے سے نوازیں۔ مشکور ہوں گا۔

☆.....عمر عباس آہیر صاحب! آپ نے خط میں اپنی بچیوں کی عمر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ قد بڑھانے والی ادویات عام طور پر صرف اسی صورت میں کارآمد ہوسکتی ہیں جب بچوں کی عمریں 15 سال سے کم ہوں۔ باقی آپ نے کسی صاحب کی تجویز کردہ دواؤں کے بارے میں مشورہ طلب کیا ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ وہ اس مقصد کی دوائیں نہیں ہیں لہٰذا ان کا استعمال بچیوں کے لیے مفید نہیں۔ آپ مجھے مزید ایک خط لکھیں جس میں مجھے بچیوں کی عمر کے بارے میں مطلع کریں تاکہ آپ کو مناسب اور صحیح ادویات تجویز کی جاسکیں۔

نیند کی کمی کا شکار ہوں

راولپنڈی سے ملک آصف علی اعوان لکھتے ہیں: ڈاکٹر صاحب! میں دو سال سے بے خوابی کا شکار ہوں۔ شروع شروع میں جب مجھے یہ مسئلہ ہوا تو میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے گولیاں لکھ دیں۔ پہلے آدھی گولی کھانے سے نیند آجاتی تھی پھر پوری گولی کھانے لگا۔ یونہی دو سال گزر گئے۔ اب یہ حال ہے کہ دو گولیاں بھی کھالوں تو نیند نہیں آتی۔ صرف دن میں تھوڑا بہت اونگھ لیتا ہوں۔ میری عمر 35 سال ہے۔ میرا بلڈ پریشر بھی ہائی رہنے لگا ہے۔ ہر طرح کی دوائیاں کھا چکا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں اور کیسے اپنی نیند پوری کروں۔ نیند کی کمی سے میری صحت اور خصوصاً یادداشت بہت کمزور ہوگئی ہے۔ ازراہ کرم میری مدد کریں۔

☆.....آصف حیات صاحب! حیرت ہے آپ کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں۔ اکثر لوگوں کے ساتھ بڑی عمر میں یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ بہرحال اگر ایک بندہ بھرپور نیند نہ لے سکے تو اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آرام کے لیے نیند رکھی ہے اور گہری نیند صحت کی علامت ہے۔ بے خوابی اور ڈپریشن اس دور کے خاص تحفے ہیں جو کہ امراء کو درپیش ہیں۔ غریب مزدوروں کو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آپ نے کڑاکے کی سردی میں یا شدید گرمی میں فٹ پاتھوں پر سوئے مزدوروں کو دیکھا ہوگا۔ انہیں نہ تپش کا احساس ہوتا ہے نہ سردی کا۔ نیند آور دواؤں سے شروع شروع میں تو اچھی نیند آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دوائی کی مقدار بڑھتی چلی جاتی ہے اور نیند کم ہو جاتی ہے۔

آپ اپنی غذا پر خصوصی توجہ دیجیے۔ اگر آپ کو کوئی ذہنی پریشانی ہے تو اسے جھٹک دیجیے۔ غصہ، اشتعال، قبض، معدے کی گرانی وغیرہ جیسے عوامل بھی نیند میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ آپ اپنی غذا میں سے کولا مشروبات، الکحل، کافی، چاکلیٹ اور تلی ہوئی بازاری چیزیں نکال دیجیے۔ وٹامن، کیلشیم، میگنیشیم اور جست پر مبنی غذاؤں کا استعمال خصوصی طور پر کیجیے۔ ناشتے میں جو کا دلیہ استعمال کیجیے۔ تازہ سبزیوں کا سلاد، پکی ہوئی سبزی اور گوشت کا شوربہ آپ کے لیے اچھی غذائیں ہیں۔ روزانہ ایک پیالی دہی بھی استعمال کیجیے۔ رات کو نیم گرم دودھ کا ایک پیالہ پی کر بستر پر لیٹیے۔ پنجگانہ نماز باقاعدگی سے ادا کیجیے۔ سونے سے کچھ دیر پہلے کوئی کتاب پڑھنے سے بھی اکثر اچھی نیند آجایا کرتی ہے۔ یوں اپنی غذا اور معمولات تبدیل کرنے سے آپ کی یہ تکلیف انشاء اللہ دُور ہو جائے گی۔

ہر قسم کے ضدی اور پیچیدہ امراض کے مستقل شافی علاج کے لیے ڈاکٹر ندیم چوہدری سے ان فون نمبرز پر رجوع کریں۔
0333-4450636,0313-4450636

خود پرستی

نسرین اختر نینا

میں حجلۂ عروسی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ شہزاد کا ظاہر جتنا دلکش اور خوبصورت ہے کیا وہ اندر سے بھی اتنا ہی حسین ہوگا۔ میں خود کو انہی لمحوں کے لیے تیار کر رہی تھی جب شہزاد اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ میرے قریب موجود ہوگا۔ وہ لمحہ بھی آ گیا۔ شہزاد گریس فل شخصیت کے ساتھ حجلۂ عروسی میں موجود تھا.....

ایک خود پرست دوشیزہ کی کہانی جس سے تقدیر نے عجب انتقام لیا

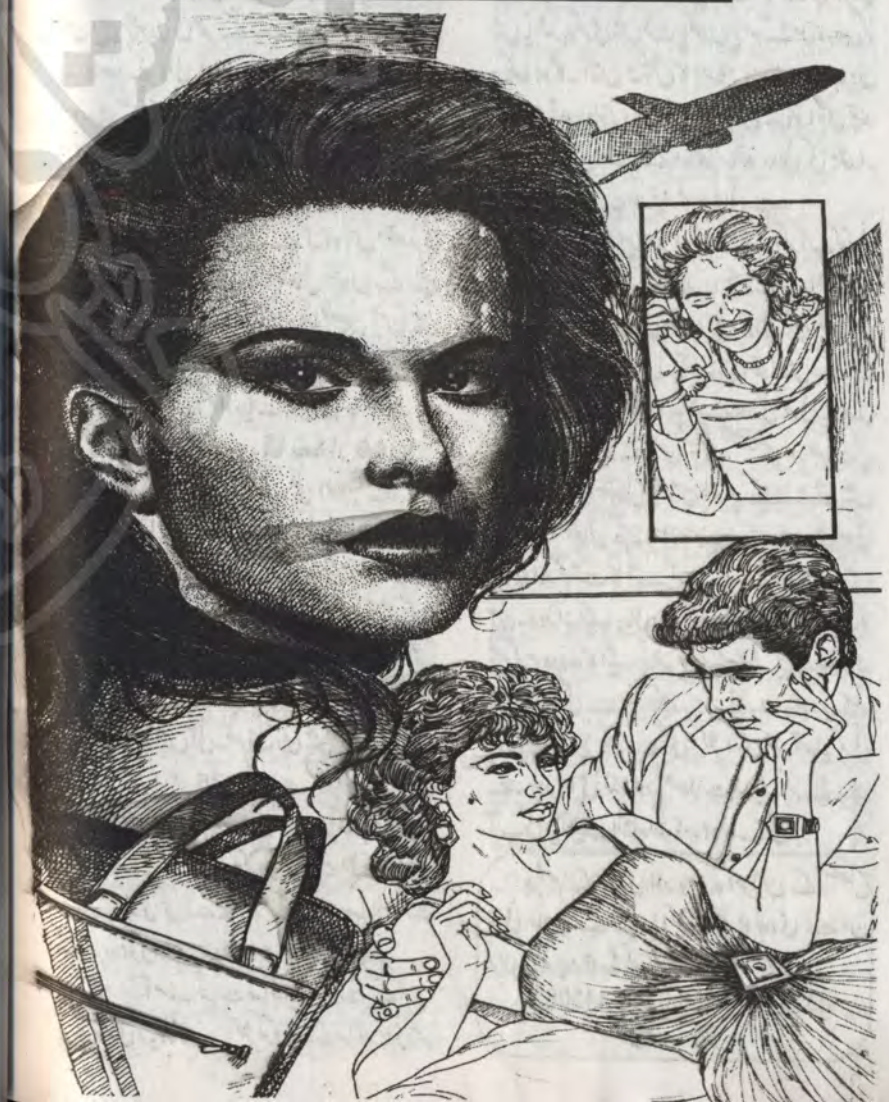

حُسن کسے متاثر نہیں کرتا! خوبصورتی اور دلکشی ہر آنکھ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ حُسن خواہ چیزوں میں ہو یا چہروں پر..... باعث کشش ہوتا ہے۔ میں بھی بچپن سے خوبصورت چیزوں کی دیوانی تھی۔ ڈیڈی نے میرے لیے دنیا جہان کے حسین کھلونے ڈھیر کر رکھے تھے جو ہر لمحہ میرے بیڈ پر بکھرے رہتے۔ اگر کسی کھلونے میں ذرا سا نقص بھی ہو جاتا تو میں اسے اُٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتی اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتی جب تک ڈیڈی سے ضد کر کے اس کے بدلے کوئی خوبصورت چیز نہ لے لیتی۔

مجھ سے بڑے چار بھائی تھے۔ میں ڈیڈی اور امی کی لاڈلی اور اکلوتی تھی۔ سب سے بڑے بھائی عاصم تھے جن کی عمر تیرہ سال تھی۔ میری عمر بمشکل چار سال تھی لیکن میری ضد اور شرارتوں نے پورے گھر کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ ڈیڈی اور امی کی بے پناہ محبت ہی میرے حصے میں نہیں آئی تھی بلکہ مجھے خاندان کے دوسرے افراد بھی بہت پیار کرتے تھے۔ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں نے مجھے ہر شخص کی آنکھوں کا تارا بنا دیا تھا۔ بے جا لاڈ پیار سے میں ضدی ہی نہیں خودسر بھی ہو گئی تھی۔

دُکھ تو مجھے اس لمحے اُٹھانا پڑا جب زندگی نے امی سے بے وفائی کی۔ بچپن میں موت کا فلسفہ کہاں سمجھ میں آتا ہے مگر مجھے اتنا احساس ضرور ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی بات ہو گئی ہے جبھی تو امی کو اتنے سارے لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور امی بالکل خاموش ہیں، نہ بولتی ہیں نہ آنکھیں کھولتی ہیں۔ ڈیڈی بھی مجھ سے پیار نہیں کر رہے تھے، بس بار بار مجھے عاصم بھائی کے ہمراہ بازار بھیج دیتے کہ جاؤ ثنا کو ٹافی دلا دو، آئس کریم کھلا دو، ببل گم خرید دو!

مجھے کوئی بھی امی کے بیڈ کے قریب نہیں جانے دے رہا تھا۔ جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو ڈیڈی نے مجھے گلے لگا کر خوب خوب پیار کیا اور مجھے سینے سے لگا کر محبت سے سمجھانے لگے کہ امی بہت دُور چلی گئی ہیں۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔

ڈیڈی کی باتیں سن کر میں بہت حیران ہوئی، آخر امی کہاں چلی گئی ہیں اور ایسی کون سی جگہ ہے کہ جہاں سے واپس نہیں آیا جاتا اور امی اکیلی کیوں گئی ہیں، مجھے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئیں! امی تو میرے بغیر کہیں بھی نہیں جاتی تھیں، میں نے عاصم بھائی سے پوچھا تو انہوں نے بھی پیار سے سمجھاتے ہوئے بتایا ''ثنا! جو لوگ اللہ میاں کے یہاں چلے جائیں پھر وہ کبھی واپس نہیں آتے۔ ہماری پیاری امی بھی اللہ میاں کے پاس ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہیں۔''

''یعنی کہ امی مر گئی ہیں!'' میں نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا، جس طرح بلی کے ڈیڈی مر گئے ہیں، اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔'' بلی میری دوست تھی۔ اس کے ڈیڈی نہیں تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے یہی بتایا تھا۔

امی کی غیر موجودگی سے مجھے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ میں روز سکول دیر سے پہنچتی، سارے نوکر امی کے نہ ہونے سے بہت بے پروا ہو گئے تھے۔ کھانا بھی وقت پر نہ ملتا، ڈیڈی الگ پریشان رہتے، پورے گھر کا نظام بگڑ چکا تھا۔ ڈیڈی آفس سے زیادہ چھٹی بھی نہیں لے سکتے تھے۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر نوکروں سے تو گھر کا نظام نہیں چل سکتا تھا۔ ڈیڈی کو ملازمت کے سلسلے میں اکثر کئی دن تک گھر سے باہر بھی رہنا پڑتا تھا۔

میں ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ گھر تو دُور کی بات ہے، میں تو دھیان سے اپنا خیال بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان حالات نے مجھے مزید ضدی، خودسر اور

چڑچڑا بنا دیا۔ میں بات بات پر نوکروں سے اُلجھ پڑتی۔ سکول سے بھی میری شکایتیں ڈیڈی تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر ڈیڈی اپنے رشتے کی ایک بہن کو گھر لے آئے تاکہ گھر کی فضا میں کچھ تو سکون اور اطمینان کی کیفیت پیدا ہو مگر مجھے یہ پھوپھی جان ذرا اچھی نہ لگیں۔ وہ ہر وقت کچن میں گھسی کچھ نہ کچھ کھاتی رہتیں۔ سکول کے لیے مجھے تیار کرنے میں وہ ہزار نخرے کرتیں اور کبھی کبھی تو میری ضد پر ایک دو ہاتھ بھی لگا دیتیں۔ میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ اس بار ڈیڈی دورے سے آئیں گے تو میں پھوپھی جان کی شکایت ضرور کروں گی۔

ڈیڈی گھر آئے تو میرے لیے باہر سے پیارے پیارے کھلونے بھی لائے مگر میں پھر بھی ڈیڈی سے ناراض تھی۔ ڈیڈی نے پیار سے مجھے مناتے ہوئے کہا ''بھئی ہماری ثنا بیٹے کو اور کیا چاہیے۔ بولو بیٹی تمہاری ناراضگی کیسے دُور کی جاسکتی ہے؟''

''بس ڈیڈی آپ امی کو لے آیئے۔'' میں نے منہ پھلا لیا۔

''تمہاری امی کو!'' ڈیڈی ایک دم خاموش ہو گئے۔ قریب ہی بیٹھی پھوپھی جان فوراً بولیں ''ہاں میرا بھی یہ خیال ہے شجاعت کہ تم شادی کرلو۔ گھر بغیر عورت کے چلنا بہت مشکل ہے۔''

''لیکن آپا جان یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے نا! نہ جانے آنے والی ان بچوں سے کیسا سلوک کرے اور پھر اس عمر میں اور ان بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ مجھے کون قبول کرے گا!''

''خیر یہ تو نہ کہو کہ کون قبول کرے گا۔'' پھوپھی جان نے جواب دیا۔ ''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو، بس تم راضی ہو جاؤ باقی کام میں سنبھال لوں گی۔''

ڈیڈی نے میری جانب رُخ کرتے ہوئے کہا ''ثنا بیٹے! اگر ہم آپ کے لیے نئی امی لے آئیں تو پھر آپ ان سے پیار کریں گی، ان کا کہنا مانیں گی؟''

ڈیڈی کی بات سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی کہ امی بھی نئی آسکتی ہیں۔ میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور دل ہی دل میں نئی امی کا خاکہ بنانے لگی کہ وہ کیسی ہوں گی۔

پھوپھی جان رشتے کرانے میں ماہر تھیں۔ چند ہی ہفتوں میں انہوں نے ڈیڈی کے لیے لڑکی تلاش کر لی۔ نوعمر پیاری سی فاخرہ کسی بھی طرح ڈیڈی کا جوڑ نہ تھی، اس کا مجھے بعد میں احساس ہوا۔ ڈیڈی، سترہ سالہ فاخرہ سے دوگنی عمر کے تھے۔ نئی امی کا جو تصور میں نے باندھا تھا فاخرہ اس سے بہت مختلف مگر بہت دلکش اور حسین نکلیں۔ میرا دلہن امی کے پاس سے اٹھنے کو ذرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رنگ، خوشبو اور حسن کی دھنک دلہن امی کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

بہت جلد میں دلہن امی کی گرویدہ ہو گئی۔ دلہن امی بھی مجھے بہت چاہتیں۔ ہر لمحے میری ضروریات کا خیال رکھتیں، میری ہر ضد کو پورا کرتیں، عاصم بھائی، کاشف بھیا، جواد اور فیصل بھی امی کو پسند کرنے لگے۔ نئی امی کے آنے سے گھر کی دنیا میں ایک مرتبہ پھر ایک رنگی، مسرت اور سکون کی لہر دوڑ گئی۔ ڈیڈی بہت مطمئن ہو کر گھر سے باہر کی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے۔

امی بہت پیار اور محبت سے ہم بہن بھائیوں کی پرورش کرنے لگیں۔ چند مہینوں میں یہ احساس بھی مٹ گیا کہ یہ ہماری سوتیلی امی ہیں۔ ان کی بے پناہ محبت نے میرے ذہن سے اصل امی کا تصور بھی دھندلا دیا۔ مجھے تو وہ والہانہ چاہتیں۔ ڈیڈی، امی کو مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے دیکھ کر کہتے ''فاخرہ! یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ثناء تمہارے ہی وجود کا حصہ ہو۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ثناء مجھ سے الگ ہے؟'' امی پیار سے میرے بال سنوارتے ہوئے جواب دیتیں۔ ''میری گڑیا تو چاند ہے میرے آنگن کا۔''

امی کے لاڈ پیار نے پھر سے مجھے یہ احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ میں بہت حسین ہوں۔ کانونٹ کے تعلیمی ماحول نے میرے اندر ابتدا ہی سے خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس پر ٹیچرز کی توصیف و تعریف نے غرور کا رنگ بھی چڑھا دیا۔ میں جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی میری حسن پرست طبیعت میرے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ میں پارٹیز میں اپنی امی کے ہمراہ بڑی شان سے شریک ہوتی کیونکہ محفلوں میں اُٹھنے والی ہر نگاہ امی اور میرے چہرے کا طواف کر رہی ہوتی۔ مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا۔

میں نے سینئر کیمبرج پاس کر کے شہر کے سب سے مہنگے کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج میں میری کلاس فیلوز میری ہی طرح امیر کبیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں مگر دولت کی اس چکاچوند میں بھی میرا ستارہ سب سے روشن تھا کیونکہ میرے پاس دولت ہی نہیں حسن بھی تھا۔ کالج پہنچ کر بھی میری عادتیں ذرا نہ بدلی تھیں۔

عاصم بھائی میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھے۔ باقی تینوں بھائی بھی اپنی اپنی تعلیم میں مصروف تھے۔ امی دو ننھے منے بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ مگر ہم بہن بھائیوں سے محبت میں ذرا کمی نہ آئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح ہم سے پیار کرتیں۔ اگرچہ اب ان کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں۔ ننھی کومل اور گڈو انہیں دن رات مصروف رکھتے۔ وہ لوگ جو اس بات سے واقف تھے کہ امی ہماری سوتیلی ماں ہیں وہ ہمارے گھرانے کی محبت دیکھ کر رشک کرتے۔ ڈیڈی بھی اپنی زندگی سے بہت آسودہ اور مطمئن تھے۔

میرے نازنخرے اور شرارتیں صرف گھر تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ کالج میں بھی ہمارا گروپ جو رخسانہ، امبر، فریحہ اور مجھ پر مشتمل تھا طوفانی گینگ کے نام سے مشہور تھا۔ ہماری شرارتوں کا ہدف زیادہ تر کالج کے چھوٹے ملازمین بنتے۔ کم حیثیت اوسط درجے کے لوگوں سے خدا جانے کیوں مجھے بچپن سے ہی عداوت تھی۔ بڑے ہونے پر میری یہ عادت اور بھی پختہ ہو گئی تھی۔

بخشو بابا کالج کا بوڑھا گیٹ کیپر تھا جو مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ اس نے ایک دن میرے لباس پر ٹوکتے ہوئے کہا تھا ''بیٹی! اچھی بیٹیاں اس طرح کے کپڑے نہیں پہنتیں۔ بے شک قیمتی ہوں مگر عُریاں نہ ہوں۔''

ہونہہ! میں نے نفرت سے ناک سکیڑی۔ ''دو ٹکے کا ملازم مجھے مشورے دے رہا ہے۔''

اس دن سے میرے دل میں بخشو کے لیے ایسی نفرت بیٹھی تھی کہ میں کوئی بھی موقع اسے ذلیل کرنے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اس دن کالج میں ایک فنکشن کے سلسلے میں بخشو بابا کی ڈیوٹی ہال میں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے درمیان لگی تھی۔ وہ پانی کا گلاس اور جگ تھامے میری قطار کے قریب سے گزرا تو میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے چپکے سے اپنی ٹانگ چلائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ لڑکھڑایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا مگر سنبھلتے سنبھلتے بھی پانی گلاس سے چھلک کر اگلی قطار میں بیٹھے مہمان خصوصی کے کپڑوں پر جا گرا۔ مہمان خصوصی شاید کچھ زیادہ ہی رحم دل واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے بخشو کی ضعیفی کے پیش نظر اس گستاخی کو نظرانداز کر دیا مگر تمام ٹیچرز کے چہروں پر ناگواری کی لکیریں صاف محسوس ہو رہی تھیں لیکن کیا کیا جاتا کہ بخشو سے کالج کی پرنسپل مسز بھٹی کی خصوصی سلام

دعا تھی۔ وہ اسی کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھا، لہٰذا میرا یہ وار بھی رائیگاں گیا جس کا مجھے بڑا ملال تھا اور بخشو اپنی ملازمت پر برقرار رہا۔

میرے پاس دولت اور حسن ہی نہیں، ذہانت کا خزانہ بھی تھا۔ میری تعلیمی رپورٹ ہمیشہ اچھی رہی تھی۔ کالج آ کر گو کہ میری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی مگر اس ایک خیال نے ہمیشہ کتابوں سے میرا تعلق برقرار رکھا کہ کوئی اور یہ میدان نہ مار لے جو مجھے کسی بھی صورت گوارا نہ تھا۔ میں نے کسی کو آج تک یہ موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میری موجودگی میں کسی اور کا چراغ جل سکے۔

کالج میں اُس روز مڈ ٹرم ٹیسٹ کا رزلٹ نکل رہا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح مطمئن تھی کہ فرسٹ کلاس میری ہی آنی ہے۔ رخسانہ یا امبر، فریحہ نے مجھ سے زبردست ٹریٹ لینے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ خوشی نے میرے اندر بھی پھول کھلا رکھے تھے کیونکہ کل ہی ڈیڈی نے کہا تھا کہ اس بار میری کامیابی پر وہ مجھے سپورٹس کار تحفے میں دیں گے۔

میڈم شہاب آج رزلٹ سنانے سے پہلے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے موڈ میں تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں ''ڈیئر گرلز مجھے خوشی ہے کہ اس کلاس کی ہر لڑکی ٹیلنٹڈ ہے لیکن سب سے زیادہ خوشی اس لمحے ہوتی ہے جب کوئی مسائل کے سمندر میں ڈوبا ہو، وسائل کا سہارا نہ ہو اور وہ علم کے موتی چن لائے۔ ہماری کلاس کی ایک ایسی ہی ہونہار طالبہ حنا جبیں ہیں۔ ان کا داخلہ بعض مجبوریوں کے سبب بہت دیر سے ہوا لیکن ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے چند ہی ماہ میں اپنے داخلے کے حق کو اپنی بے پناہ ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پر ثابت کر دکھایا۔''

مجھے میڈم شہاب کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''مڈ ٹرم امتحان میں فرسٹ پوزیشن کی حقدار قرار پائی ہیں حنا جبیں!'' تالیوں کی گونج میں دبلے پتلے جسم کی ایک عام سی لڑکی سٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''ثنا! یہ کیا ہو گیا؟ اس لڑکی نے کب داخلہ لیا ہمیں تو علم ہی نہ ہو سکا۔'' حیرت میں ڈوبی امبر کی آواز اُبھری۔

''حلیے سے تو ذرا نہیں لگ رہی کہ یہ لڑکی اتنا مہنگا کالج افورڈ کر سکتی ہے۔'' رخسانہ نے رائے دی۔

''ضرور کوئی اونچی سفارش ہو گی۔'' فریحہ کا خیال تھا۔

مگر میری اپنی حالت ان سب سے مختلف تھی۔ توہین اور ذلت کے خودساختہ احساس نے میرے اندر آگ لگا رکھی تھی حالانکہ دوسری پوزیشن میری تھی لیکن مجھے اس کی ذرا پرواہ نہ تھی۔ احساس تھا تو صرف اتنا کہ ایک معمولی سی لڑکی نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پر مجھے زیر کر دیا تھا۔ میڈم شہاب نے میری تعریف میں بھی کم کلمات نہیں کہے تھے لیکن آج مجھے توصیف و تعریف کے لفظ بھی کھوکھلے لگ رہے تھے۔

''مس ثنا! کامیابی مبارک ہو۔'' حنا نے میرے نزدیک آتے ہوئے شستہ انگریزی میں کامیابی کی مبارکباد دی تو میرا حلق اور کڑوا ہو گیا۔ گندمی رنگت اور معمولی نقوش کی مالک یہ لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ ذہین ثابت ہو رہی تھی۔ میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک کر اپنی دوستوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

''ثنا آخر پتہ تو چلے کہ یہ محترمہ ہیں کون؟'' امبر نے تجسس سے پوچھا۔

''بھئی ہو گی کوئی، چھوڑو اب اس قصے کو۔'' فریحہ نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا کیونکہ حنا کی وجہ سے میرا موڈ آف ہو چکا تھا اور تمام دوستوں کے ساتھ ٹریٹ کا پروگرام الگ ہوا بدمزہ!

یہ میرا حنا سے پہلا ٹکراؤ تھا، میں بھی امبر کی

طرح حنا کے متعلق کچھ جاننا چاہتی تھی کیونکہ اس رزلٹ کے بعد تو میری نظریں ہر دم حنا پر ٹکی رہتی تھیں جو زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی۔ شاید اس کا کوئی قریبی دوست بھی نہ تھا کیونکہ اس کالج میں اس کے طبقے کی لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ہمارے کالج میں کسی خاص یونیفارم کی قید نہ تھی۔ ہر لڑکی اپنی مرضی، پسند اور امارت کے مطابق لباس پہن کر آتی مگر حنا نے اپنے سفید کپڑوں کو مستقل یونیفارم کی شکل دے رکھی تھی۔

امبر نے حنا کے متعلق معلومات حاصل کر کے ہی دم لیا جنہیں سُن کر مجھے حیرت ہوئی مگر اس حیرت نے نفرت کی آگ کو اور بھڑکایا جو شروع دن سے ہی میرے دل میں بخشو کے لیے پل رہی تھی۔

حنا بخشو کی بیوہ بہن کی اکلوتی بیٹی تھی جو پہلے ملتان میں ایک گورنمنٹ کالج میں پڑھتی تھی مگر ماں کے اچانک انتقال کی وجہ سے اسے لاہور اپنے ماموں بخشو کے پاس آنا پڑا کیونکہ اب وہ تنہا وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ حنا کا داخلہ بھی مسز بھٹی کی خصوصی دلچسپی کی بنیاد پر ہوا تھا۔ حنا کے متعلق اتنا کچھ جان کر بھی میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے بجائے نفرت کا جذبہ ہی پیدا ہوا۔ مجھے حنا سے بغیر کسی وجہ کے پرخاش رہنے لگی۔

گھر بھر میں ایک میرا ہی مزاج شاہانہ تھا ورنہ ڈیڈی، امی، بھائی وغیرہ سبھی ٹھنڈے مزاج اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ عاصم بھائی کے دوستوں میں ہر طبقے کے دوست شامل تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے گھر کے نوکروں سے بھی دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ اس کے برعکس میری موجودگی میں سارے نوکر سہمے رہتے کیونکہ میں پاؤں کی خاک سر تک لانے کی قائل نہ تھی۔

امی مجھے لاکھ سمجھاتیں ''ثنا بیٹی غریبوں کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آتے۔ روپیہ پیسہ شکل و صورت سب اللہ کی دین ہے۔ تم اپنی مرضی سے تو اس گھر میں پیدا نہیں ہوئیں نا! قدرت نے ہر شخص کو زندہ رہنے اور اپنی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا ہے۔ پھر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی کو اپنے برابر آنے سے روکو۔'' مگر مجھ پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا۔ نہ جانے غرور اور تکبر کا یہ زہر میرے اندر کہاں سے اُتر آیا تھا۔

کالج میں حنا کا وجود مجھے مسلسل عذاب میں مبتلا رکھتا۔ کیونکہ اب وہ کالج کی ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ تمام ٹیچرز اس کی قابلیت کے گُن گاتیں تو میرے اندر حسد کے کانٹے مجھے بے چین کر دیتے۔

ہمارے فائنل ائیر کے امتحان قریب تھے۔ میں اپنی پوری توجہ پڑھائی پر صرف کر رہی تھی لیکن انہی دنوں گھر میں بھی ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ عاصم بھائی ایم بی بی ایس کے بعد مکمل ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ڈیڈی چاہتے تھے کہ ان کی جلد سے جلد شادی کر دیں تاکہ پھر وہ بعد میں اپنی بیگم کے ہمراہ ایف آر سی ایس کے لیے باہر چلے جائیں۔

امی اور ڈیڈی کی نظر میں پھوپھی جان کی نند کی لڑکی غزالہ تھی جو اکثر ہمارے گھر آ کر رہا کرتی تھی۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ غزالہ بہت حسین نہ سہی مگر جاذب نظر تھی لیکن میری حُسن پرست طبیعت کو غزالہ میں کوئی خوبی کوئی حُسن نظر نہ آتا۔ زیورات کی چکاچوند اور میک اَپ کی دھنک نے میرے اندر سے سادگی اور فطری حُسن کی پہچان مٹا دی تھی۔ میں نے امی اور ڈیڈی کو قائل کر ہی لیا کہ عاصم بھائی کے لیے غزالہ سے اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں حالانکہ مجھے اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ غزالہ غیر محسوس طریقے سے نہ صرف عاصم بھائی کو

پسند کرتی ہے بلکہ انہیں بہت چاہتی ہے۔ دل میں محبت کے رنگ ہوں تو آنکھوں کی کھڑکی سے عکس باہر نظر آ جاتا ہے اور میں یہ عکس غزالہ کی نگاہوں میں بار بار دیکھ چکی تھی لیکن عاصم بھائی تک ابھی محبت کی مہک نہیں پہنچی تھی اس لیے میرا کام آسان تھا۔ میں نے عاصم بھائی کو پٹی پڑھائی کہ وہ ڈاکٹر ہیں ان کی بیگم کو بھی ڈاکٹر ہونا چاہیے اور بہت جلد میں نے اپنی ایک دوست کی بہن کا پروپوزل پیش کر دیا جو ابھی ایم بی بی ایس کے تھرڈ ائیر میں تھی۔ شائلہ اپنے نام کی طرح ہی حسین تھی، سرو قد اور موہنی صورت پر گہری سیاہی مائل آنکھیں بہت دلکش لگتیں۔

بہت جلد میری پسند سب گھر والوں کی پسند بن گئی اور میں شائلہ کو بھابھی بنا کر گھر لے آئی۔ عاصم بھائی کی شادی کے ہنگاموں میں کچھ اس طرح مگن ہوئی کہ کئی ہفتے کالج نہ جا سکی پھر کچھ ہفتوں سے میں یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اب میرا پڑھائی میں جی نہیں لگتا۔ شاید اس احساس نے کہ پہلی پوزیشن تو حنا کی آتی ہے، میرا دل کتابوں سے اچاٹ کر دیا تھا۔ میری سب سہیلیاں بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھیں مگر میں بنا کسی مقصد کے کالج میں گھوم پھر کر اپنا وقت گزارتی رہتی۔ زیادہ بور ہوتی تو کیفے میں جا بیٹھتی۔

اس دن بھی میں کیفے میں بیٹھی چائے کے سپ لے رہی تھی کہ حنا کو اپنی میز کی طرف بڑھتے دیکھ کر ناگواری سے سوچنے لگی کہ یہ یہاں کیوں آئی ہے۔

''ہیلو ثنا!'' اس نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ہائے.....'' میں نے بے دلی سے جواب دیا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''ثنا بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟'' وہ بھی ایک ڈھیٹ لڑکی تھی۔

''پلیز، سٹ ڈاؤن۔''

''ثنا تم مجھ سے کیوں اتنا خائف رہتی ہو؟ میرا مقصد تمہیں نیچا دکھانا یا زیر کرنا نہیں ہے۔'' حنا نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''ثنا ہم اچھے دوست بھی تو بن سکتے ہیں۔''

''سوری مس حنا جبیں صاحبہ! میں اپنے سٹیٹس سے نیچے اُتر کر دوستی کرنے کی قائل نہیں۔'' میں نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔

میری بات سُن کر حنا کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کمال ضبط سے مسکراتے ہوئے کہا ''مجھے اندازہ ہے مگر نہیں معلوم کیوں تم پھر بھی مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔''

حنا کی سچائی کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سچ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال نے میرا سر فخر سے اونچا کر دیا کہ خدا نے مجھے اتنی پیاری صورت سے نوازا تھا کہ دشمن بھی دوستی کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ حنا دوستی کے جذبات لے کر آئی تھی اور نامراد لوٹ گئی۔

میں سخت کوفت کے عالم میں کیفے سے باہر آئی تو یک بیک ٹھٹک کر رہ گئی۔ ایک دم ہی باہر کا موسم اچھا لگنے لگا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بلاشبہ انتہائی حسین تھا۔ اونچا، دراز قامت، کھلتا رنگ، گھونگریالے بال، بہترین سوٹ میں ملبوس تھوڑی دُور کھڑا وہ میڈم شہاب سے بات کر رہا تھا۔

''ہیلو.....ہیلو محترمہ، کہاں گم ہو۔'' اچانک امبر کی آمد نے میری محویت کو توڑ دیا۔ ''خدا خیر کرے، یہ کس پر بجلیاں گرائی جا رہی ہیں۔'' اس نے میری نظروں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑائیں۔

''معلوم بھی ہے یہ صاحب کون ہیں؟''

''کون ہیں؟.....'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے

میں پوچھا۔

''ثنا جی یہ سر ہمایوں ہیں، ان کا نیا تقرر ہوا ہے کالج میں۔'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی امبر معلومات حاصل کرنے میں بازی لے گئی تھی۔ ''بندے کی بڑی ڈیسنٹ شخصیت ہے۔'' امبر نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے متاثر کن لہجے میں رائے دی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ''شکر ہے محترمہ کے چہرے پر پھول تو کھلے ورنہ ہم تو ترس گئے تھے اس جلترنگ کو۔'' امبر شوخی سے بولی۔

اس رات میں بیڈ پر لیٹی تو اکیلی نہ تھی۔ ہمایوں کے تصور نے میری آنکھوں میں خواب جگا رکھے تھے۔ رہ رہ کر میری نگاہوں میں وہ پُرکشش سراپا گھوم جاتا۔ میرے ذہن نے جس آئیڈیل مرد کا سراپا تراشا تھا ہمایوں اس کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ خوبصورت، سمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، آج میرے دل میں بڑی عجیب سی خواہش سر اٹھانے لگی تھی۔ شاید کسی کو چاہے جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہمایوں کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی جس نے مجھ جیسی ہٹیلی، ضدی اور بااعتماد لڑکی کے ظاہری خول کو توڑ کر محبت کی نرمی کو دل میں اُتار دیا تھا۔ میں جو اعلیٰ تعلیم کے حصول اور پھر شاندار کیریئر کے خواب دیکھتی تھی، اس ایک چہرے کو دیکھ کر اب سوچوں کا راستہ منزل سے کٹنے لگا تھا۔ اگر زندگی کے خوابوں میں رنگ بھرنے کا مرکزی کردار ایک مرد ہی ٹھہرا تو پھر موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپانے کا کیا فائدہ؟ تو کیوں نہ اس کا ہاتھ تھام لیا جائے جس کا نام دل کے کورے کاغذ پر پہلی بار لکھا گیا ہو۔ معلوم نہیں میں کب تک انہی خیالوں میں گم نیند کی آغوش میں جا سوئی۔

دوسری صبح میں کالج دیر سے پہنچی۔ حسب توقع امبر اور فریحہ میری منتظر تھیں۔

''ہیلو ڈیئر کہو رات کیسی گزری؟'' امبر نے شوخی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے امبر کو گھورا۔

''میرا مطلب ہے امتحان کی تیاری کتنی کی؟'' امبر نے میرے غصے سے ڈر کر جلدی سے بات بنائی۔

''ثنا آج تم کچھ بدلی بدلی نہیں لگ رہی؟'' فریحہ نے کھوجتی نظروں سے مجھے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' میں نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا ''سنا ہے آج سر ہمایوں کلاس لیں گے، میڈم شہاب کی جگہ!'' امبر نے ذومعنی انداز سے مجھے گھورا۔

ہمایوں کے نام پر میں اپنے تیزی سے دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو شمار کرتے ہوئے کلاس میں چلی آئی۔ وہ اپنی شخصیت کی تمام تر سحر انگیزی کے ساتھ ڈائس پر موجود تھا۔ مجھے بھی اپنی شخصیت پر بڑا مان تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میری پُرکشش ہستی صنف مخالف کو اپنی جانب متوجہ نہ کرے لیکن ہمایوں نے ایک بار بھی تو مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ ہمایوں کی شرافت تھی، تغافل تھا یا کچھ اور! میں فوری طور پر کچھ نہ سمجھ سکی مگر دل میں یہ تمنا ضرور مچل رہی تھی کہ ہمایوں میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ شاید ہمایوں کے نزدیک میری حیثیت ایک معمولی طالبہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ دُکھ تو یہ تھا کہ اس نے ایک طالبہ کی حیثیت سے بھی میری صلاحیت اور ذہانت کو نہ سراہا تھا۔ میری خاموشی امبر نے محسوس کر لی تھی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کس آگ میں جل رہی ہوں مگر وہ بھی خاموش تھی۔ کہنے کو اس کے پاس بھی کچھ نہ تھا ''امبر! آج رخسانہ نہیں آئی؟'' میں نے خاموشی کی اس کیفیت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''آج کل لندن سے رخسانہ کی ممانی آئی ہوئی

ہیں اور ہاں! یہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گئی کہ سر ہمایوں رشتے میں رخسانہ کے کزن لگتے ہیں۔'' میں جس ذکر سے بچنا چاہ رہی تھی بات گھوم پھرا اسی کے ذکر پر ختم ہو جاتی۔

وہ رات بہت بے سکون و بے قراری کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ دل کی بے قراری جب حد سے بڑھی تو میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شاید میں بہت بدل گئی تھی۔ خودسر، ضدی ثنا تو نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر میں خود چونک پڑی۔ یہ آنکھیں میری تو نہ تھیں، محبت کی جوت جگاتی آنکھیں دیکھ کر میری نگاہوں میں غزالہ کی محبت لٹاتی آنکھیں گھوم گئیں۔ عاصم بھائی سے اس کی بے پناہ چاہت ہی نے تو اسے وہ روپ بخشا تھا جسے میں نہ پہچان سکی تھی۔ آج غزالہ کی ان نگاہوں کا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ واقعی محبت کی ناکامی کو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود اس دریا سے پیاسا واپس آیا ہو۔ میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ مجھ میں مزید آئینہ دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ میرے خیال و خواب میں تو ایک ہی چہرہ غالب تھا۔ ہمایوں کا چہرہ!

کئی بار جی چاہتا کہ میں خود اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں لیکن انا اور خودداری کی شکست مجھے پسند نہ تھی۔ میں چاہتی تھی کہ غرور حسن بھی رہ جائے اور دل کی بستی بھی برباد نہ ہو۔ کبھی خیال آتا کہ پیاسا کنویں کے قریب جاتا ہے لیکن پھر سوچتی کہ ضروری تو نہیں تشنہ لب ہی دریا کے کنارے پہنچے۔ اتفاقات زمانہ سے یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ کبھی دریاؤں کے پانی ازخود ہی ساحلوں کا گھیراؤ توڑ کر تشنہ لبوں کی لب بوسی کو پہنچ جائیں۔ کاش ایسا ہی ہو جائے۔

پھر امتحان شروع ہو گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے خود کو امتحان میں مصروف کر لیا۔ یہ فائنل ایئر کے امتحان تھے پھر تو کالج لائف کا خاتمہ تھا۔ کبھی سوچتی کہ اگر دل کی یہ مراد پوری نہ ہوئی تو کیا کروں گی مگر پھر خیال آتا کہ جذبۂ صادق ہو تو منزل مل جایا کرتی ہے۔ میں جس دن آخری پیپر دے کر گھر لوٹی، گھر میں غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ امی کے ذریعے معلوم ہوا کہ آج گھر میں خاص مہمانوں کی آمد ہے۔

''خاص مہمان!..... کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ڈیئر ثنا تمہارے ڈیڈی تمہیں اس گھر سے رخصت کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔'' امی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ یہ اچانک نئی افتاد تھی جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہ تو مجھے علم تھا کہ ڈیڈی کی کئی مہینوں سے طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ وہ کئی دن سے باتوں باتوں میں مجھے ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار کر رہے تھے لیکن مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ ڈیڈی اس قدر جلد اتنا بڑا فیصلہ کر کے یہ قدم اٹھا لیں گے۔ آج جو لوگ آ رہے تھے وہ ڈیڈی کے دوست کی فیملی تھی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا شہزاد۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا جس کے لیے انہوں نے میرا پیغام بھیجا تھا مگر میرے تصور میں تو ہمایوں کا سراپا بسا ہوا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ڈیڈی کو اس فیصلے سے بہرحال باز رکھوں گی۔ اگر ہمایوں کی جانب سے پیش رفت ہوئی ہوتی تو ڈیڈی کبھی انکار نہ کرتے کیونکہ انہیں میری پسند اور خوشی دل و جان سے عزیز تھی۔

شہزاد کی فیملی بہت تعلیم یافتہ اور ماڈرن تھی۔ شہزاد کی تینوں بہنیں انتہائی حسین اور پرکشش تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی مگر ہمایوں کے تصور نے میرے اندر بہت کچھ بدل دیا تھا۔ غرور اور تکبر کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

شہزاد کی امی نے پیار سے مجھے گلے لگاتے

ہوئے کہا ''ہمارا بیٹا خوش نصیب ہے کہ اسے چاندسی دلہن ملے گی۔'' یہ سن کر مجھے الجھن ہونے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ڈیڈی اس رشتے پر اپنی رضامندی نہ دے دیں مگر مجھے یقین تھا کہ ڈیڈی کبھی ایسا نہیں کریں گے کیونکہ وہ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ امی نے جب مجھے شہزاد کی تصویر دکھانی چاہی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ ''امی مجھے نہیں کرنا شادی! آپ ڈیڈی سے کہہ دیں۔''

''ڈیئر تم ایک بار تصویر دیکھ تو لو شہزاد بڑی گریس فل شخصیت کا مالک ہے۔ پھر وہ لوگ اتنی محبت اور چاہت سے تمہیں مانگ رہے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی ان کی فیملی سے اچھی طرح واقف ہیں۔'' امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا مگر میرا ایک ہی جواب تھا۔ ''امی ابھی نہیں!''

''ثنا کوئی اور بات ہے تو مجھے بتاؤ۔'' انہوں نے پیار سے میرے بال سنوارے تو مجھے بے ساختہ رونا آ گیا۔ میں امی کی گود میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو دی۔ نہ جانے کیوں میں اتنی کمزور دل ہو گئی تھی کہ پیار کے دو بول سن کر آنکھیں بھر آتیں۔ امی ضد کر کے مجھ سے پوچھتی رہیں لیکن میں انہیں کیا بتاتی۔ کس طرح اس شخص کا نام لیتی جس نے میرا نام تک پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔ محبت کی اس آگ میں تو میں تنہا جل رہی تھی۔ امی شہزاد کی تصویر میرے بیڈ پر چھوڑ گئیں کہ میں اکیلے میں دیکھ کر خوب سوچ سمجھ کر ڈیڈی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں۔ تصویر بلا کی حسین تھی مگر جب دل کے فریب میں دوسری ہی تصویر آویزاں ہو تو کوئی مورت نہیں بھاتی۔ میں عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف میری یکطرفہ محبت تھی تو دوسری جانب امی اور ڈیڈی کی پسند شہزاد۔ جو بلاشبہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ لوگ بے حد محبت اور چاہت سے اس رشتے کے تمنائی تھے۔

''یار تم نے امتحان کے بعد کیا بن باس لے لیا ہے؟'' امبر کو اچانک گھر میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھوں میں حیرانی لئے اس سے آنے کا سبب پوچھا کہ وہ کب اور کیسے آئی تو وہ فوراً ہی شروع ہو گئی۔ ''بس ابھی آئی تو آنٹی نے بتایا کہ محترمہ کئی دن سے کمرے میں بند نہ جانے کون سی گتھیاں سلجھاتی رہتی ہیں۔''

''کچھ نہیں بس یونہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' میں نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

''ثنا تُو قبول کیوں نہیں کر لیتی کہ تجھے محبت ہو گئی ہے۔'' امبر نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''اور وہ بھی ہمایوں سے۔''

''امبر مجھے خود یقین نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرا مزاج، میری طبیعت تو ایسی نہ تھی۔'' میں نے بے بسی سے امبر کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں ہمدردی لئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ثنا اگر تُو برا نہ مانے تو ایک بات کہوں؟''

''وہ کیا؟''

''ثنا ہمایوں کا خیال دل سے نکال دے۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔'' امبر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا ''وہ بہت پراؤڈ شخص ہے۔ اس کے نزدیک حُسن کوئی معنی نہیں رکھتا۔ رہی دل کی بات تو اس معاشرے میں مرد کی تو یکطرفہ محبت بھی وزن رکھتی ہے مگر لڑکی کی بے تحاشا دولت بھی اس وقت خاک کا ڈھیر ہو جاتی ہے جب وہ اس سے اپنے آئیڈیل مرد کی رفاقت نہ خرید سکے۔'' امبر کی باتیں درست تھیں۔ یہ میرا پاگل پن تھا جس نے میری شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا ورنہ میں اتنی گری پڑی نہ تھی جو یوں محبت کے لیے اپنا آپ جلا رہی ہوتی یا شاید سارا قصور ہی اس محبت کا ہے۔

اس دن ڈیڈی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ''ڈیڈی آپ بیٹھیں نا پلیز۔'' مجھے اپنے کمرے کی بے ترتیبی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ ڈیڈی کیا سوچیں گے کہ ثنا اتنی لاپروا ہو گئی ہے کہ اسے اپنے کمرے کی سیٹنگ کا بھی ہوش نہیں!

''بیٹی کیا سوچنے لگیں؟ ہماری ثنا تو بہت ہنستی کھیلتی مسکراتی شرارتی گڑیا ہوا کرتی تھی، یہ تم نے سوچنے کی بیماری کب سے لگا لی؟'' ڈیڈی بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ میں جانتی تھی کہ ڈیڈی کس مقصد کے لیے میرے پاس آئے ہیں کیونکہ کل شہزاد کی امی حتمی جواب لینے کے لیے آ رہی تھیں۔

''بیٹی ثنا تم جانتی ہو کہ میں نے تمہاری پرورش کس طرح کی ہے۔ کبھی تمہاری کسی خواہش کو نہیں ٹھکرایا۔ میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ میری بیٹی خوش رہے حالانکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ میں نے لاڈ پیار میں تمہیں بگاڑ دیا ہے، خودسر بنا دیا ہے لیکن بیٹی تمہاری صورت میں مجھے ہمیشہ اس تصویر کا عکس نظر آتا ہے جو قدرت نے ہم سے چھین لی تھی مگر تمہاری صورت میں وہ ہمیشہ زندہ رہی۔'' ڈیڈی آج عرصے بعد میری حقیقی امی کو یاد کر رہے تھے۔ بھولی بسری ممتا کی مہک نے مجھے بھی امی کی یاد دلا دی۔ میری آنکھیں بھر آئیں تو ڈیڈی نے مجھے سینے سے لگا لیا ''بیٹی تم کچھ خیال نہ کرو میں کل شہزاد کی فیملی کو انکار کر دُوں گا۔'' ڈیڈی سمجھ رہے تھے کہ میں اس رشتے پر ناخوش ہوں۔

''ڈیڈی یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے نظریں نیچی کئے جواب دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ڈیڈی کو مایوس نہیں کروں گی۔ شہزاد ڈیڈی کی پسند ہے۔ وہ لوگ بھی چاہت سے اس رشتے کے حق میں ہیں۔ مجھے میری محبت تو نہ مل سکے گی میں کسی کی محبت بن کر شاید ان نفرتوں کا حساب چکا سکوں جو نادانی میں میں نے اپنے غرور حسن کے نشے میں ڈوب کر کی تھیں۔ ڈیڈی میری رضامندی سے مطمئن ہو گئے۔ شہزاد کی امی میری انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنا گئیں۔ شادی کی تاریخ بھی جلد ہی مقرر ہو گئی۔ امی زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ عاصم بھائی بھی لندن سے شائلہ بھابھی کے ساتھ ایف آر سی ایس کر کے آ گئے تھے۔ ڈیڈی بہت خوش تھے۔ ڈیڈی کو خوش دیکھ کر مجھے اپنے اندر ٹھنڈک سی اُترتی محسوس ہوتی۔ ہمایوں کے نام کا ورق میں نے کتاب دل سے اُکھاڑ پھینکا تھا۔ یہ مرحلہ مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ میں خود کو ذہنی طور پر شہزاد کے لیے تیار کر رہی تھی۔

جس لمحے میرے جسم پر سہاگ کا جوڑا سجا، مجھے بے طرح رونا آ گیا۔ شاید تقدیر اسے کہتے ہیں۔ کچھ فیصلے غیر اختیاری انداز سے ہو جاتے ہیں جن میں انسان کی رضا کو دخل بھی نہیں ہوتا اور اسی کو نوشتۂ تقدیر کہتے ہیں جنہیں نہ سہا جا سکتا ہے نہ ہی اس سے چھٹکارا ممکن ہے۔

حجلہ عروسی میں بیٹھی مدھم مدھم سبز روشنی کے غبار میں میں سوچ رہی تھی کہ شہزاد کا ظاہر جتنا دلکش اور خوبصورت ہے کیا وہ اندر سے بھی اتنا ہی حسین ہو گا۔ میں خود کو انہی لمحوں کے لیے تیار کر رہی تھی جب شہزاد اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ میرے قریب موجود ہو گا۔ وہ لمحہ بھی آ گیا۔ شہزاد گریس فل شخصیت کے ساتھ حجلہ عروسی میں موجود تھا لیکن بغیر گھونگٹ اٹھائے وہ کہہ رہا تھا ''ہمارے راستے تو بہت مختلف ہیں ثنا، جانے منزل کیسے ایک ہو گی! تمہاری خواہش دراصل ممی پاپا اور بہنوں کی خواہش تھی، میں مجبور تھا۔ انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تم مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنے دل کے ساتھ بھی زبردستی نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ لینا کہ یہ بھی ایک حادثہ ہے

تمہاری زندگی کے ساتھ۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔"
شہزاد خاموش ہو گیا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس بیڈروم کے ہر ذرے کو زبان مل گئی ہو اور وہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ قہقہے لگا رہے ہوں۔ میرا حسین چہرہ دیکھے بغیر شہزاد نے میرے منہ پر تھوک دیا تھا۔ اتنی توہین، اتنی تذلیل؟ آہ..... میری خوشیوں کو پہلی رات کو ہی آگ لگ گئی۔ میں تنہا رہ گئی، نہ کوئی ہلچل نہ گرم جوشی نہ محبت بھرے میٹھے میٹھے بول۔ بس چاروں طرف سناٹا تھا۔ اوہ خدایا! یہ کیسا موڑ ہے زندگی کا..... کڑا اور تھکا دینے والا! مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پیاس کے صحرا میں تنہا کھڑی ہوں۔ میری یہ رات آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گئی تھی۔

شہزاد نے دل کا سودا تو پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہ اپنی پھوپھی کی بیٹی معصومہ سے پیار کرتا تھا۔ شہزاد کی امی اس رشتے کے قطعی حق میں نہ تھیں۔ معصومہ کا گھرانا اگر مالی حیثیت سے ان کے برابر ہوتا تو شاید شہزاد کے پاپا اپنی بہن کی بیٹی کو بہو بنا کر یہ احسان عظیم کر دیتے مگر محبت کے گنجینے تو شاید افلاس کی زمین سے پھوٹتے ہیں۔ معصومہ کا گھرانہ انتہائی غریب تھا۔ شہزاد اپنی محبت کو حاصل نہ کر سکا مگر اس نے پہلی ہی رات میرے منہ پر ذلت کا طمانچہ مار کر محبت کا بھرم رکھ لیا۔ میں بے تحاشا حُسن اور دولت کے بل پر بھی شہزاد کو نہ خرید سکی۔

دنیا کی نظروں میں، میں مسز شہزاد بن گئی لیکن میرا دامن شہزاد کی محبت سے خالی تھا۔ فضول سوچوں سے بچنے کے لیے میں نے گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ شہزاد کا ہر کام میں اپنے ہاتھوں سے کرتی کہ شاید اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے مگر معلوم نہیں وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ میری دن رات کی خدمت اس میں نرمی کی بجائے اور سختی پیدا کر دیتی۔ وہ معمولی باتوں کو بنیاد بنا کر مجھ سے بُری طرح جھگڑنے لگتا۔ شہزاد اپنی محبت کے حصول میں ناکامی کا ذمہ دار مجھے قرار دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے والدین میری غیر معمولی خوبصورتی اور دولت کے لالچ میں آ گئے تھے۔ اس کے برعکس شہزاد کی بہنیں اور امی میرا خیال رکھتیں۔ انہیں شہزاد کی زیادتیوں کا احساس تھا۔

جب بھی ڈیڈی مجھ سے ملنے آتے تو میری غیر معمولی خاموشی کو دیکھ کر پوچھتے "ثنا بیٹی تم خوش تو ہو نا؟"

"ہاں ڈیڈی، بہت خوش ہوں، بہت..... زیادہ۔"
آنسوؤں کا پھندا میرے حلق میں اٹکنے لگتا تو میں رُخ پھیر کر کھڑی ہو جاتی۔ مبادا کہیں ڈیڈی میری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ لیں۔ وہ لاڈلی بیٹی جسے انہوں نے انتہائی ناز و نعم سے پالا تھا دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں ڈھیر کی تھی، محروم بھی ہوئی ہے تو زندگی کے کس موڑ پر! محبت اگر پیسے سے خریدی جاتی تو ڈیڈی اپنی ساری دولت دے کر میرے لیے خوشیاں خرید لیتے۔ بعض اوقات سب کچھ اختیار میں ہوتے ہوئے بھی آدمی کتنا بے اختیار ہوتا ہے۔

وقت کے پاؤں میں خوشی کی پائل بجتی ہو یا غم کے گھنگرو اس کا سفر ہر صورت میں جاری رہتا ہے۔ شہزاد سے میری شادی کو دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ یہ وقت کتنی اذیت اور مصیبت میں گزرا، اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتی تھی۔ جہاں روح کو سکون اور دل کو قرار نہ ملے۔ وہاں مادی آسائش کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

شہزاد کی بیگانگی ہی کم اذیت ناک نہ تھی کہ اس نے معصومہ سے ملاقاتوں کا ذکر بھی مجھ سے کرنا شروع کر دیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ مجھے علم ہو جائے کہ شہزاد اپنی محبت کو ابھی تک بھولا نہیں ہے اور وقت کا کوئی بھی کمزور لمحہ اس نازک ڈوری کو توڑ سکتا ہے

جو میرے اور اس کے درمیان بندھی تھی۔ مجھے خدا سے شدت سے یہ تمنا تھی کہ وہ میری جھولی میں کوئی پھول ہی کھلا دے جس کی خوشبو شہزاد کو میری طرف لے آئے۔ جب مجھے یہ احساس ہوا کہ واقعی میرے چمن میں بہار آنے والی ہے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے امید کی کرن نظر آ رہی تھی۔ شہزاد کی امی بھی بہت خوش تھیں۔ عرصے بعد اس گھر میں کسی ننھے منے مہمان کی آمد متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح لاتعلق شہزاد نے اس خبر کو بھی سرسری انداز میں سنا، خوشی کا کوئی رنگ اس کے چہرے پر نہ بکھرا۔ مجھے حیرت تھی کہ شہزاد اتنا سنگدل کیوں ہے۔ محبت کرنے والوں کے دل تو بہت نرم ہوتے ہیں۔

ڈیڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ آئے دن ان پر کسی نہ کسی بیماری کا اٹیک ہو جاتا۔ ڈیڈی نے بھی شاید بیٹی کے روگ کو دل سے لگا لیا تھا۔ میں نے کبھی اپنی زبان سے ڈیڈی سے شکوہ نہیں کیا تھا مگر وہ تو اپنی بیٹی کے چہرے پر لکھی ہر تحریر پڑھ لیتے تھے۔ عاصم بھائی، شائلہ بھابھی کے ساتھ الگ گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ امی نے کاشف بھیا کی بھی شادی کر دی تھی۔ کاشف اپنے سُسرال میں رہنے لگا تھا۔ امی، ڈیڈی اور اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے ماں بن کر ہم بہن بھائیوں کے ہر فرض کو بڑی خوبصورتی سے ڈیڈی کی زندگی ہی میں ادا کر دیا تھا۔

ڈلیوری کے سلسلے میں میں ہسپتال میں داخل تھی۔ مجھے ڈیڈی کی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں خدا سے دعا کر رہی تھی کہ ڈیڈی میری ایک خوشی تو دیکھ لیں مگر بعض خوشیاں بڑی مہنگی ہوتی ہیں، اس کا مجھے کب اندازہ تھا۔

میں نے ایک جیتی جاگتی، زندہ سلامت مگر بدہیئت بچی کو جنم دیا۔ بچی کا ایک پاؤں اور بازو آپس میں جڑے ہوئے تھے اور کمر کی جانب گوشت کا ایک لوتھڑا لٹک رہا تھا۔ نرس کہہ رہی تھی "اوہ، ویری سیڈ! ماں اتنی حسین اور بچی۔"

بدہیئت بچی کو دیکھ کر مجھے ذرا حیرت اور غم نہ ہوا تھا۔ شاید میرا باطن اتنا ہی بدصورت تھا مگر غم اور دُکھ تو یہ تھا کہ میرے پیارے ڈیڈی کے لیے یہ خوشی کتنی ادھوری تھی۔ امی عاصم بھائی کے ساتھ مجھے دیکھنے آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ ڈیڈی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دیجئے گا کہ بچی ابنارمل ہے۔

"لیکن شہزاد نے تو رات ہی انہیں فون کر دیا تھا۔" امی نے جواب دیا۔

شہزاد کی امی اور بہنوں کا رویہ ہمدردانہ تھا لیکن شہزاد نے اس بار بھی اپنے جذبات خاموشی کے پردے میں چھپا لیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیڈی اس واقعے کا بہت گہرا صدمہ لیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ جب میں ہسپتال سے گھر آئی تو یہ اندوہناک خبر سنی کہ ڈیڈی مجھے ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ ڈیڈی کی موت کا مجھے بے حد دُکھ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں باپ کی شفقت ہی سے نہیں بلکہ ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گئی ہوں۔ ڈیڈی نے مجھے ہمیشہ ماں جیسی محبت اور چاہت دی تھی۔

شہزاد کو بچی سے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ دلچسپی تو شہزاد کی امی اور بہنوں کو بھی نہ تھی۔ اس معصوم کا تو ابھی تک نام بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ میں ہی اسے پیار سے گڑیا کہہ کر پکارتی۔ ڈاکٹر نے گڑیا کے آپریشن کے لیے دو سال کا وقت دیا تھا۔ دو سال بعد ہی اس کے اعضاء کو آپریشن کے ذریعے درست کیا جا سکتا تھا۔ وہ معصوم بستر پر لیٹی ہر لمحے اپنی معصوم آنکھوں سے مجھے تکتی رہتی۔ گڑیا کی بے بسی دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا۔

کچھ دنوں سے میں شہزاد کے رویے میں واضح

تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ وہ شام کو گھر جلدی آ جاتے۔ گڑیا کو بھی کچھ وقت دیتے۔ اب میرے ساتھ بھی شہزاد نرمی اور محبت سے پیش آ رہے تھے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھ کر خوش تھی کہ پتھر کے سینے سے محبت کا ٹھنڈا میٹھا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ ''ثنا ہماری گڑیا علاج کے بعد ٹھیک تو ہو سکتی ہے نا!'' شہزاد نے گڑیا کو پیار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں شہزاد۔ کیوں نہیں۔ ڈاکٹر قاضی ہر ماہ گڑیا کا چیک اپ کرتے ہیں۔ انشاء اللہ سال ڈیڑھ سال میں ہماری گڑیا عام بچوں کی طرح ہنستی کھیلتی گڑیا ہو گی۔'' مجھے خوشی تھی کہ شہزاد گڑیا میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔

''لیکن ثنا اس کے علاج کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت ہو گی۔''

''شہزاد ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟'' مجھے حیرت تھی کہ شہزاد پیسوں کے متعلق کیوں فکرمند ہے۔ خدا کا دیا بہت کچھ تو تھا ہمارے پاس۔

''پھر بھی اچھی خاصی رقم چاہیے اس کے علاج کے لیے۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا ''ثنا تمہارے ڈیڈی کی جائیداد میں تمہارا بھی تو حصہ ہو گا۔''

شہزاد کی بات سُن کر میں سکتہ میں آ گئی۔ میں نے تو کبھی اس لحاظ سے سوچا بھی نہ تھا۔ آج شہزاد کی محبت اور گڑیا میں دلچسپی کا بھرم کھل گیا تھا۔ شہزاد ڈیڈی کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے کسی بڑے حصے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ بات کھلی تو پھر شہزاد نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ میں امی کے گھر جا کر اپنے حصے کی بات کروں۔ شہزاد کے پاس روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ ہم بڑے آرام سے گڑیا کا علاج کرا سکتے تھے مگر لالچ اور ہوس نے شہزاد کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ شہزاد نے اتنا مجبور کیا کہ میں بے بس ہو گئی اور ڈیڈی کی جائیداد سے اپنا حصہ لینے امی کے گھر پہنچ گئی مگر وہاں کا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ ایک طرف امی سوگوار بیٹھی تھیں۔ عاصم بھائی اور کاشف بھیا بھی موجود تھے۔ شاید کوئی بڑی بات ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے امی سے پوچھا ''امی! خیریت تو ہے نا؟''

''ثنا ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔'' امی کی بجائے عاصم بھائی نے جواب دیا ''ڈیڈی آخری وقت میں مقروض ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہ کوٹھی بھی مرنے سے چند ہفتے پہلے فروخت کر دی تھی جس کا ہمیں بعد میں علم ہوا۔ ڈیڈی کے بینک اکاؤنٹ میں بھی کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ اب مسئلہ امی اور بچوں کی رہائش کا ہے کیونکہ آئندہ چند دنوں میں یہ کوٹھی ہمیں خالی کرنی ہے۔''

عاصم بھائی کی زبانی گھر کی معاشی ابتری کا حال سن کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ امی جنہوں نے ساری زندگی اپنی سوتیلی اولاد کی خدمت کی، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا، امی کی بہتر تربیت کے سبب ہی ہم سب بہن بھائی آج کسی اونچے مقام پر تھے۔ عاصم بھائی ڈاکٹر تھے، کاشف بینک میں ملازمت کر رہا تھا جبکہ امی کی اپنی سگی اولاد چھوٹی شازیہ اور گڈو پرائمری کے طالبعلم تھے کہ خدا نے ان کے سر سے ڈیڈی کا سایہ اُٹھا لیا۔ یہی نہیں بلکہ رہائش اور اخراجات کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ عاصم بھائی امی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے لیکن میں جانتی تھی کہ امی کبھی عاصم بھائی کے ساتھ نہیں جائیں گی کیونکہ شائلہ بھابھی کا رویہ ابتدا ہی سے ٹھیک نہ تھا۔ امی نے عاصم بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے زیورات فروخت کر کے اور کچھ رقم جو ان کے پاس پس انداز تھی اس سے ایک چھوٹا سا گھر خرید دیں۔ رہا اخراجات کا مسئلہ تو وہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے اس مسئلے کو حل کر لیں گی۔

میں جو یہاں کچھ لینے یا مانگنے کی غرض سے آئی تھی گھر کے حالات دیکھ کر قدرے غمگین ہوگئی۔ میرا بس چلتا تو میں کبھی بھی امی کو اس گھر سے نکلنے نہ دیتی۔ یہ کوٹھی میرے ڈیڈی کی یادگار تھی مگر میرے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ میں یہ کوٹھی خرید کر امی کو دے سکتی۔ مجبوراً دل مسوس کر رہ گئی۔

شہزاد نے اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا کہ ڈیڈی نے اپنے ترکے میں کچھ نہیں چھوڑا اور یہ کہ ان کی کوٹھی بھی فروخت ہوگئی ہے۔ شہزاد کا خیال تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، ہم سب گھر والے سازش کے ذریعے شہزاد کو اس کے حق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں، میرے پاس شہزاد کی اس غلط فہمی کا کوئی علاج نہ تھا مگر دُکھ تو یہ تھا کہ اب شہزاد کی امی اور بہنوں نے بھی مجھ سے ناتا توڑ لیا تھا۔ وہ بچی کے ابنارمل ہونے کا الزام بھی مجھے دیتیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے ہی اس گھر کی خوشیوں میں خزاں کا سایہ مسلط کیا ہے۔ شہزاد کے وہی شب و روز پھر لوٹ آئے۔ بات اب تو اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ معصومہ کو گھر بھی لانے لگا تھا۔ امی اور اس کی بہنوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں دہرے عذاب میں مبتلا تھی۔ ایک طرف گڑیا کی بے بسی تو دوسری جانب شہزاد اور سب گھر والوں کا نامناسب رویہ۔ یہ زندگی کم عذاب زیادہ لگتی تھی۔ کبھی سوچتی کہ میں اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں۔ پڑھی لکھی ہوں کہیں بھی اچھی ملازمت مل سکتی ہے لیکن پھر خیال آتا کہ عاصم بھائی کا شف بھیا کیا سوچیں گے۔ وہ یقیناً یہی خیال کریں گے میری خودسر، ضدی طبیعت ایک گھر بھی نہ بسا سکی۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ گڑیا کی خاطر شہزاد کا ہر ظلم برداشت کروں گی لیکن خیال و ارادے کی ساری طنابیں اس وقت ہاتھ سے چھوٹ گئیں جب ایک معمولی سی بات پر شہزاد نے میرے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما دیا۔

میں شہزاد کا دیا ہوا تحفہ ہاتھ میں لئے صحرا کے اس اکیلے درخت کی طرح کھڑی تھی جو ہواؤں کے زور سے کسی زمین سے اُڑ کر بہت دور آ پڑا ہو اور جس کے دل میں اکیلے پن اور کڑی دھوپ کے ڈیرے ہوں۔ پاؤں میں گڑیا کی زنجیر نہ ہوتی تو میں ایسے جینے پر موت کو ترجیح دیتی مگر اب مجھے گڑیا کی خاطر جینا ہی نہیں، زندہ رہنے کے لیے جدوجہد بھی کرنا تھی۔ امی نے بہت چاہا کہ میں ان کے پاس چلی آؤں لیکن میں امی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ میں گڑیا کو لے کر کرائے کے گھر میں شفٹ ہوگئی، نوکری کے لیے زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑی۔ ایک انگلش میڈیم سکول میں پرنسپل کی جگہ مل گئی۔ کانونٹ کے لب و لہجے نے میری نوکری کی مشکل آسان کر دی۔ میں نے خود کو زندگی کی گاڑی کا وہ تیز رفتار پہیہ سمجھ لیا جسے ہر صورت میں آگے بڑھنا تھا۔ اپنی ننھی منی بیٹی کی خاطر، گڑیا کے آپریشن کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی جو میں ایک نوکری سے پوری نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے پارٹ ٹائم بھی ملازمت کر لی۔ مسلسل محنت اور جدوجہد کو ہی میں نے اپنی زندگی بنا لیا۔ دن رات کی گردش میں وہ لمحات کم ہی ہوتے جب میں سکون کی نیند سو سکتی۔ ملازمت سے جو وقت بچتا میں گڑیا کی سنگت میں گزارتی۔ اس کا بدہیئت وجود دیکھتی تو سوچتی کہ ایک وقت ایسا تھا جب میں صرف اور صرف حسین چیزوں کی خریدار تھی۔ حسین صورتوں کی طلب گار تھی اور کسی چیز میں ذرا بھی نقص ہوتا تو میں اسے خود سے جُدا کر دیتی مگر اب وقت نے کس طرح کروٹ لی ہے۔ میں گڑیا کے بدہیئت وجود کو اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہوں۔ اپنے دل کے اس ٹکڑے میں مجھے اپنی ممتا کی مہک آتی ہے۔

دو سال کا عرصہ بھی گزر گیا۔ میں نے اس دوران اتنا پیسہ جمع کر لیا تھا کہ گڑیا کا آسانی سے علاج ہو سکے۔ ڈاکٹر قاضی سے وقت لے کر گڑیا کو میں نے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مجھے مسلسل دو ہفتے کی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے گڑیا کے لیے ایک نرس کا انتظام کر لیا۔ خود اس کو دیکھنے میں ہر روز شام کو ہسپتال پہنچ جاتی۔

آج جب میں گھر سے نکلی تو راستے میں اچانک ہی کالج کی دوست رخسانہ مل گئی۔ وہ اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ شاپنگ پر نکلی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً ہی میری طرف لپکی ''ارے ثنا تم..... سچ میں تو تجھے پہچان ہی نہیں پائی، کتنی بدل گئی ہے، اتنے برس کہاں رہی؟ کبھی بھول کر بھی اپنی دوستوں کو یاد نہیں کیا!'' رخسانہ نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے تھے۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔

''میں تو ٹھیک ہوں، خوش باش، تم سناؤ تم نے شادی بھی کر لی، بیٹا بھی ہوگیا اور کبھی بلانے کی زحمت بھی نہیں کی!'' میں نے اس کے تین سالہ بیٹے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''بکو نہیں زیادہ!'' وہ ایک دم ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''معلوم ہے اپنی شادی کا کارڈ لے کر میں تمہاری تلاش میں کتنا گھومی ہوں؟ تمہارے ڈیڈی کے انتقال کی خبر تو مل گئی تھی لیکن کوٹھی فروخت ہونے کا مجھے علم نہیں تھا، میں نے بہت چاہا کہ تمہارے سسرال کا پتہ مل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔''

''وہ ہاں..... دراصل کچھ حالات ایسے رہے کہ کافی عرصے سے میں تقریبات وغیرہ سے علیحدہ رہی اسی لیے دوستوں سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں ماضی کے ذکر سے بچنا چاہتی تھی۔

''لیکن اب کوئی بہانا نہیں چلے گا، کل میرے بیٹے کی سالگرہ ہے اور تم ضرور آؤ گی!'' اس نے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کوشش کروں گی رخسانہ کیونکہ میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہے۔'' میں نے اس کے گھر جانے سے گریز کرنا چاہا۔

''اوہ، ویری سیڈ! کیا ہوا اسے؟'' رخسانہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... وہ بس بچوں والی بیماری ہے۔'' میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی یہ علم ہو سکے کہ میں ایک ابنارمل بیٹی کی ماں ہوں۔

''شاہد! کیوں نہ پہلے ثنا کی بیٹی کو دیکھ لیں ہسپتال چل کر۔'' رخسانہ نے اپنے شوہر کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا تو میں گھبرا گئی۔

''ارے نہیں رخسانہ وہ ٹھیک ہے تم تو ابھی سالگرہ کے انتظامات میں ہوگی، پھر کبھی سہی۔''

''چلو ٹھیک ہے، خدا کرے کہ وہ جلد صحت یاب ہو لیکن ثنا تم ضرور آؤ گی پارٹی میں۔'' اس نے جاتے جاتے تاکید کی تو میں نے وعدہ کر لیا لیکن دوسرے دن میں عجب اُلجھن کا شکار تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ رخسانہ کے بیٹے کی سالگرہ میں جاؤں یا نہیں! اتنی مدت بعد تو وہ مجھے ملی تھی۔ اسے دیکھ کر پرانی یادیں پھر سے تازہ ہوگئی تھیں۔ امبر، فریحہ، رخسانہ ہم میں کتنی دوستی تھی مگر گردش زمانہ نے اس طرح بکھیرا کہ پھر مل بیٹھنے کا کبھی موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

بالآخر میں نے دل پر جبر کر کے خود کو پارٹی میں جانے کے لیے تیار کر لیا۔ رخسانہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

''گڑیا کیسی ہے ثنا؟'' اس نے پہلا سوال یہی کیا۔

''پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ممکن ہے دو ایک دن میں چھٹی مل جائے۔''

''انشاء اللہ ضرور۔'' اس نے خلوص دل سے دعا کی۔

پارٹی میں خاصے لوگ آئے ہوئے تھے مگر میری نظریں ایک چہرے کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ''حنا'' بے شک یہ حنا ہی تھی۔ میں نے رخسانہ سے پوچھا تو اس نے میرے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا ''یہ حنا ہی ہے۔ تم سوچ رہی ہو گی ثنا کہ یہ یہاں کس طرح؟ شاید تمہیں وہ گریس فل سے سر ہمایوں یاد ہوں، وہ میرے کزن اور حنا ان کی چہیتی بیوی جس کی خاطر انہوں نے نہ صرف اپنے ماں باپ بلکہ پورے خاندان سے ٹکر لی اور اپنی محبت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔'' رخسانہ میرے اندر اُٹھنے والے طوفان سے بے خبر ہمایوں اور حنا کی محبت اور ملاپ کی کہانی بڑے مزے لے لے کر سُنا رہی تھی۔

ان پانچ برس میں حنا بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ دُبلی پتلی دبتی ہوئی شخصیت کی مالک حنا اس وقت بہت پرکشش اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے نزدیک کھڑا ہلا شبہ وہ ہمایوں ہی تھا۔ اس کے چہرے کو تو میں سینکڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ دونوں کے چہروں پر خوشی و مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ شاید تقدیر کے پاس انتقام کا کوئی تیر ابھی باقی تھا تبھی تو وقت میرے قدموں کو یہاں کھینچ لایا تھا۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی اور میں یہاں سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتی تھی لیکن حنا اور ہمایوں کو ایک ساتھ اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر میں سہم گئی۔

''ہیلو ثنا! کل رخسانہ نے تم سے ملاقات کا بتایا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور آج میں تمہاری ہی منتظر تھی۔'' حنا نے مسکراتے ہوئے ماضی کی طرح اپنے خلوص کا یقین دلانا چاہا۔ ''ثنا یہ میرے شوہر ہیں ہمایوں۔'' اس نے اپنے قریب کھڑے ہمایوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''اور ہمایوں، یہ ثنا ہیں۔''

ہمایوں بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ برسوں بعد بھی ہمایوں کی موجودگی مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ میں حنا سے معذرت کر کے وہاں سے ہٹ گئی۔ میں چاہتی تھی کہ رخسانہ سے اجازت لے کر جلد سے جلد گھر چلی جاؤں۔ اس محفل سے اب مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں رخسانہ سے اجازت لے کر پلٹنے والی تھی کہ گلاب کے کنج کے پیچھے کھڑے ہمایوں اور حنا کے منہ سے اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رہ گئی۔ ہاں، وہ الفاظ ہمایوں ہی کے تھے جو میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اُتر گئے، کاش وہ سب کچھ ہمایوں نے نہ کہا ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح گھر پہنچی۔

آج عرصے بعد آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنا سراپا ہی اجنبی لگا۔ دن رات کی محنت مشقت نے میرا سارا رنگ و روپ جھلسا دیا تھا۔ غم، دکھوں اور مسلسل سوچوں نے ماضی کی ثنا کو مسائل کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ غم و غصے نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ میں نے آئینے کو کرچی کرچی کر دیا مگر ہر کرچی اپنی جگہ ایک آئینہ بن گئی اور اس میں سے جھانکتا ہوا ہمایوں کا چہرہ تھا جو حنا سے کہہ رہا تھا ''ڈیئر حنا، تم نے تو اس فضول لڑکی کی اتنی تعریف کی تھی۔ اگر حُسن یہی ہے تو مجھے تمہاری سادگی دل و جان سے عزیز ہے۔''

ہمایوں کے یہ الفاظ میری روح کو گھائل کر رہے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں زندگی کی بازی بھی ہار گئی ہوں۔ دل دولخت ہو جائے تو پھر کس طرح جیا جاتا ہے!